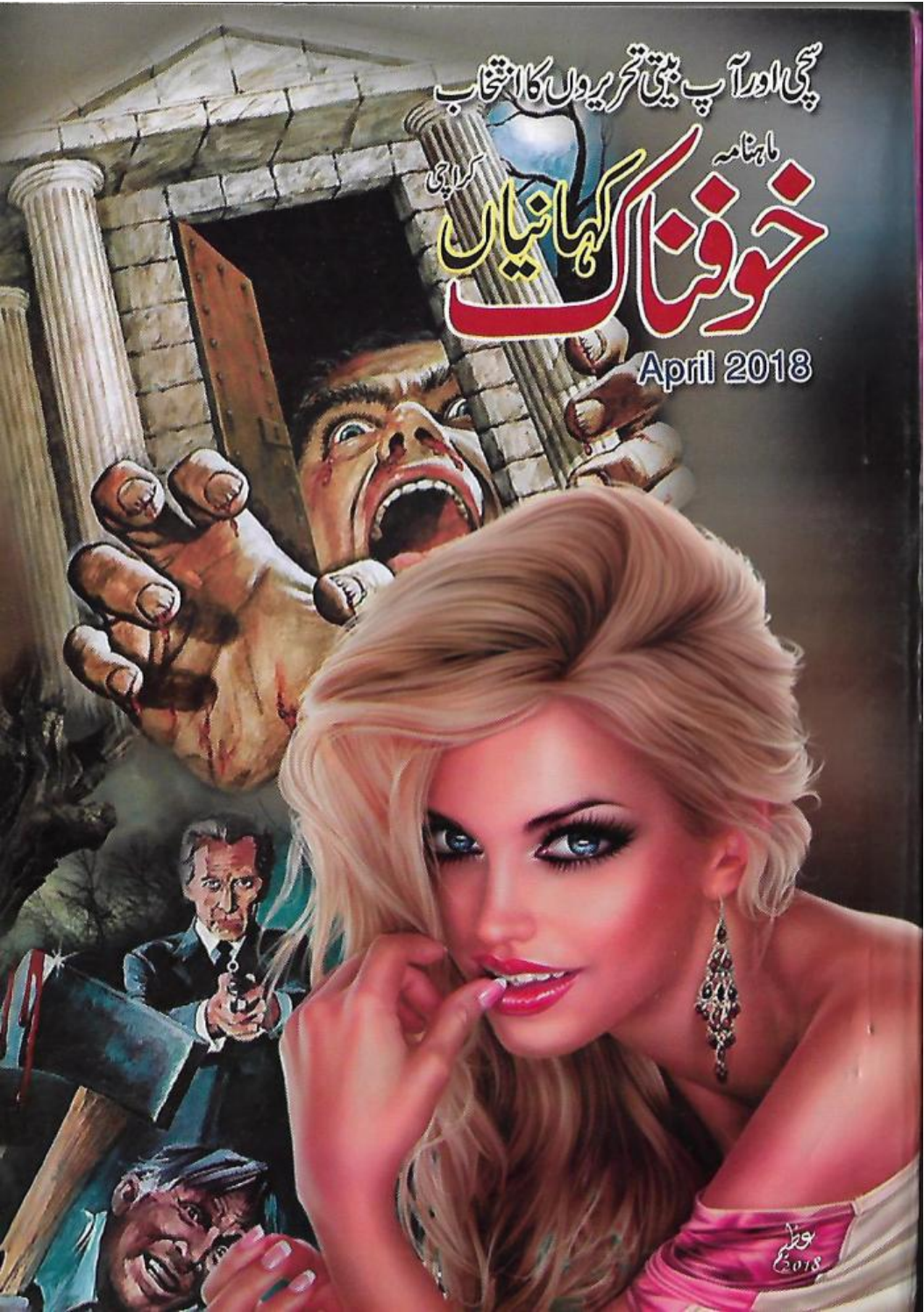


سچی اور آپ بیتی تحریروں کا انتخاب

خوفناک کہانیاں

April 2018



نومبر 2018

سچی اور آپ بیتی تحریروں کا انتخاب

خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

کراچی

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 4 اپریل 2018ء

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

ایڈیٹر محمد ذیشان

نگران شاہد علی

قیمت -/70 روپے

سالانہ قیمت -/1500 روپے

ای میل ایڈریس: Khofnakkahaniya@gmail.com

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ خوفناک کہانیاں

نورانی آرکیڈ میزٹائن فلور

رقن تلاء نمبر 3، کراچی

32744391



ادارہ کا کسی بھی رائلٹر کے خیالات سے تعلق ہونا ضروری نہیں۔ خوفناک کہانیاں میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقاً ہو سکتی ہے۔

121 محمد نادر شاہ ظفر



144 عامر ملک



164 انیم لے راحت



193 الیس تیار احمد



212 ادارہ



234 منزہ محسن



126 مریم فاطمہ



152 ثناء احمد



185 علی اختر



199 راجہ یاسر مظہر



216 رزاق شاہد کوہلر



10 ملک فہیم ارشاد



35 طاہر عباس



44 ایم الیاس



69 مریم شاہ بخاری



91 آصف پروین



96 ساحل عا بخاری



مفتی محمد حسام اللہ شریفی



29 طارق محمود



41 طارق محمود آکاش



65 گلاب خان لنگی



83 سیدہ عروج فاطمہ



قارئین کرام السلام علیکم!

اپریل 2018ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ماہ شمارے میں قارئین کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے، اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ہر رسالے کی کامیابی کی پیچھے اس رسالے کے قارئین کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں کیا شائع ہونا چاہئے یا اس میں کیا تبدیلیاں لانی چاہئے اسی لئے آپ سب اپنی رائے کا مکمل اظہار کرنا کریں، تاکہ ہم اس کو مزید بہتر سے بہتر بنا کر آپ لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

ایڈیٹر

محمد ذیشان

صبا اسماعیل، کراچی سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب امید ہے خوفناک کا تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ پہلے ہی مبینہ کہانی تبیہ تھی اور پہلے ہی مبینہ شائع ہو گئی آپ کی طرف سے اس حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ، مجھے خوفناک سے میری دوست نے متعارف کروایا تھا۔ وہ بہت شوق سے اسے پڑھتی ہے اور ہر ماہ اپنی کہانی اور خط وغیرہ بھیجتی رہتی ہے، ہمارا خوفناک میں بھی اسی نے مشورہ دیا تھا مجھے اپنی کہانی بھیجے گا اور میں بہت شکریہ ادا کرتی ہوں اس کا اور خوفناک کے پورے اسٹاف کا جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا اور شائع کیا۔ انشاء اللہ میں مزید تحریریں اس میں جلد سے جلد بھیجوں گی۔ قسط وار کہانی پر اسرار ہزارڈ ایم الیاس صاحب کی پہلی قسط بہت شاندار رہی، ایم اے راحت صاحب کی بھی قسط وار کہانی ”کنارہ“ بہت اچھی رہی اب آگے کی قسطیں پڑھنے کو دل بے چین ہو رہا ہے۔

☆☆ صبا صاحبہ: پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ اور خطوط کی محفل میں دیکھ، آپ کی کہانی شائع کر کے حوصلہ افزائی تو ہو گئی اب آئندہ ماہ کے لئے بھی اپنی ڈھیر تحریریں ہمیں ارسال کریں۔ شکریہ۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم، آداب عرض ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خوفناک ڈائجسٹ دن دو گنی رات چوکی ترقی کرے، آمین، ماہ مارچ کا خوفناک ڈائجسٹ 21 فروری کو ملا، ٹائٹل کچھ خاص تاثر نہ دے سکا۔ مگر ٹائٹل پر موجود حسینہ انگش قلموں کی دلن لڑکی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈائجسٹ کھولا۔ مگر اپنی کہانی کو نہ پا کر تھوڑی ناامیدی ہی چھائی دل پر، خیر سب سے پہلے میں ایک بہت اہم بات گزارش کرنا چاہوں گی۔ ماہ مارچ کا 23 تاریخ ہم سب کے لئے بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ مگر میرے لئے یہ تاریخ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ کیونکہ 23 مارچ کو میری سالگرہ ہے اور میں اپنی سالگرہ میں خوفناک اور تمام قارئین کو شریک کرنا چاہتی ہوں۔ سو پلیز، میرے لئے اس دن پڑھیں ساری دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے گا۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: خلوصہ نامہ جمعہ کہانیوں کی تعریف کے ارسال کرنے کے لئے ویری ویری تھینکس، آپ کی کہانی اس ماہ شائع نہ ہو سکی، اگلے ماہ کے لئے وعدہ اور قوی امید ہے کہ اگلے ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔

Thanks

ساجدہ راجا ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے تمام خوفناک رائنرز اور ریڈز کو السلام علیکم، ہر ماہ خوفناک کا ٹائٹل چونکا دینے والا ہوتا ہے جو بہت زبردست بات ہے، کہانیاں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں، قسط وار میں ”کنارہ“ ایم اے راحت صاحب کی کہانی زبردست لگی، امید ہے آگے بھی کچھ اچھا ہی لکھا ہوگا۔ خوفناک ڈائجسٹ کو ہر عمر کے لوگ پڑھتے

ہیں۔ پلیز توجہ فرمائیں۔ میری کہانیاں یقیناً آپ کو مل گئی ہوں گی۔ کیا اپریل کے شمارے میں میری کوئی کہانی شامل اشاعت ہے۔ آئندہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ ساجدہ صاحبہ: خط لکھنے، کہانیاں ارسال کرنے اور کہانیوں پر قلبی لگاؤ سے تبصرہ کے لئے تھینکس، آئندہ ماہ نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ نئی کہانی کے ساتھ۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا شمارہ سامنے ہے۔ ڈفرب نائل کے ساتھ تمام تر مسئلے خوب رہے۔ آرٹیکل لگانے کا شکریہ، ہماری ”راج دلا ری“ آپ کے پاس ہے پلیز دیکھئے گا۔ مزید Ad میٹر میں۔ شعلے کی موت، زندگی اور موت، حمد، ارسال خدمت ہے، پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں، آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ”خوفناک ڈائجسٹ“ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائنرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو پورز کو دعا سلام۔

☆☆ امتیاز صاحب: نیک تمناؤں کے ساتھ ویری ویری تھینکس، آپ کی والہانہ چاہت خوفناک ڈائجسٹ سے قابل تحسین ہے، آپ کی صحت یابی کے لئے دعا گو۔ آپ کی راج دلا ری بہت جلد منظر عام پر آجائے گی۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، آداب عرض: آپ کی خیریت کا طالب ہوں، دو فرمیں ارسال خدمت ہیں، کسی بھی آنے والی اشاعت میں جگہ دیکر مشکور فرمائیں۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ قدیر صاحب: غزل شامل اشاعت ہے۔ آپ کی خوشی کیلئے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید خوشیوں سے نوازے، غزل بھیجے گا شکریہ۔

محمد کامران حیدرآباد سے، السلام علیکم! ہمارا خوفناک ڈائجسٹ مارچ کا شمارہ میرے سامنے ہے، میں نے کچھ کہانیاں پڑھ لی ہیں جو کہ میری خواہش کے عین مطابق ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کافی عرصہ سے پاکستان میں بھی مختلف چینلوں پر ہارڈ رے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ پہلے صرف چند انڈین چینلوں پر ہی ہارڈ رے دکھائے جاتے تھے۔ شروع میں ایک دو ڈائجسٹ میں ہارڈ کہانیاں بھیجتی تھیں مگر اب تو ہر ڈائجسٹ اپنے شمارے میں ایک ہارڈ کہانی ضرور شائع کرتا ہے، ہارڈ کہانیوں کی ڈیمانڈ سب سے بڑا ثبوت یہی ہے جہاں تک میرا اپنا خیال ہے کہ خوفناک ڈائجسٹ پاکستان کا وہ واحد ڈائجسٹ ہے جو بچوں کو نصیب صرف ہارڈ کہانیاں چھاپ رہا ہے اور اس سے ہارڈ کہانیاں پڑھنے والوں کی دل کی تسکین ہو رہی ہے۔ میں کوئی دو سال سے خوفناک ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر فرسٹ ٹائم خط ارسال کر رہا ہوں، وجہ یہ کہ اب خوفناک ڈائجسٹ کی مشہور و معروف کہانی ”جل پری“ جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا، یہ ایسی کہانی ہے جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو جکڑ رکھا ہے اس کی ہر قسط میں ایک نیا نیا، اچھوتے طریقے سے نظر آتا ہے۔

☆☆ کامران صاحب: خوفناک ڈائجسٹ میں موسٹ ویکلیم، چلے حوصلہ افزائی ہو گئی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی اپنی رائے بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ Thanks

سبحان علی لاہور سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب امید ہے خوفناک کا تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہو اور خوش و خرم ہو، سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ سر میں خوفناک ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ میرا ہی لیٹر شائع کریں گے۔ اور میں خوفناک ڈائجسٹ کا باقاعدہ سے حصہ بننا چاہتا ہوں۔ اور اچھے امید ہے کہ آپ لوگ میرا دل نہیں توڑ دے گے اور مجھے خوفناک کا حصہ بناؤ گے۔ اور میری کہانیاں شائع کریں گے۔ یہ میرے لئے قابل فخر بات ہوگی کہ میں خوفناک کا حصہ بنوں، خوفناک کے رائنرز میں سے کچھ میرے دوست بھی ہے انہوں نے ہی مجھے خوفناک میں لکھنے کا مشورہ دیا ہے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ خوفناک نے لکھنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

☆☆ سبحان صاحب: سب سے پہلے آپ اپنے شہر کا نام تو لکھتے۔ لیجئے جناب آپ کی حوصلہ افزائی ہو گئی اب جلد سے جلد میں اپنی اچھی اچھی تحریریں بھیجیں تاکہ ہم ان کو شائع کر کے آپ کو مزید شکریہ کا موقع عطا کر سکیں۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل

مفتی محمد حسام اللہ شریفی

معاشرے کی اصلاح کا آغاز

سوال: معاشرے کی اصلاح کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟

جواب: اصلاح معاشرہ کا آغاز اپنی ذات سے کیا جائے کہ ہر شخص اپنی اصلاح کرے۔ انے قول و عمل کے تضاد کو دور کرے۔ اور سچا اور کھرا مسلمان بن جائے۔ دوسروں پر تنقید اور تکلیف دہی سے اجتناب کیا جائے۔ روز قیامت اللہ تعالیٰ ہم سے ہمارے متعلق پوچھے گا کہ تم نے کون سے اعمال کئے۔ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے کتنے کام کئے اور کتنی نافرمانی کی۔ دوسروں کے اعمال کے متعلق وہ ہم سے نہیں پوچھے گا۔ اس لئے ہمیں صرف اپنے اعمال کو درست کرنا چاہئے۔ دوسروں کے اعمال کے ہم ذمہ دار نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

فرد کی اصلاح کا دار و مدار

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرد کی اصلاح کا دار و مدار کس چیز پر رکھا ہے؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے وہ سدھ جائے تو سارا جسم سدھ جاتا ہے، وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو جسم کا وہ حصہ ہے دل، جو تمہاری شخصیت کا مرکز ہے، یہ وہ جگہ ہے جاں لالچ، حرص، محبت، نفرت، جذبات اور محرکات سب جمع ہو جاتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایک چھوٹی سی چیز کے

بگڑنے سے زندگی کیسے بن بگڑ سکتی ہے؟ سو آج کل کینسر کا مرض بڑا عام ہے۔ جسم انسانی میں اربوں خلیے ہوتے ہیں ان میں سے اگر صرف ایک خلیہ بگڑ جائے تو یہ موت کا وارنٹ ثابت ہوتا ہے کینسر کی بیماری کی جڑ صرف ایک خلیے کے بگڑنے سے شروع ہوتی ہے، درحقیقت دل انسانی جسم میں سب سے اہم عضو ہے اس میں اللہ کی محبت، رسول کی محبت، قرآن کی محبت پیدا ہو جائے تو صرف ایک آدمی نہیں بلکہ پورا معاشرہ سدھ سکتا ہے اور ایک زبردست انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور دل کی حالت کی بہتری کی صرف ایک صورت ہے کہ اس میں قرآن کو بسالیا جائے، اس کو پڑھا جائے، اس کو سمجھے کی کوشش کی جائے اور پھر عمل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔

اصلاح کا عمل

سوال: آدمی کو اصلاح کے عمل کا آغاز کہاں سے کرنا چاہئے؟

جواب: اصلاح کے عمل کا آغاز آدمی کو اپنی ذات سے کرنا چاہئے سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے اور اس کے بعد اپنے گھر والوں کی اصلاح کی جائے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر شخص سے اس کے اپنے متعلق پوچھ گچھ کرے گا۔ دوسروں کے متعلق اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ اس لئے دوسروں کا خیال چھوڑ کر ہر مسلمان کو اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔

اصلاح نفس کا بہترین طریقہ

سوال: اصلاح نفس کے لئے سب سے بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: آدمی اپنی خواہشات نفس کو ترک کر دے اور جس چیز کو اس کا جی چاہتا ہے اس کو کرنے کی بجائے وہ یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے اور کن کاموں کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے اور کن باتوں کو کرنے سے اس نے روکا ہے اس کی پابندی کر کے ہی آدمی اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

اللہ اکبر کا اصل مفہوم کیا ہے

سوال: اللہ اکبر کا اصل مفہوم در مطلب کیا ہے؟ اور نماز کے ایک رکن سے دوسرے رکن میں جاتے وقت اللہ اکبر کہنے کا حکم کس سبب سے دیا گیا ہے؟

جواب: اللہ اکبر کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے یعنی دنیا میں ایسا نظام نافذ اور قائم کرنا مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہو کہ واقعہ اللہ کی بڑائی اور اس کی کبریائی سب پر حاوی ہے اور اس کی بڑی بالفضل مافی جا رہی ہے اس کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا جا رہا ہے اس کے حکم سے بالاتر کسی کا حکم نہ ہو اس کی بات سب سے برتر اور ارفع و اعلیٰ ہو۔

اللہ سے وعدہ

سوال: میں نے بیماری میں اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ٹی وی وغیرہ نہیں دیکھوں گی لیکن اگر اب میں دیکھنا چاہوں تو اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ذہن کی توجہ ہٹانے کے لئے میں ٹی وی دیکھوں۔

جواب: اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کیجئے اور ٹی وی نہ دیکھنا تو ویسے بھی آدمی کو بہت سے گناہوں سے بچاتا ہے اس لئے آئندہ ٹی وی دیکھنے سے اجتناب کیجئے۔ انشاء اللہ آپ بہت جلد پورے طریقے سے صحت یاب ہو جائیں گی۔ ٹی وی دیکھنے کے بجائے اچھی اچھی کتابیں پڑھا کیجئے اس سے آپ کی توجہ بھی بٹ جائے گی۔

سوال: سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کیا وعدے کئے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں مسلمانوں سے تین وعدے کئے ہیں۔ (۱) حکومت، (۲) دولت (۳) امن اور ان تین نعمتوں کے حصول کے لئے لازمی قرار دیا ہے کہ مسلمان سب سے پہلے پابندی کے ساتھ نماز قائم کریں، دوسرے زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں اور تیسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کریں۔

نکاح میں وکیل

سوال: نکاح کے وقت عام طور سے ایک شخص لڑکی سے اجازت لے کر آتا ہے جو عام طور پر وکیل کہلاتا ہے اور نکاح پڑھانے والے سے کہتا ہے کہ میں فلاں کا وکیل ہوں اور آپ کو نکاح پڑھانے کی اجازت دیتا ہوں۔ کیا شرعاً یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: شرعاً یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ بہتر اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ نکاح پڑھانے والا عورت یا اس کے ولی کا وکیل بنے۔ نکاح کے وقت کوہوں کا ہونا ضروری ہے۔

اپنی اصلاح کی فکر کرنا

سوال: آدمی کو صرف اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے یا دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہئے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ بات واضح طور پر بیان فرمائی ہے کہ ایک مسلمان کو سب سے پہلے اپنی اور اپنے گھر والوں کی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے اس کے بعد پھر دوسروں کی اصلاح کا خیال کرے۔ دوسروں پر تکلیف دہی اور تنقید سے حتیٰ امکان گریز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح اور سب سے آسان کام دوسروں پر تنقید اور تکلیف دہی ہے۔

آج کی رات مجھے انسانی روپ ملے والا تھا اس لئے میری طاقتوں میں کمی گنا اضافہ ہو گیا تھا، غائب ہونا بھی میری طاقتوں میں شامل تھا۔ سانپ چاہے سوسال کا بھی ہو جائے اپنا انتقام ضرور لیتا ہے

ویل گاڑی کی تیز وں کی آواز فضاء میں گونجی
توریل گاڑی کی کھڑکی کی سلاخوں سے سر نکالے سوئی ہوئی سمیرا کی آنکھ کھل گئی وہ سیدھی ہوئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی ریل گاڑی اب اسٹیشن میں داخل ہوئی تھی اور اس کی اسپینڈ کا کافی کم تھی ریل گاڑی آنے پر پلیٹ فارم پر بے بیچ پر بیٹھے اکا دکا مسافر اٹھ کر ریل گاڑی کے قریب آگئے تھے ریل گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور ڈیڑوں میں بیٹھے مسافر اٹھ کر باہر جانے لگے پھر تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی کی وں کی آواز پھر فضاء میں گونجی اب گاڑی چلنے کے لئے تیار تھی پھر گاڑی نے جھٹکا کھایا اور تاریل رفتار سے چلنے لگی اور پھر اس کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا ابھی گاڑی اس پلیٹ فارم کو چھوڑنے ہی والی تھی کہ سمیرا کو اپنی کھڑکی کے پاس سے ایک لڑکا بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔

پھر وہ سمیرا والے ڈبے میں سوار ہو گیا یہ لڑکا بھاگ کر سوار ہوا تھا سمیرا نے دیکھا وہ ایک پرسکٹش اور خوب صورت نوجوان تھا وہ چلتے ہوئے آیا اور سمیرا کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اس نے کندھے پر لٹکا اپنا سفری بیگ اتارا اور سیٹ پر رکھ لیا۔

”گلتا ہے آپ اسٹیشن پر سو گئے تھے۔“ سمیرا نے ہنستے ہوئے اس لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”جی.....“ اس لڑکے نے سوالیہ نگاہوں سے سمیرا

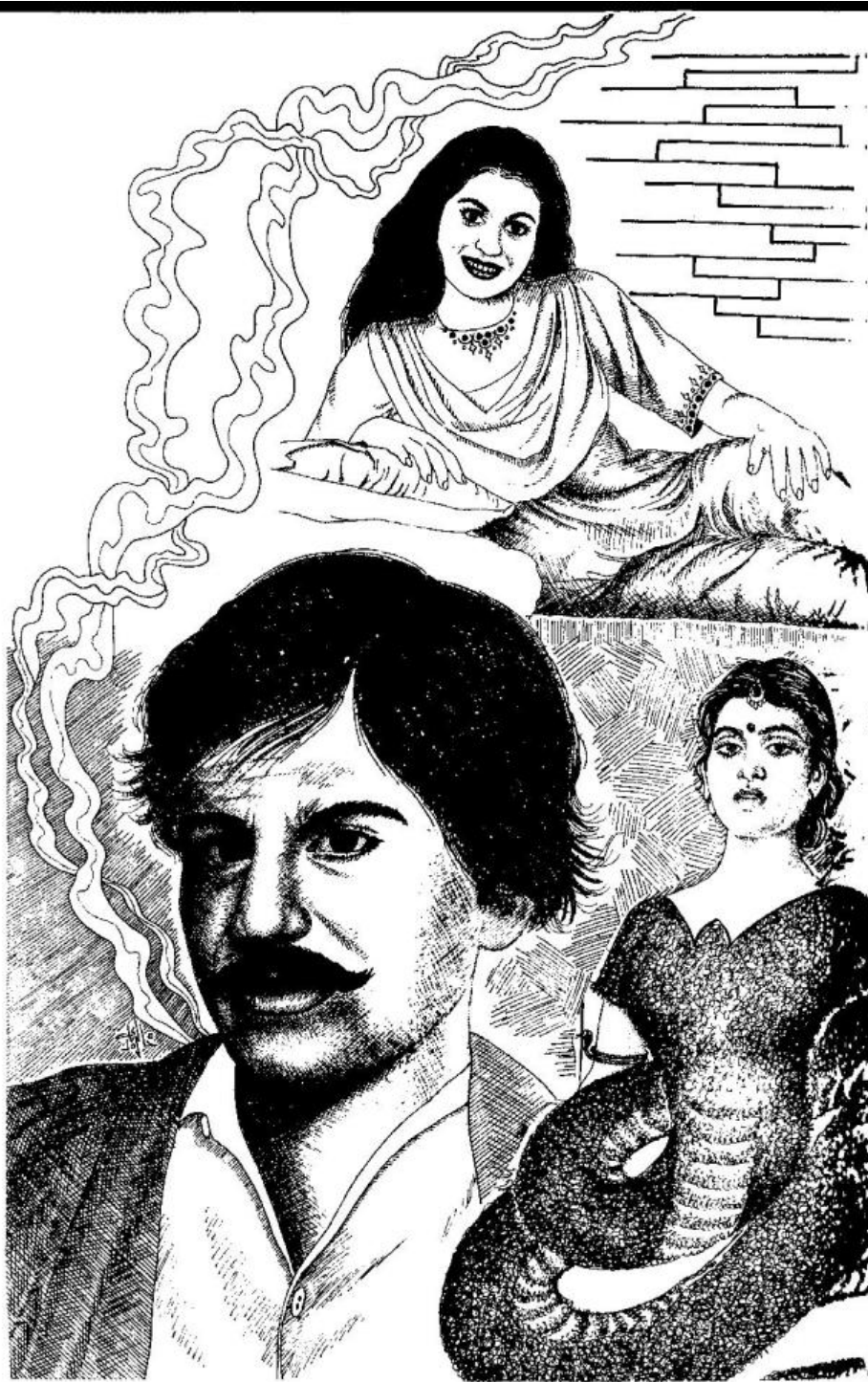
کی طرف دیکھا پھر وہ سمیرا کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں دراصل میں جس تانگے پر اسٹیشن کی طرف آ رہا تھا اس کا دھرا ٹوٹ گیا تھا اسی وجہ سے اسٹیشن پر پہنچنے میں تاخیر ہوئی اور یہاں پہنچا تو ریل گاڑی چل پڑی تھی اسی لئے مجھے بھاگ کر ڈبے میں سوار ہونا پڑا۔“

”اوہ.....“ سمیرا نے سمجھنے والے انداز میں سرکواٹات میں جنبش دی۔

”جی آپ کچھ کھائیں گی.....“ تھوڑی دیر بعد لڑکے نے اپنے سفری بیگ کی زپ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں..... شکریہ.....“ جواباً سمیرا نے مسکراتے ہوئے لٹی میں سر ہلایا، اس لڑکے نے بیگ سے بسکٹس کا ایک پیکٹ نکالا اور پیکٹ کھول کر اس میں سے ایک بسکٹ نکال کر کھانے لگا بھوک تو سمیرا کو لگی ہوئی تھی اور وہ یہ بات بھی بخوبی جانتی تھی کہ دوران سفر کسی اجنبی مسافر سے چیز لے کر نہیں کھانی چاہئے اسی وجہ سے اس نے اس لڑکے کو انکار کیا تھا لیکن سمیرا کی نظریں کبھی کبھی خود بخود لڑکے کے ہاتھوں میں پکڑے بسکٹ کے پیکٹ پر پڑتی تھیں اور اس کے پیٹ میں اچھلتے چوہے مزید ناچنا شروع کر دیتے تھے اور جس رفتار سے وہ لڑکا اپنے پیٹ میں بسکٹس اتار رہا تھا اس سے پیکٹ میں موجود بسکٹس کی تعداد آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی



اجانک اس لڑکے کی نظر سیرا پر پڑی تو وہ مسکرایا اور سٹکس کا پکٹ دوبارہ سیرا کی طرف بڑھا دیا۔

”لے لیجیے۔“

”نن..... نہیں شکریہ.....“ سیرا نے اس دفعہ بھی مشکل سے انکار کیا۔

”غصہ مت کیجیے گا میں دراصل اجنبیوں سے چیز لے کر نہیں کھاتی۔“

وجہ سن کر وہ لڑکا مسکرایا، سیرا کو اس لڑکے کی مسکراہٹ بہت بھلی لگی اس لڑکے نے سیٹ پر بڑے اپنے سفری بیگ کی زپ دوبارہ کھولی اور اس میں سے بسکٹ کا ایک بند پکٹ نکالا۔

”یہ لے لیجیے۔ یہ پکٹ بند ہے۔“ اس لڑکے نے وہ پکٹ سیرا کی طرف بڑھایا تو سیرا نے ہچکچاتے ہوئے سٹکس کا پکٹ پکڑ لیا۔

”میرا نام کاشف ہے.....“ لڑکے نے اپنا تعارف کرانے میں پائل کی۔

”اور میرا نام سیرا ہے.....“ جواباً سیرا نے اپنا نام بتایا اس نے اب سٹکس کھانے شروع کر دیئے تھے۔

”ویسے آپ کہاں جا رہے ہیں.....“ سیرا نے پوچھا۔

”نواب شاہ.....“ کاشف نے بتایا تو سیرا خوشی سے چبکی۔

”ارے۔“

”کیا ہوا.....“ کاشف سیرا کے چپکنے پر حیران ہوا۔

”میرا گاؤں بھی وہی ہے۔“ سیرا نے مسکراتے ہوئے وجہ بتائی۔

”اچھا.....“ جواباً کاشف نے مسکراتے ہوئے لفظ اچھا کو لباً کیا۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے ہیں.....“

اس کی خوشی دیدنی تھی۔

”جی.....“ کاشف کو شاید سنا ہی نہیں دیا تھا۔

”مم..... میں کہہ رہی تھی کہ آپ کی بات ٹھیک ہے۔“ سیرا نے عجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کہاں سے آ رہی ہیں.....“ کاشف نے بسکٹ کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی تعلیم مکمل کر کے..... یایوں کہہ لیں اپنی آدمی زندگی گزار کر شہر سے واپس آ رہی ہوں۔“ سیرا نے آخری جملہ کھوئے کھوئے لہجے میں ادا کیا۔

”کیا مطلب.....“ کاشف نے انجمن آمیز نگاہوں سے سیرا کی طرف دیکھا۔

”اباجی نے بچپن سے ہی تعلیم کے سلسلے میں شہر بھیج دیا..... سارا بچپن وہی گزرا اور آج میں اپنے گاؤں واپس لوٹ رہی ہوں 22 کا ہندسہ پار کرنے کے بعد.....“ سیرا نے اپنی زندگی کا احوال مختصر الفاظوں میں بیان کیا اس کے لہجے میں دھک کا عنصر شامل تھا۔

”ارے.....“ بے اختیار کاشف کے منہ سے نکلا تو سیرا چبکی۔

”کیا ہوا.....“ سیرا نے پوچھا۔

”سیرا اور آپ کی کہان بھی ملتی جلتی ہے.....“ کاشف نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”کیا مطلب.....“ سیرا نے بظاہر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ سیرا جی میں بھی بچپن سے ہی تعلیم کے سلسلے میں شہر تھا اور میں بھی آج اپنی تعلیم مکمل کر کے نواب شاہ واپس آ رہا ہوں۔“ کاشف نے بتایا تو سیرا ہنس پڑی۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بڑبڑائی۔

”کیا کہا آپ نے.....؟“ کاشف نے سوالیہ نگاہوں سے سیرا کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں.....“ آپ یہ بتائے کہ اگر آپ شہر سے تعلیم مکمل کر کے گاؤں واپس آ رہے تھے تو پور

سے ریل میں کیوں سوار ہوئے۔“ سیرا نے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”دراصل فتح پور میں میرا ایک دوست رہتا ہے ہم دونوں شہر سے صبح کی گاڑی سے سوار ہوئے تھے رات پورا انیشن پر آئے تو وہ مجھے زبردستی اپنے گاؤں لے گیا ان کے گھر والے اتنے اچھے تھے کہ وہ مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے انہوں نے میری خوب آؤ بھگت کی پڑی مشکل سے اپنی جان چھڑا کر وہاں سے نکلا تو تانگے کا دھرا لوٹ گیا انیشن پہنچا تو گاڑی چل پڑی اور مجھے بھاگ کر گاڑی میں سوار ہونا پڑا۔“ کاشف نے ہنستے ہوئے وجہ بتائی تو سیرا بھی بے اختیار ہنس پڑی۔

”ویسے آپ شہر جانے کے تذکرے پر کافی افسردہ ہوئی تھیں.....“ گلتا ہے آپ کو شہری زندگی کچھ بھائی نہیں۔“ کاشف نے سیرا کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”آپ نے بالکل صحیح کہا.....“ سیرا نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”مجھے تو ایسا کی وجہ سے شہر آنا پڑا اباجی کا حیران بڑا سخت ہے.....“ ورنہ میں تو اپنے گاؤں میں خوش تھی.....“

”سیرا جی یہ بات بھی ہم دونوں میں بہت میل کھاتی ہے..... میں بھی اپنی اماں کی وجہ سے شہر اپنے ماموں کے ساتھ آیا تھا ورنہ میں بھی اپنے گاؤں سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے بتایا تو جواباً سیرا نے بھی صرف مسکراتے پر ہی اکتفا کیا۔

”کیا کہا آپ نے.....؟“

”ویسے آپ گاؤں میں کہاں رہتی ہیں.....؟“ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کاشف نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں چوہدری نواز کی بیٹی ہوں.....“ سیرا نے بتایا۔

”اوہ.....“ کاشف نے یہ جاننے کے بعد منہ سے ایک طویل اور بوجھل سانس خارج کی آگ دونوں طرف ہی لگی ہوئی تھی کیونکہ جب وہ ریل گاڑی کے اس

ڈبے میں سوار ہوا تھا تو وہ بھی سیرا کی خوب صورتی پر مرعہ مٹا تھا اور اس کی خوشی بھی دیدنی ہو گئی تھی جب اسے پتہ چلا تھا کہ سیرا اسی کے گاؤں کی ہے لیکن پھر اس خبر نے جلتی آگ پر پانی چھرنے کا کام کیا تھا کہ سیرا چوہدری نواز کی بیٹی ہے۔

”اس کا مطلب آپ بڑے لوگ ہیں.....“ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ بولا۔

”نہیں کاشف جی بڑی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہماری تعلیم نے ہمیں اتنا شعور تو دیا ہے کہ سب انسان برابر ہیں.....“ سیرا نے کاشف کا بھٹا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

”جی بالکل.....“ کاشف نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن بات صرف کہنے کی حد تک ٹھیک ہے مگر ماننے کی اعتبار سے نہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ سیرا واقعی سمجھی نہیں تھی۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے سیرا جی کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں مگر مانتا کوئی نہیں ذات پات اونچ نیچ پر ابھی بھی کئی جھگڑتے ہوئے ہیں قتل ہوتے ہیں ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہونے کے باوجود ایسی بے معنی باتوں کو آگے رکھتا ہے اور مذہب کی باتیں کہنے تک محدود رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کو انسانوں میں پیدا کرتا ہے یعنی اپنی سب سے پیاری مخلوق اشرف المخلوقات میں..... لیکن انسان، انسان کا ہی دشمن ہے اسے نیچا دیکھاتا ہے خالق تو واضح کہتا ہے کہ سب انسان میری نظر میں برابر ہیں لیکن انسان سوائے افسوس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔“ کاشف دلبرداشتہ لہجے میں بولا۔

”کاشف جی آپ کی باتیں دل کو چھو رہی ہیں اور میں آپ کی باتوں سے متفق بھی ہوں۔“ سیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور آپ ایک اچھے انسان ہیں۔“

سیرا کی اس بات پر کاشف مسکرایا لیکن اندر سے

اپنا کام چھوڑ کر کھیتوں میں بنی گیڈنڈیوں پر چل کر اپنے گھروں کی راہ لے رہے تھے سیرا ارد گرد لہلہاتے کھیت دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی کھیتوں میں بنی گیڈنڈی پر چلتے کسانوں کی نظار دیکھ کر اس کے ذہن میں کاشف کے باپ رحمت کسان کا نام ابھرا۔

”خوشیا چاچا۔“ بھی میاں آگے بیٹھے ہوئے خوشیا کو آواز دی وہ خوشیا کو بچپن میں بھی خوشیا چاچا ہی کہہ کر بلاتی تھی۔

”رحمت کسان.....“ خوشیا نے زیر لب لفظ
دہراتے ہوئے کہا۔

”ہاں کرتا تھا..... مگر پھر اس نے کام چھوڑ دیا
 تھا۔“ خوشیا نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔
 ”مگر کیوں.....؟“ سمیرا نے پوچھا۔

”وہ تو بڑی پرانی بات ہے پتر..... یہ اس دور کی بات ہے جب تو میری گود میں کھل کر تھی۔“ خوشیا نے مسکراتے ہوئے بتایا تو میرا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وقف کے بعد پوچھا۔ ”سکھسی اس کی سگی میں اس کا
 تیری سگی ہے نہ سگھسی اس کی سگی میں اس کا
 کان ہے۔۔۔۔۔ پر تو کیوں پوچھ رہی ہے۔“ خوشیا
 نے بتاتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”بس ایسے ہی۔ سگھسی ٹھیک ہے نہ چاچا۔۔۔۔۔“
 میرا نہ بات کو ٹالتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں پتروہ بالکل ٹھیک ہے..... اگلے مہینے اس کا
 باہ ہے۔“ خوشیاں بٹایا تو سمیرا چونکتے ہوئے اپنی جگہ
 سے اٹھ گئی۔

”بیجے باتوں ہی باتوں میں سفر کا پتہ نہیں چلا
اور نواب شاہ بھی آ گیا۔“ سیرا نے کھڑکی سے
باہر پلٹ فارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”واقعی.....“ جواباً کاشف مسکرایا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کاشف جی.....“ سمیرا نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔
”مجھے بھی.....“ جو ابا کاشف پھسکی ہنسی ہنسا۔

آپ نے بتایا نہیں کہ آپ گاؤں میں کہاں رہتے ہیں۔“ سمیرا نے پوچھا۔

”میں رحمت کسان کا بیٹا ہوں.....“ کاشف نے بتایا تو سمیرا نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اچھا جی..... امید ہے جلد ہی ہماری دوسری ملاقات ہوگی۔“ سمیرا نے کہا تو جواباً کاشف نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا دونوں ریل گاڑی سے نیچے

اترے تو انیسویں پرمیرا کے باپ کا برسوں کا وفادار ملازم خوشیا آیا ہوا تھا اس نے میرا کا بیک پکڑا وہ دونوں انیشن سے باہر نکلے تو میرا نے دیکھا خوشیا اس کے لئے کبھی لے کر آیا تھا خوشیا نے میرا کا بیک کبھی نہیں رکھا اور میرا

کے لئے بھی کارروازہ کھول دیا سیرانے بھی پر چڑھنے سے پہلے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں تو آخر کار اس کی مستلاشی نگاہوں نے اپنی منزل ڈھونڈ ہی لی کاشف تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے کھڑے تانکے پر سوار ہو رہا تھا وہ

مسکرائی اور نبی پر چڑھ گئی خوشیاں نبی کا دروازہ بند کر دیا اور خود نبی کے آگے بنی جا کر بیٹھ گیا کو چوانے مٹھوڑے کا اشارہ دیا تو مٹھوڑا آگے بڑھنے لگا نبی نو اشارہ مٹھوڑے کی طرف جانے والے کچے راستے پر چار ہی مٹھوڑے

شام کے سائے ہر طرف پھیلنا شروع ہو گئے تھے سورج اب مدھم نکلیا میں تبدیل ہو چکا تھا پرندے غولوں کی شکل میں اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے اور ہوا کا احساس خوش گوار ہو رہا تھا کھیتوں میں کام کرتے کسان اب اپنا

”اچھا.....“ اس نے حیرانگی سے لفظ ”اچھا“ کو
لمبا کھینچا۔

”ہاں پتر.....“ خوشامیرا کے اچھلنے پر ہنسا۔
”میری بچپن کی سہیلی کا اگلے مہینے بیاہ ہے اور
مجھے معلوم ہی نہیں۔“ اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

”پتھر وہ کون سا بڑھی لکھی ہے جو تجھے خط کے ذریعے بتاتی..... اب آج صبحی ہے تو مل کر نکلے شکوے دور کر لینا۔“ خوشیاں سمیرا کے اچھلنے پر ہنسا۔ خوشیاں کہا تو اس نے منہ ہلاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو میں کروں گی ہی۔“

خوشیا اس کے یوں منہ بنانے پر بے اختیار ہنس مہلاب سمیرانے دوبارہ بھی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا

صاحب کی تذکرے سے اسے اپنا دھند لایچین یاد آ گیا تھا وہ اور صاحبی گاؤں کی گلیوں میں چلے ہوئے کھیتی باڑی تھیں کھیتوں میں بنی پلڈنڈیوں پر دوڑتی تھیں اور اکثر ان پلڈنڈیوں پر بھل بھی جاتی تھیں۔

میتے بچپن نے اس کی یادوں پر بسیرہ کیا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

وہ جو ملی بھگت تو اس کا باپ چوہدری نواز اور بوڑھی
 وادی جیلہ بھگت جو ملی کے صدر دروازے پر اس کے
 استقبال کے لئے کھڑے تھے چوہدری نواز نے روایتی
 زمینداروں کی طرح بوہڑی کی پیش کورے لٹھے کی شلوار

اور قیمتی واسکت زیب تن کر رہی تھی سر پر اونچے شملے والی پگڑی اور پاؤں میں تلے دار کھٹا چوہدری نواز کی نوک دار اوپر کوٹھی پر غرور صحت مند مونچھیں تھیں جو اس کی شخصیت کو خاصا بارعب بناتیں تھیں برسوں کی جدائی

میں سمیرا جب باپ سے لپٹی تو آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی چوہدری نواز کی آنکھیں بھی برس پڑیں سمیرا اس کی اکٹوتی بنی تھی ماں اس کی بچپن میں ہی گزرتی تھی اتنی بڑی حویلی میں صرف باپ اور دادی اس کے اپنے

سکے تھے دادی سے گلے ملی تو دادی اسے زور سے بھینچ کر زار و قطار رونے لگی جب کافی وقت گزر گیا تو چوہدری نواز اپنی ماں جیلہ بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”چل بس کراماں..... اب یہ یہیں رہے گی۔“
جمیلہ بیگم نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور اس کا چہرہ

لڑتے ہوئے ہونٹوں سے چومنے لگی پھر یہ چھوٹا سا قافلہ حویلی میں داخل ہوا جو یلی بہت شاندار تھی حویلی کے اندر داخل ہوں تو کھلا کشادہ محسن اپنی مثال آپ تھا۔ کھانا چوہدری نواز جیلہ بگم اور کیرا نے اکٹھے ہی کھایا تھا میرا

نے ایک بات نوٹ کی تھی جب سے وہ وحشی میں آئی تھی اس کی دادی جیلہ بیگم بالکل خاموش تھیں کھانے کی میز پر وہ وقفہ وقفہ سے آنکھ چرا کر سیرا کی طرف دیکھ لیتی تھیں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے

میں آئی اس نے بیک سے باریک لان کا سوٹ نکالا اور اسے تبدیل کرنے کے بعد کمرے کی اکلوتی اور بڑی سی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوئی کھڑکی کے چارکنٹری کے پٹ تھے جو دو اندر کی جانب اور باہر کی جانب کھلتے تھے میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

رات نے اپنی سیاہ چادر ہر طرف تان لی تھی لیکن
چاند کی روشنی نے رات کی سیاہی کو کافی کم کر دیا تھا۔ میرا
گھر کی کی سلاخ کو تھامے کاشف کے خیالات میں کھوئی
ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں کاشف کا چہرہ محسوس رہا تھا وہ

صبح کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اپنی سہیلی کھلکی سے ملنے کے بعد کسی بہانے سے کاشف کے گھر جاسکے۔

”چھن..... چھن..... کمرے میں پائل کی تیز آواز نے اسے کاشف کی یادوں سے باہر کھینچی اس نے

چونکتے ہوئے ارد گردنگاہیں دوڑائیں اور پھر گھوڑی
 ٹھکر کرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔
 ”چھمن..... چھمن..... ایک مرتبہ پھر اس کے
 کانوں میں بائل کی آواز گونجی وہ کھڑکی کی سلامتی جھوڑ کر

حیرت سے ارد گرد دیکھنے لگی کمرے میں پائل کی ”چھن چھن“ کی آواز تو آ رہی تھی مگر وہ آواز کہاں سے آ رہی تھی یہ جاننے سے سیر اقا صر تھی۔

تو اسے اپنا اوپر کا سانس اور نیچے کا سانس نیچے رکھتا ہوا محسوس کیونکہ سمیرا کو دیوار پر ایک سایہ نظر آ رہا تھا

جو کسی عورت کا تھا مگر اس سائے والی عورت کا وجود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

خوف نے یکدم اس پر سیرا کیا اور اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ ”چھن چھن“ ایک مرتبہ پانکوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی دیوار سے عورت کا سایہ یکدم غائب ہو گیا تھا اب ایسے لگ رہا تھا جیسے کمرے میں کوئی عورت چیدوں میں پائل پہنے ہل رہی ہو سیرا نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پر آئے پسینے کو صاف کیا پھر سیرا نے ایک حیران کن منظر دیکھا اس کے کمرے کا دروازہ کھل اور پھر بند ہو گیا پھر اس نے کھڑکی کے ذریعے باہر برآمدے میں جو منظر دیکھا اس نے اس کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑادی اس کے کمرے کے باہر بے برآمدے کے ستون کے پاس ایک لیے بالوں والی عورت اپنا منہ صحن کی طرف کئے کھڑی تھی اس عورت کی پیٹھ سیرا کی طرف تھی اور اس عورت نے گردن گھما کر سیرا کی طرف دیکھا تو سیرا کو حیرت کا ایک شدید جھکا لگا کیونکہ اس عورت کا چہرہ ہو بہو سیرا جیسا ہی تھا۔

”آپ..... آں.....“ سیرا ابھی چیختے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ اس کے کانوں میں تیز بھنکار کی آواز پڑی وہ چونکی اس نے دیکھا ایک کالے رنگ کا سانپ کھڑکی کی سلاخوں میں سے ایک سلاخ پر لپٹا ہوا تھا سیرا چیختے ہوئے تیزی سے پیچھے ہٹی سیرا کی چیخ سے اس سانپ نے اپنے بل سلاخ پر سے ڈھیلے کئے اور باہر برآمدے میں جا کر سیرا نے کھڑکی کے باہر نظر دوڑائی تو وہ لمبے بالوں والی اس کی ہمشکل عورت بھی کہیں نظر نہیں آئی سیرا کی چیخ کی آواز باہر ٹپکتے ہوئے پہریدار بھورے اور بشیرے کے کانوں میں بھی پڑی تو وہ تیزی سے سیرا کے کمرے کی طرف بڑھے یہی نہیں چوہدری نواز اور جیلہ بیگم بھی اپنے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے وہ بھی سیرا کے کمرے کی طرف بڑھے۔

”کیا ہوا سیرا پتر.....“ جیلہ بیگم نے ڈری سہی سیرا کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... دادی.....“ ڈری وجہ سے سیرا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے ابھی کمرے کی کھڑکی کی سلاخ پر ایک سانپ کو لپٹے ہوئے دیکھا۔“

”س..... س..... سانپ.....“ ڈری وجہ سے جیلہ بیگم بھی ہکلا گئیں۔

”جی..... جی.....“ سیرا نے جیلہ بیگم سے لپٹنے ہوئے کہا۔

”بھورے، بشیرے اس سانپ کو جلدی سے ڈھونڈو.....“ چوہدری نواز نے باری باری بھورے اور بشیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی چوہدری جی.....“ دونوں نے بیک وقت بیک زبان ہو کر سر موہا نہ لہجے میں کہا۔

”وہ..... وہ..... وہ سانپ باہر برآمدے میں گر گیا تھا جب میں چینی تھی۔“ سیرا نے مزید بتایا تو بھورا اور بشیرا اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

”شکر ہے سوئے رب کا..... کہ اس سانپ نے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“ جیلہ بیگم نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا چوہدری نواز کمرے میں رکھی کریبوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا تھا۔

”یہ تو اماں خواہ خواہ میں ڈر گئی.....“

”بیٹی یہ چوہدری نواز کی ہے اور خواہ خواہ اتنا ڈر گئی۔“ چوہدری نواز نے اپنی موچھوں کو تاد دیتے ہوئے خفا لہجے میں کہا۔

”ہر کسی کے سینے میں تیرے جیسا پتھر دل نہیں ہوتا۔“ جیلہ بیگم نفرت سے چوہدری نواز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

چوہدری نواز منہ سے کچھ نہیں بولا اس نے خوشیا کو اپنے کمرے سے حقہ لانے کا کہا جیلہ بیگم اور سیرا کمرے میں موجود پٹنگ پر بیٹھ گئیں سیرا کے چکر میں اپنی ہمشکل عورت کا منظر اس کے ذہن سے نکل

گیا تھا خوشیا نے حقہ لاکر چوہدری نواز کے سامنے رکھ دیا اور وہ حقے کے گہرا گہرا کش لینے لگا۔

اسی وقت باہر صحن میں ایک مردانہ چیخ کی آواز سنائی دی۔

”یہ تو بشیرے کی چیخ لگتی ہے۔“ چوہدری نواز نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے کہا جیلہ بیگم اور سیرا بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں چوہدری نواز باہر صحن کی طرف تیز قدموں سے بڑھا تو خوشیا، جیلہ بیگم اور سیرا نے بھی اس کی پیروی کی باہر صحن میں چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کے پاس بشیرا زمین پر گر کر ترپ رہا تھا اور بھورا اس پر جھکا ہوا تھا۔

”کیا ہوا ہے.....“ قریب پہنچنے پر چوہدری نواز نے پوچھا بھورا تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”چوہدری جی اس سانپ نے بشیرے کو ڈس لیا ہے۔“ بھورے نے بشیرے کے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سانپ کے کانٹے کا نشان تھا بشیرے نے اب تڑپنا بند کر دیا تھا اس کا جسم اب ساکت ہو چکا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی تھی۔

”کہاں گیا وہ سانپ.....“ چوہدری نواز نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”پ..... پ..... نہیں.....“ چوہدری صاحب..... لگتا ہے چھت کی طرف گیا ہے۔“ بھورے نے کانپتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”تو ڈھونڈو اسے..... میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جہاں نظر آئے بندوق کی گولی سے اس کا سراڑ اڑنا۔“ چوہدری نواز نے غصے سے بھورے کو حکم دیا اور پھر خوشیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم بھی جاؤ اس کے ساتھ.....؟“

”جی چوہدری جی.....“ خوشیا نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دونوں بھورا اور خوشیا سیڑھیوں کی طرف بڑھے تھوڑی دیر بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی تو وہ خالی ہاتھ تھے۔

”چوہدری جی اوپر تو وہ سانپ کہیں بھی نہیں ہے۔“ خوشیا نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو کیا اس سانپ کو زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا.....“ چوہدری نواز غصے سے دہاڑا۔

”جی..... چوہدری جی..... اگر آپ حکم کریں تو یاس کی جو گیوں کی لمبھی سے میں وہاں سے نارنگ جوگی کو لے آتا ہوں وہ آسانی سے اس سانپ کو کچل لے گا۔“ خوشیا نے ہکاتے ہوئے بظاہر چوہدری نواز سے مشورہ پوچھا۔

”سانپ خطرناک لگ رہا ہے..... کہیں وہ کسی اور کو نقصان نہ پہنچا دے۔“

”ہوں.....“ چوہدری نواز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گہری سانس لی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو خوشیا..... تم دو گھوڑے لے جاؤ اور جلدی سے نارنگ جوگی کو لے آؤ۔“ چوہدری نواز نے کہا تو خوشیا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھوڑوں والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اور بھورے تم بشیرے کی لاش کو اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کرو۔“ چوہدری نواز نے بھورے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو بھورے نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور بشیرے کی لاش کی طرف بڑھا۔

”اماں آپ بھی اور سیرا پتر تم بھی اپنے اپنے کمروں میں چلو اور دروازہ اندر سے بند رکھنا..... اس سانپ کا کام تھوڑی دیر میں تمام ہو جائے گا۔“ چوہدری نواز نے جیلہ بیگم اور سیرا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو وہ دونوں اپنے اپنے کمرے کی طرف ہوئیں سیرا نے اپنے کمرے میں آنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر لیا وہ جیسے ہی سیدھی ہوئے گی تو اچانک پردے کے پیچھے سے نکل کر کسی نے مضبوطی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا سیرا نے ڈر کر تیزی سے اس کے ہاتھوں سے نکلنے کی ناکام کوشش کی مگر پیچھے کھڑی شخصیت کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی ہاتھوں کے لکس سے وہ

مستند ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین طب، ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت -/100 روپے

دل کی بیماریاں

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی تنگی، دہائی بلند پریشہ، غذائی 5 تہدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، امراض دل کا بڑا سبب صدمات، تھائی اور خود غرضی ہے، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تلخیاں اور ہارٹ ایک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، ایک عظیم کار خیر خون کا علیہ دینے سے نہ گھبرائیں، سقوط قلب کیا ہے؟ دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ ایک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں غصے کے عالم میں جسم کی کیا حالت ہوتی ہے؟ غصہ آئے تو کیا کریں، غصہ کم کرنے کے لئے چند تجاویز، بچوں میں دل کی بیماریاں، بائی پاس سرجری اور فرائیز چکن، ایئر جنس تدابیر، صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے خلاف کی سوچ، ورم خلاف القلب پیری کارڈائکس، دل کی سوچ، ورم قلب، دل کی عضلہ کی سوچ، کارڈائکس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں جاننے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ بک ایجنسی
نویڈاسکو اور گراپی
اردو بازار

Ph:32773302

نے اپنے دھڑ کو جھٹکا دیا اور اس کا ایک پاؤں دیوار پر ٹک گیا وہ دیوار پر چڑھا اور دیوار پر لگی درخت کی موٹی شاخوں کے ذریعے درخت تک بنا کوئی آواز کئے پہنچا اور اسی احتیاط سے درخت سے نیچے اتر اور درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

جب اس کی پھولی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے درخت کے تنے کے پیچھے سے اپنا چہرہ باہر نکالا اور اس کی عقابی آنکھیں حویلی کا جائزہ لینے لگیں حویلی میں دو پہریدار کندھوں پر بندوق لٹکائے برے چوکس انداز میں حویلی کے صدر دروازے کے پاس پہرہ دے رہے تھے۔ حویلی کے باقی افراد اپنے اپنے کمروں میں موجود تھے اچانک اس آدمی کی نظر اپنے دائیں طرف پڑی تو اسے برآمدے میں گندم ڈالنے والا پڑھولہ نظر آیا اسے چھپنے کی وجہ جگہ کارآمد لگی کیونکہ وہ پڑھولہ سے تھوڑا ہٹ کر رکھا گیا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں وہ آسانی سے چھپ سکتا تھا برآمدے میں لگے پیلے بلب کی روشنی پورے برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی مگر پڑھولے اور دیوار کے بیچ اس خالی جگہ میں مکمل طور پر اندھیرا پھیلا ہوا تھا وہ آدمی دبے قدموں اس پڑھولے کی طرف بڑھا اور با آسانی اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے کانوں میں تیز نسوانی چیخ کی آواز پڑی تو اس نے تیزی سے پڑھولے کے پیچھے سے اپنا سر باہر نکالا اس نسوانی چیخ سے حویلی میں ایک ہلچل مچ گئی تھی حویلی کے وہ دونوں پہریدار تیزی سے برآمدے میں اس پڑھولے سے تھوڑی دور بنے کمرے میں داخل ہوئے برآمدے میں بنے باقی کردوں سے ایک بوڑھی عورت ایک بارعب شخصیت کی مالک کا ادھر عمر آدمی جس نے اونچے شلے والی پگڑی پہنی ہوئی تھی جو علیہ سے ملازم ہی لگ رہا تھا نکلے اور اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں سے نسوانی چیخ کی آواز ابھری تھی اس آدمی کے تیز کان جلد ہی یہ جاننے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ کمرے میں موجود لڑکی نے ایک سانپ دیکھا تھا جسے پہریداروں نے ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔

انتہا ضرور سمجھ گئی تھی کہ وہ جن ہاتھوں کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہے وہ مردانہ ہیں۔
”دشمن..... چلاتا مت میں کوئی دشمن نہیں ہوں.....“ پیچھے کھڑے آدمی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”اب تم ہاں کرو گی تو میں تمہیں چھوڑوں گا۔“ پیچھے کھڑے آدمی نے اسے چھوڑنے کی اس سے اجازت چاہی تو سمیرا نے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا پیچھے کھڑے اس آدمی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا سمیرا اپنی عقابی جانب گھومی تو وہ یہ دیکھ کر مزید ڈر گئی کہ اس کے پیچھے کھڑے آدمی نے اپنا چہرہ چھپانے کے لئے ڈھانٹا باندھ رکھا تھا اس آدمی نے سمیرا کی آنکھوں میں احتجاج اور ابھمن دیکھی تو تیزی سے اپنا ڈھانٹا اتار دیا۔
”تنت..... تم.....“ وہ سامنے والے آدمی کا چہرہ دیکھ کر حیرت سے بولی۔

☆.....☆.....☆

گھوڑے پر ایک آدمی نے اپنے چہرے پر ڈھانٹا باندھے بیٹھا ہوا تھا وہ گھوڑے کو بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا اس آدمی کی آنکھوں میں غصہ تھا اور اسی غصے کی وجہ سے اس کی آنکھیں خون کی طرح لال تھیں وہ آدمی جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا جلد ہی وہ ایک شاندار حویلی کے قریب پہنچا حویلی کی دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ایک کچا راستہ تھا اس آدمی نے اپنے گھوڑے کا رخ اس کچے راستے کی طرف کر دیا اس کا گھوڑا حویلی کی دائیں دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا اچانک اس آدمی کی نظریں حویلی کی دیوار پر درخت کی کی لگی شاخوں پر پڑیں تو اس آدمی نے گھوڑے کی لگا میں جھپٹیں اور گھوڑے سے نیچے اتر آیا اس نے گھوڑے کو باہر موجود درختوں میں سے ایک کے ساتھ باندھا اور پھر حویلی کی دیوار کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا حویلی کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی وہ آسانی سے حویلی کی دیوار پر چڑھ سکتا تھا اس آدمی نے جست لگائی تو اس کے ہاتھ دیوار تک گئے اور وہ دیوار پر لٹک گیا پھر اس

پھر اچانک اس آدمی نے تیزی سے اپنا سر پڑھولے کے پیچھے کر لیا کیونکہ ان دو پہریداروں میں سے ایک پہریدار پڑھولے کی طرف ہی آرہا تھا وہ پہریدار شاید سانپ کو ڈھونڈنے اس طرف آرہا تھا اس ڈھانٹا باندھے آدمی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی اس آدمی نے تیزی سے اپنی شلوار اوپر کی اور پنڈلی میں اس تیز دھار چاقو باہر نکال لیا اس سے پہلے کہ وہ پہریدار اس آدمی تک پہنچتا حویلی میں ایک مردانہ آواز گونجی۔

اس آدمی نے اپنا سر پڑھولے کے پیچھے سے باہر نکالا اس کی طرف بڑھتا پہریدار اب اگلے قدموں وہاں سے بھاگا حویلی کی چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے پاس دوسرا پہریدار زمین پر گر اتر پڑا تھا اور پہلے والا پہریدار اسے بشیرے کے نام سے مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔

لڑکی والے کمرے سے حویلی کے سارے افراد باہر نکلے اس مرتبہ کمرے میں موجود خوب صورت لڑکی بھی ان کے ہمراہ تھی جسے دیکھ کر آدمی کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر مسکرایا تھا حویلی میں موجود پہریدار بشیرے کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ سانپ چھت کی طرف گیا تھا حویلی کے دونوں ملازموں خوشیا اور بھورے کو حویلی کے مالک چوہدری نواز نے اس سانپ کو ڈھونڈنے کے لئے چھت پر بھیجا منہ پڑھا تھا باندھے اس آدمی نے موقع غنیمت جانا اور دبے قدموں اس لڑکی یعنی بشیرا کے کمرے میں داخل ہو کر پردے کے پیچھے چھپ گیا اور جھورا اور خوشیا چھت سے ناکام واپس لوٹے تھے خوشیا نے چوہدری نواز کو نارنگ جوگی کو بلوانے کا مشورہ دیا تھا جو پاس ہی جوگیوں کی بستی میں رہتا تھا چوہدری نے خوشیا کی بات مان لی اور نارنگ جوگی کو لینے کے لئے خوشیا کو بیچ دیا اور دوسرے پہریدار بھورے کو بشیرے کی لاش اس کے گھر میں پہنچانے کا کہا اور بشیرا اور اس کی دادی جیلہ بیگم کو بھی ان کے کمروں میں جانے کا کہا اور کمروں کے دروازے اندر سے بند رکھنے کا حکم

صادر کر دیا بشیرا اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ بند کرنے کے بعد سیدھی ہوئی تو پردے کی اوٹ میں۔ منہ پڑھا تھا باندھے شخص کو دیکھ کر وہ مزید ڈرئی۔ اور بشیرا چیخنے کا ارادہ کرنے ہی والی تھی کہ اس آدمی نے تیزی سے اپنے چہرے سے ڈھانٹا ہٹا دیا۔

”تت..... تت..... تم.....“ بشیرا نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا تو حیرت سے بولی۔

”کک..... کاشف..... تم.....“

ڈھانٹے والا وہ لڑکا کاشف ہی تھا جو اسے ریل گاڑی میں ملتا تھا اور رحمت کسان کا بیٹا تھا۔

”تت..... تت..... تم.....“ یہاں کیا کر رہے ہو۔“ بشیرا نے بدستور چیرا لگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بس تم سے ملنے کو دل چاہا سو چلا آیا۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کک..... کیا مطلب.....“ وہ لرزتے ہونٹوں سے ہٹکائی۔

”مطلب یہی کہ جب سے میں گھر پہنچا ہوں تمہاری یاد مجھے سونے نہیں دے رہی تھی..... چارپائی پر بار بار کروٹ لینا تو تمہارا ہی چہرہ نظر آتا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھوڑے پر بیٹھا اور تم سے ملنے چلا آیا دل کو قرار ہی نہیں مل رہا تھا اب تمہیں دیکھا تو دل کو بہت سکون ملا۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔

”یہ..... یہ..... کک..... کیا کہہ رہے ہو.....“ بشیرا نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

وہ دونوں آپ سے تم پر اتر آئے تھے۔

”وہی جو تم سننا چاہتی ہو۔“ کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا تو بشیرا نے اس کی طرف پلکیں اٹھائیں اور پھر جھپکائیں۔

”میں نے ریل گاڑی میں ہی جان لیا تھا کہ تم مجھے پسند کرنے لگی ہو اور میں بھی تمہیں پہلی نظر میں دل دے بیٹھا تھا۔“

کاشف آگے بڑھا اور بشیرا کو ہاتھوں میں بھر لیا۔

”یہ..... یہ..... تم کیا کر رہے ہو.....؟“ بشیرا کا چہرہ شرم سے لال سرخ ہو گیا تھا کاشف نے بشیرا کو گلے سے لگایا اور بشیرا نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی بلکہ اس نے نواز سے زور سے بھینچ لیا تھا۔

خوشیا نارنگ جوگی کو لے آیا تھا نارنگ نے کالا چوٹا پٹن رکھا تھا اور سر پر کالے رنگ کی گڈڑی باندھ رکھی تھی اور ماتھے پر کالے رنگ کا بڑا سا لٹکا لگا رکھا تھا اس کی دائیں گال پر بڑا سا مسما تھا اس نے ہاتھ میں بین پکڑ رکھی تھی اور کندھے پر کالے رنگ کا بڑا سا کپڑے کا تھیلہ لٹکا رکھا تھا وہ چوہدری نواز کے سامنے پہنچا۔

”سلام مائی باپ.....“ نارنگ جوگی نے چوہدری نواز کو سلام کیا جس کا جواب چوہدری نواز نے ہاتھ اٹھا کر دیا۔

”نارنگ تجھے معلوم تو ہو گیا ہوگا کہ ہم نے تجھے کس لئے یاد کیا ہے۔“ چوہدری نواز نے پہلے خوشیا اور پھر نارنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی مائی باپ..... راستے میں خوشیا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ نارنگ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بس تو پھر اس غبیث سانپ کو پکڑو اور ختم کر دو۔ اس غبیث نے میرے ایک خاص بندے کو مار دیا ہے۔“ چوہدری نواز نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”تسی لکرا اس نہ کرو مائی باپ..... تھوڑی دیر میں ہی وہ سانپ آپ کے قدموں میں مردہ حالت میں پڑا ہوگا۔“ نارنگ نے کہا اور اپنے کندھے پر لٹکے تھیلے میں سے ایک پٹاری باہر نکال لی چوہدری نواز نے ایک کرسی باہر صحن میں منگولی تھی اور اب اس پر بیٹھ کر اپنی مونچھوں کو تازہ دے رہا تھا نارنگ نے اس پٹاری کا ڈھکن اٹھایا تو پٹاری میں سے ایک کالے رنگ کا سانپ پھٹکارتے ہوئے باہر نکلا۔

”چل شیر..... ڈھونڈو اس غبیث سانپ کو جس نے چوہدری صاحب کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔“ نارنگ نے اس سانپ کو چوہدری صاحب میں اٹھائوں سے

بے فرش پر چھوڑ دیا۔

”یہ کیا کر رہا ہے تو نارنگ اگر اس سانپ نے گھر کے کسی فرد کو ڈس لیا تو۔“ چوہدری نواز نے غصے سے نارنگ کی طرف دیکھا۔

”تسی لکرا نہ کرو مائی باپ یہ میرا پالا ہوا سانپ ہے شیر..... میں نے اسے جو حکم دیا ہے یہ وہی پورا کرے گا اس کا مقصد صرف اس سانپ کو ڈھونڈنا ہے اور اسے ختم کرنا ہے۔“ نارنگ نے کہا تو چوہدری نواز مطمئن ہو گیا نارنگ وہیں زمین پر بیٹھ گیا وہ سانپ اب صحن کے فرش پر رنگ رہا تھا بشیرا اور کاشف کھڑکی سے ہٹ آئے بشیرا نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے تھے دونوں اب پٹنگ پر بیٹھ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا کاشف۔“ بشیرا فکر مند اندھ لہجے میں بولی۔

”کیوں.....؟“ کاشف نے بظاہر پوچھا۔

”حویلی کا ماحول بڑا خراب ہے..... ایک سانپ نے عجیب کھینچا کھڑا کر دیا ہے ایک موت ہو گئی ہے اور سانپ ہے کہ ابھی تک ملا نہیں۔“ بشیرا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

”تم زیادہ پریشان مت ہو میرا..... میں نے بچپن سے ہی اس نارنگ جوگی کی بڑی چرچہ سنی ہے اس کا وہ پالتو سانپ ضرور اس خونی سانپ کو ڈھونڈ لے گا۔“ کاشف نے بشیرا کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”اگر ابا جی نے تمہیں حویلی میں دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا اور اگر انہوں نے تمہیں میرے کمرے میں دیکھ لیا تو قیامت سے پہلے قیامت آجائے گی ان کا غصہ بڑا تیز ہے کاشف۔“ بشیرا نے خوف زدہ لہجے میں کاشف کو آگاہ کیا۔

”تم خواہ ڈر رہی ہو میرا.....“ کاشف نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔

”تمہارا باپ مجھے نہیں دیکھے گا باہر حویلی کا ماحول جیسے ہی شانت ہوتا ہے میں چلا جاؤں گا..... اور اب تم

یہ ڈرنا ورنہ بند کرو میں جان جو کھوں میں ڈال کر تم سے ملنے آیا ہوں اور تم ہو کہ بار بار مجھے ڈراری ہو اب اگر تم نے ایسی ویسی بات کی تو میں چوہدری صاحب کے سامنے جا کر اپنی محبت کا اعلان کروں گا۔“

کاشف کی اس بات پر کبیرا بے اختیار مسکرا دی، ادھر چوہدری نواز کے پاس زمین پر بیٹھا نارنگ اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوا چوہدری نواز نے اس کے یوں کھڑے ہونے پر چونکا۔

”کیا ہوتا نارنگ؟“ چوہدری نواز نے حیرانگی سے پوچھا۔

”م..... مانی باپ..... ملگ..... گڑبڑ ہو گئی ہے.....“ اتنا کہہ کر نارنگ تیزی سے حویلی کی چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

”جاؤ خوشیا جا کر دیکھو کیا مسئلہ ہے۔“ چوہدری نواز نے اپنی کرسی کے پیچھے کھڑے خوشیا کو حکم دیا تو خوشیا بھی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

”آ..... مارو یارے..... اس خبیث سانپ نے میرے شیر کو مار دیا.....“ نارنگ کی روٹی ہوئی آواز چوہدری نواز کے کانوں میں پڑی کرے میں بیٹھے کاشف اور کبیرا بھی نارنگ کے رونے سے چونکے۔

”یہ..... یہ کیا ہوا.....“ کبیرا خوف زدہ لہجے میں ہلکائی۔

”تم ڈر مت کبیرا میں یہیں رکتا ہوں تم باہر جا کر دیکھو نارنگ کیوں رو رہا ہے۔“ کاشف نے کبیرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”شش..... ٹھیک ہے..... ت..... تم پبلنگ کے نیچے چھپ جاؤ میں باہر جا کر دیکھتی ہوں۔“ کبیرا کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکائی تو کاشف نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کبیرا کو کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔

نارنگ اور خوشیا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے نارنگ دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا اس کے ہاتھوں میں اس کا پالتو سانپ شیر وخن سے رنگا بھول رہا تھا جیلہ

بیگم بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔

”یہ کیا بچوں کی طرح رونا لگا رکھا ہے تو نے نارنگ.....“ ایک سانپ ہی تو مرا ہے تو تو ایسے رو رہا ہے جیسے تیرے گھر کا کوئی جی مر گیا ہو.....“ چوہدری نواز نے غصے سے نارنگ جو کڑا ناخوش بیگم نے ناگواری سے چوہدری نواز کی طرف دیکھا۔

”مانی باپ یہ سانپ میرا پتر تھا، میں نے اسے بڑے نازوں سے پالا ہے ایک بیٹے کی طرح رکھا ہوا تھا اسے میں نے لیکن..... لیکن اس خونی سانپ نے اسے مار دیا۔“ نارنگ نے روتے ہوئے بتایا۔

”اچھا تو یہ رونا دھونا بند کر اور یہ بتا کہ تو اس سانپ کو ڈھونڈ سکتا ہے کہ نہیں.....“ چوہدری نواز نے نارنگ جوگی کے دکھ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”مانی باپ میرے علاوہ اس سانپ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا..... آپ نے دیکھ ہی لیا اس نے آپ کے ایک بندے اور میرے شیر وکا کیا حال کر دیا ہے میرے شیر وکا مقابلہ کوئی عام سانپ نہیں کر سکتا وہ سانپوں کی نسل میں سے خاص سانپ ہے.....“ نارنگ نے کہا۔

”خاص سانپ.....“ چوہدری نواز نے حیرانگی سے سوالیہ نگاہوں سے نارنگ کی طرف دیکھا۔

”جی مانی باپ خاص سانپ اسی لئے تو وہ کسی کے قبضے میں نہیں آ رہا..... لیکن.....“ نارنگ کہتے کہتے رکا۔

”لیکن کیا.....؟“ چوہدری نواز نے اضطراری لہجے میں نارنگ سے پوچھا۔

”لیکن اگر اس سانپ کو پکڑا نہ گیا تو وہ گھر کے افراد کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ نارنگ خطرناک لہجے میں بولا۔

”تو پھر میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو پکڑو پھر اسے۔“ چوہدری نواز غصے سے بولا۔ اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ پریشانی نے سیر کیا تھا۔

”پکڑتا ہوں مانی باپ..... میں اس سانپ کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد کریں

گی۔“ نارنگ نے غصے سے جڑے بیٹھے ہوئے اس نے شیر و کے مردہ سانپ کو پٹاری میں ڈالا اور تھیلے میں پٹاری رکھنے کے بعد بین تھیلے سے نکال لی اور زمین پر اتنی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”اب دیکھئے گا مانی باپ وہ خونی سانپ جہاں بھی ہوگا کیسے بل سے نکل کر رہیگا ہوا میرے قدموں میں آئے گا۔“ نارنگ نے چوہدری نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو چوہدری نواز نے اپنے پیچھے کھڑے خوشیا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”خوشیا وہ سانپ تمہیں جیسے ہی نظر آئے بندوق کی گولی سے اس کا سر اڑا دیتا۔“

”نہ مانی باپ نہ.....“ ایسا ہرگز مت کیجیے گا وہ سانپ گولی سے مرنے والا نہیں ہے..... اسے صرف میری یہ بین ہی قابو کر سکتی ہے میں آپ کی آنکھوں کے سامنے اسے سزا دوں گا۔“ نارنگ نے چوہدری نواز کو متح کرتے ہوئے کہا تو چوہدری نواز نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

نارنگ جوگی نے اب بین بجانا شروع کر دی وہاں کھڑی جیلہ بیگم اور کبیرا کی حالت کافی پکی ہو رہی تھی نارنگ بین بجاتے ہوئے اپنی آنکھیں ارد گرد گھما رہا تھا بین کی آواز سے حویلی کا ماحول خاصا پر اسرار سا ہو گیا تھا۔

اچانک صحن میں لگے درخت کے پتوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی نارنگ کے علاوہ وہاں کھڑے سب افراد پتوں کی سرسراہٹ سے چونکے نارنگ کی آنکھیں اب اس درخت پر پگی ہوئی تھیں پھر درخت کی شاخ پر اچانک ایک کالے رنگ کا سانپ نظر آیا جسے دیکھ کر کبیرا اور جیلہ بیگم کی سٹی گم ہو گئی وہ تیزی سے چوہدری نواز کے قریب ہو گئیں اس سانپ کو دیکھ کر نارنگ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی تھی اب وہ سانپ درخت کی شاخ سے لٹک رہا تھا پھر وہ سانپ زمین پر گرا اور رہیگا ہوا بین بجاتے ہوئے نارنگ کی طرف بڑھا۔

چوہدری نواز، خوشیا، جیلہ بیگم اور کبیرا کے جسم میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی تھی سانپ رہیگا ہوا نارنگ کے پاس پہنچا اور کنڈلی مار کر کھین پھینکا کر بیٹھ گیا اب نارنگ کی سانس جیسے ہی ٹوٹی اس نے لپک کر سانپ کو گردن سے پکڑنا تھا مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

”چھمن..... چھمن.....“ اچانک نارنگ کے کانوں میں پائل کی تیز آواز پڑی تو نارنگ نے سانپ سے نظریں ہٹائیں اور سامنے دیکھا تو وہ حیران رہ گیا سامنے ہو ہو کبیرا جیسی لڑکی کھڑی تھی نارنگ نے حیرانگی سے چوہدری نواز کے قریب کھڑی کبیرا کی طرف نظریں گھمائیں اور پھر اپنے سامنے کھڑی کبیرا جیسی ہو ہو لڑکی کی طرف دیکھا دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا فرق تھا تو صرف اتنا سا کہ سامنے کھڑی لڑکی کے ارد گرد دسفیہ دو دھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اسی حیرت نے نارنگ کی سانسوں کو اکھڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ غلطی اس کی زندگی کی آخری غلطی بن گئی۔

سانس اکھڑنے پر بین کی آواز جیسے ہی بند ہوئی کنڈلی مارے سانپ نے برقی رفتار سے نارنگ کو ہاتھ پڑس لیا اور اپنا ہر نارنگ کی ہاتھ کی رگوں میں منتقل کر دیا نارنگ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی جس نے حویلی کے دروازے کو ہلا کر رکھ دیا۔ چوہدری نواز اور خوشیا نارنگ کی طرف بڑھے جو زمین پر لیٹا بری طرح تڑپ رہا تھا اس کی آنکھیں اب اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں جواب کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی سانپ بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

”م..... مانی باپ..... سس..... سانپ..... لبل..... لڑکی.....“ اکھڑتی ہوئی سانسوں سے نارنگ کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل لڑکی کے ذکر پر چوہدری نواز چونکا۔

”کون لڑکی نارنگ.....“ چوہدری نواز نے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے نارنگ سے پوچھا مگر دیر ہو چکی تھی وہ سانپ بہت زہریلا تھا وہ سانپ شاید بہت زہریلا تھا جو کسی کو بھی زندگی کی مہلت نہیں دیتا نارنگ کے منہ سے

جھاگ بنے گی تھی اور پھر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

”اس سانپ کی تو میں.....“ چوہدری نواز نے اٹھتے ہوئے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں مگر وہ سانپ پھر نہ ملے کہاں غائب ہو گیا تھا سمیرا نے حیرانگی سے نظریں اٹھا کر اس ساری حویلی کو دیکھا جو ہر لمحے سے نیا منظر پیش کر رہی تھی سمیرا جب سے حویلی میں آئی تھی ایسے ہی پراسرار واقعات اسے دیکھتے کوئل رہے تھے نارنگ کے منہ سے لڑکی کا ذکر سن کر وہ بھی چوکی تھی اور برآمدے میں نظر آنے والی اس کی ہم شکل عورت یاد آگئی تھی..... دو مہینے اور وہ سانپ شیر و جوقینا دوسرے سانپ سے اپنی زندگی کی بازی ہارنا تھا اب تو چوہدری نواز کے چہرے پر بھی خوف نظر آنے لگا تھا خوشیاں بھی کم خوف زدہ نہیں تھا۔

”خ..... خ..... شبا.....“ چوہدری نواز کو اپنی آواز دور کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جج..... جی چوہدری جی.....“ اس نے بھی کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

”نن..... نارنگ کی لاش کو اس کی بستی میں پہنچا آؤ۔“ چوہدری نواز نے حویلی کے صحن میں پڑی نارنگ کی لاش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”جی اچھا چوہدری جی.....“ بھورا آنے والا ہے میں اسے بھیجتا ہوں میرا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں۔“ خوشیاں نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا جابا چوہدری منہ سے کچھ نہ بولا اور بوجھل بوجھل قدموں سے حویلی کی بیٹھک کی طرف بڑھا۔

”سمیرا پتر آپ اور اماں جی بھی اپنے اپنے کمروں میں جاؤ..... میں اس سانپ کا بندوبست کراتا ہوں۔“ خوشیاں نے سمیرا اور جیلہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ دونوں بھی چپ چاپ اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھیں سمیرا نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی حویلی میں ہونے والے پراسرار واقعات نے اسے چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اچانک وہ چوکی اور خلیوں کے صندوق سے باہر نکل

اور کمرے میں ارد گرد نگاہیں دوڑائیں اور پھر تیزی سے جھک کر پلنگ کے نیچے دیکھا پلنگ کے نیچے کا حصہ بھی بالکل خالی تھا۔

”ہیں..... یہ کاشف کہاں چلا گیا.....“ وہ پریشانی سے بڑبڑائی کہ باہر نکلنے سے پہلے کاشف پلنگ کے نیچے چھپنے کا مشورہ دے کر گئی تھی اور اتنا تو وہ سمجھ ہی گئی تھی کہ وہ خواب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جب سے حویلی میں آئی تھی ایک مرتبہ بھی سونہیں سکی تھی۔

”یا اللہ یہ کیا چکر ہے.....“ اس نے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کپٹی کو مسلا، دن بھر کی تھکاوٹ اور حویلی میں ہونے والے پراسرار واقعات نے اس کے ذہن کو مزید جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور آرام اس کا منتظر تھا حالانکہ ایسے وقت میں انسان کو نیند نہیں آتی لیکن اب اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور پلنگیں بھاری ہو رہی تھیں وہ پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھی اور اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

”چمن..... چمن.....“ ابھی وہ نیند کی وادی میں مکمل طور پر نہیں ڈوبی تھی کہ پانکوں کی تیز آواز نے اس کی جگہ نیند میں خلل ڈالا اس نے نیند میں ڈوبی بھاری بھاری پلنگوں کو کھولا اور گردن سیدھی کر کے سامنے دیکھا تو نیند فوراً اس کی آنکھوں سے رفو چکر ہو گئی اور اس نے اپنی آنکھوں کو جھپکے سے کھولا اس کے کمرے کے دروازے کے پاس اس کی ہم شکل عورت اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی وہ چوکی اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔

وہ عورت اب بھی اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

اچانک سمیرا کے جسم کو ایک جھٹکا لگا وہ بے اختیار پلنگ سے نیچے اتری اور اس لڑکی کی طرف بڑھی سمیرا کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو سمیرا کی ہم شکل عورت نے سمیرا کے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر برآمدے میں نکل آئی سمیرا بھی اس کی رہنمائی میں برآمدے میں پہنچی تو برآمدے میں وہ عورت کہیں بھی نہیں

تھی سمیرا کے جسم کو دوبارہ جھٹکا لگا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی نیند سے جاگ رہی ہو مگر سامنے صحن میں موجود منظر نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

صحن میں کاشف اپنے دونوں ہاتھ اوپر کئے کھڑا تھا اور خوشیاں اس پر بندوق تانی ہوئی تھی چوہدری نواز خوشیاں کے پاس ہی خستہ حالت میں کھڑا تھا اس کے سر پر اس کی پگڑی موزوں نہیں تھی سر کے بال بری طرح اچھے ہوئے تھے پچھلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا اور کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔

”ختم کر دے خوشیاں اس نانی کے کپڑے کو۔“ چوہدری نواز نے انکارہ اگلی ہوئی آنکھوں سے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے خوشیاں کو حکم دیا۔

”نہیں.....“ چوہدری نواز کا فرمان سن کر سمیرا زور سے چلائی چوہدری نواز، خوشیاں اور کاشف نے حیرانگی سے سمیرا کی طرف دیکھا سمیرا بھاگ کر کاشف کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”نن..... نن..... نہیں اباجی..... اسے مت مارئے..... مم..... میں اس سے پیار کرتی ہوں۔“ سمیرا نے بظاہر چوہدری نواز پر ہم پیکہ چوہدری نواز عصبیلی نظروں سے سمیرا کی طرف دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆☆ ☆☆ ☆☆ چوہدری نواز بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ حویلی کی بیٹھک کی طرف بڑھا موجودہ واقعات اور صورت حال نے اس کے جسم کی توانائی جیسے نچوڑ لی تھی وہ اپنی پوری زندگی میں آج پہلی مرتبہ اتنا پریشان دکھائی دے رہا تھا اس سانپ نے حویلی کے ہر فرد کو پریشان کر دیا تھا خوشیاں حویلی سے باہر بھڑے کو دیکھنے گیا تھا تاکہ نارنگ جوگی کی لاش اس کی بستی میں پہنچا آئے بھورا بشیرے کی لاش اس کے کمر چھوڑے گیا تھا چوہدری نواز کرسی پر ڈھیر سوچوں میں گمن تھا کہ قدموں کی چاپ سے وہ چونکا اس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا تو بیٹھک کے دروازے کے پاس کھڑا ایک خوب صورت نوجوان وحشت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو.....“ چوہدری نواز غصے سے اس نوجوان پر برسر۔

”میں تیری موت ہوں..... ظالم کینے انسان اور میں تمہیں یہاں ختم کرنے آیا ہوں۔“ وہ لڑکا غصے سے گر جا ساتھ ہی وہ چوہدری نواز کی طرف بڑھا چوہدری نواز کرسی سے اٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا مگر وہ لڑکا چوہدری کے قریب پہنچا اور زوردارلات چوہدری نواز کے سینے پر دے ماری تو چوہدری نواز بلبلاتا ہوا کرسی سمیت زمین پر جا گرا وہ لڑکا آگے بڑھا اور زمین پر پڑے چوہدری نواز پر لاتوں اور گھونٹوں کی بارش کر دی چوہدری نواز کی اونچے شیلے والی پگڑی بھی اس کے سر کا ساتھ چھوڑ گئی تھی اس نوجوان نے چوہدری نواز کو گریبان سے پکڑا اور اوپر اٹھالیا اس اوپر اٹھانے میں چوہدری نواز کی بیٹھ کے سارے بدن ٹوٹ گئے اور بیٹھ بھی پھٹ گئی چوہدری نواز کی حالت کافی خستہ حال تھی اس کا پچھلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور سر کے بال بھی بری طرح الجھ چکے تھے۔

”ڈیل انسان..... بہت جی لیا تو نے اور بہت ظلم کر لیا تو نے غریب عوام پر..... پر اب تیرا آخری وقت آ گیا ہے۔“ اس لڑکے نے چوہدری نواز کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

”کک..... کک..... کون ہو تم اور میں نے تمہارا کیا لگاڑا ہے۔“ چوہدری نواز نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تو اس لڑکے نے اس کی ساری چوہدری ہٹ نکال دی تھی چوہدری نواز نے شاید اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی مار نہیں کھائی تھی۔

”میں رحمت کسان کا بیٹا کاشف ہوں.....“ اس لڑکے نے یعنی کاشف نے بتایا تو چوہدری نواز نے حیرت سے کاشف کی طرف دیکھا۔

”آج میں تجھ سے اپنے باپ چاچا اور اپنی پھوپھی کا بدلہ لینے آیا ہوں.....“

اسی وقت خوشیاں ہاتھ میں بندوق لئے اندر داخل ہوا۔

”اے لڑکے چھوڑ دے چوہدری صاحب کو نہیں

تو تیرے سر میں گولی مار دوں گا۔“ خوشیا نے کاشف کو دھمکاتے ہوئے کہا تو کاشف نے چوہدری نواز کا گریبان چھوڑ دیا۔

”شباباش خوشیا تو بالکل صحیح وقت پر پہنچا ہے۔“ چوہدری نواز کی جان میں جان آئی تو اس نے خوشیا کو داد دیتے ہوئے کہا ساتھ ہی اس نے ایک زمانے دار شہر کا شف کی گال پر دے مارا۔

”حرام زادے وہ اسی لائق تھے۔ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا ان کا یہی حشر ہونا تھا۔“ چوہدری نواز یک دم گیدڑ سے شیر بن گیا تھا۔

”چل خوشیا اسے بھی باہر محن میں لے کر چلتے ہیں اور انہیں انہوں کے پاس بھیجتے ہیں۔“ چوہدری نواز نے کہا تو خوشیا نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ تینوں بیٹھک سے باہر آ گئے۔

☆.....☆.....☆

”اب تیری زبان کیوں تالو سے چپک گئی ہے چوہدری نواز..... کیوں حکم نہیں دیتا خوشیا کو کہ تیری اکلوتی بیٹی کو مار دے۔“ جیلہ بیگم اچانک بھرائی ہوئی آواز میں پھٹ پڑیں۔

”اب تیری غیرت کو کیا ہوا چوہدری نواز..... کیوں حکم نہیں دیتا خوشیا کو کہ وہ تیری سیرا کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دے۔“

چوہدری نواز کا سر شرم سے جھک گیا بوڑھی جیلہ بیگم کے جس میں جیسے بجلی بھڑک اٹھی تھی۔

”سرمت جھکا چوہدری۔ خوشیا کو حکم دے کہ وہ سیرا کو بھی میری نورین کی طرح ختم کر دے۔“ جیلہ بیگم ہائی دیتے ہوئے بولیں۔

”آج تیرا اپنا خون ہے تو تیری زبان تیرا ساتھ کیوں نہیں دے رہی اس وقت تو تو نے میری نورین اور اس کے عاشق کو بھی یہیں مارا تھا میں تیرے سامنے کتنا گڑگڑائی تھی لیکن تو نے میری ایک نہ سنی اور دونوں کو مار کر اس گھوڑوں والے کمرے میں دفن کر دیا۔“ جیلہ بیگم دوتے ہوئے بولیں۔

”چپ کر ماں اور اندر جا.....“ چوہدری نواز غصے سے جیلہ بیگم پر برستے ہوئے بولا۔

”میں چپ نہیں رہوں گی چوہدری..... آج میرے اللہ نے میرا دکھنا ہوا بکچر ٹھنڈا کر دیا آج اس نے وہی وقت تیرے سامنے لا کر کیا ہے یاد ہے تو نے نورین اور اس کے عاشق کو مار تے وقت کہا تھا کہ ”جب بیٹیاں عزت سے کھیلنے لگیں تو انہیں ختم کر دینا چاہئے۔“

آج تیرے سامنے وہی وقت کھڑا ہے تیری دمی نے بھی تیری عزت سے کھیلنا ہے، اس نے ایک غریب اور نچلے طبقے کے لڑکے سے محبت کی ہے..... اب انصاف کرو چوہدری، نہیں تو میری نورین کا خون آخرت میں تجھ سے حساب مانگے گا۔“ جیلہ بیگم روتے ہوئے بولیں برسوں سے بندھا بند آج ٹوٹ گیا تھا اس کے اتنے سالوں کے چپ ہونٹ بار بار مل رہے تھے سیرا کے پیچھے کھڑے کاشف نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے اپنی پنڈلی میں اڑسا چاقو نکالا اور چوہدری نواز کی طرف پھینکا تو چاقو سیدھا چوہدری نواز کے سینہ دل کے مقام پر لگا، چوہدری نواز کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی جس نے حویلی کے درو دیوار کو ایک مرتبہ پھر ہلا کر رکھ دیا سیرا کو کاشف سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی جیلہ بیگم کو۔

چوہدری نواز اب محن کے فرش پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا سیرا گھوی اور اس نے اندھا دھند کاشف کے چہرے پر تجھڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”یہ تم..... نے کیا کیا..... میرے باپ کو مار ڈالا۔“ وہ شدت جذبات سے چلاتے ہوئے بولی۔

”صحیح کیا ہے میں نے.....؟“ جواباً کاشف سیرا کے چلتے ہاتھ پکڑ کر چلایا، خوشیا زمین پر تر پڑے چوہدری نواز کی طرف بڑھا۔

تہااری پھوپھی یعنی نورین کو جس لڑکے سے محبت ہوئی تھی وہ کوئی اور نہیں بلکہ میرا چاچا جمیل تھا۔“ کاشف نے حیران کن انکشاف کیا۔

”تمہارے باپ نے میرے چاچے کو قتل کیا مگر

کہانی وہی ختم نہیں کی تمہارے اس ظالم اور گھمنڈی باپ نے اس خوشیا کے ساتھ مل کر میرے باپ کو بھی مار ڈالا اور یہی نہیں میری پھوپھی کی عزت پامال کرنے کے بعد اس کی لاش کھیتوں میں پھینکوا دی میں جب آج اپنے گھر پہنچا تو میں نے اپنی ماں سے تمہارا تذکرہ کیا میری ماں تمہارے باپ کے نام پر بھڑک اٹھی۔“ اپنے باپ، چاچے اور پھوپھی کے قاتل سے محبت کرتا ہے تو..... ماں بھرائی ہوئی آواز میں چیخی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے ماں.....“ میں نے حیرانگی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں میں.....“ میری ماں لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تو نے آتے ہی میرے زخم ہرے کر دیئے.....

وہ ظالم چوہدری تیرے باپ تیرے چاچے اور پھوپھی کا قاتل ہے۔“ میری ماں سینہ کو بلی کرتے ہوئے بولی ساتھ ہی میری ماں نے مجھے ساری بات بتائی۔

تمہاری پھوپھی نورین ایک دن کھیتوں میں آئی تو اس نے میرے چاچے جمیل کو وہاں کام کرتے دیکھا وہ پہلی نظر میں ہی میرے چاچے کو اپنا دل دے بیٹھی اور ایک دن موقع دیکھ کر اس نے اپنی محبت کا اظہار میرے چاچے سے کیا تو میرے چاچے نے تمہاری پھوپھی کو ان دونوں کے بیچ ذات پات کی حامل دیوار سے آگاہ کیا مگر عشق اندھا ہوتا ہے وہ پہلے پہل بعد میں آنے والی اذیتوں کو محسوس نہیں کرتا تمہاری پھوپھی بھی نہ مانی اور میرے چاچے کو تمہاری پھوپھی کی محبت کے آگے ہار مانا پڑی۔

جب تمہارے اس ظالم باپ کو خوشیا کے ذریعے ان دونوں کی خفیہ محبت کے بارے میں پتہ چلا تو اپنے بندوں سے میرے چاچے کو خوب پٹوایا اور میرے باپ کو بھی آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ”اگر میرا چاچا باز نہ آیا تو وہ اسے مرادے گا۔“

میرے باپ نے میرے چاچے کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی مگر اب دیر ہو چکی تھی وہ اور تمہاری پھوپھی

اب محبت کے دریا میں کافی آگے بہہ چکے تھے میرے چاچے نے میرے باپ کے سامنے تو ہاں کردی مگر وہ اسی شام تمہاری پھوپھی سے ملا اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو دونوں نے بھاگنے کا منصوبہ بنایا اور بھاگ بھی گئے مگر زیادہ دور نہیں پہنچ پائے اور خوشیا نے انہیں پکڑ لیا وہ انہیں حویلی میں لے آیا انا اور بیٹش میں آ کر تمہارے باپ نے دونوں کو مار دیا اور بقول تمہاری دادی کے گھوڑوں کے اٹھیل میں دفن دیا۔

میرے باپ نے میرے چاچے کی گمشدگی کی رپورٹ تھا نے میں درج کرانی تو تھا نیدار بھی تمہارے باپ کے کلکوں پر پلٹنے والا نکلا اس نے تمہارے باپ کے وقت میری جوان پھوپھی کو گھر سے اٹھوایا اور اس کی عزت پامال کرنے کے بعد اسے مار ڈالا اور اس کی لاش کھیتوں میں پھینکوا دی۔

میرے ماما نے مجھے اور میری ماں کو شہر جانے کا مشورہ دیا ماں نے مجھے تو ماما جی کے ساتھ بھیج دیا مگر خود نہ آئی اور جب آج اس نے مجھے اس راز سے آگاہ کیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ماں کے سونے کے بعد اس ظالم کو میں اس کے انجام تک پہنچانے کے لئے یہاں چلا آیا اور آج میرا انتقام پورا ہو گیا۔“ یہاں تک کہہ کر کاشف خاموش ہو گیا اور پھر تھوڑے وقف کے بعد بولا۔

”اگر اب بھی تم جھکتی ہو کہ میں نے غلط کیا ہے تو جو چاہے مجھے مرادو۔“

چوہدری نواز کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور برسوں کے وقار و خوشیا کی آنکھوں میں نفرت کے سائے گردش کرنے لگے تھے اس نے اٹھ کر بندوق کا رخ کاشف کی طرف کیا۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ خوشیا نے نفرت سے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اسی وقت حویلی میں ایک فائر کی آواز گونجی سیرا اور جیلہ بیگم کے منہ سے چیخیں نکلیں تیسری چیخ کاشف کی

آسیبی انتقام



درخت کے چلنے کے بعد وہ پومل قدموں سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور والدین کے

کمرے میں بیٹھ کر بہت رویا۔ ”میں نے آج آپ لوگوں کا بدلہ لے لیا“

آہستہ سے جھانک کر دیکھا دونوں اپنی اپنی چار پائیوں پہ سو رہے تھے اور پھر وہ مطمئن ہو کر گھر سے سرس دیکھنے کے لئے نکل آیا اور اب گھر اور والدین کا خیال آتے ہی وہ تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چلنے لگا تا کہ جلدی سے گھر پہنچ سکے۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ایک بہت پرانا اور بڑا قبرستان تھا اور گاؤں جانے کا راستہ اس کے درمیان سے ہی گزرتا تھا وہ اپنے خیالوں میں کھویا اس راستہ پہ تھوڑا سا ہی چلا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی چل رہا ہو، یہ احساس ہوتا ہے اس کو بے چینی سی ہونے لگی۔ اس نے وہیں رک کر پیچھے دیکھا پھر

نومبر کی رات تھی فضل سرکس دیکھ کر باہر نکلا تو اسے ہلکی سی ٹھنڈ کا احساس ہوا اس نے ایک جھرجھری لی اسی وقت اسے اپنے گھر اور والدین کا خیال آیا جن سے اجازت لئے بغیر ہی وہ سرکس دیکھنے آ گیا تھا کیوں کہ اسے پتا تھا کہ اگر وہ والدین سے اجازت لیتا یا انہیں بتاتا تو اسے اجازت نہ ملتی اور دوسرا اس پر نظر بھی رکھی جاتی۔ اس کا کمرہ والدین کے کمرے سے الگ تھا، وہ اپنے کمرے میں چار پائی پہ لیٹا کافی دیر تک ان کے سونے کا انتظار کرتا رہا جب اس کے ابا کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی تب وہ جلدی لیکن احتیاط سے اٹھا اور ان کے کمرے میں

بیوی پر پڑی تو وہ تیزی سے اپنے بل میں گھس گئی چوہدری نواز نے خوشیا کو میری بیوی کی بل میں آگ بھینکنے کا حکم دیا خوشی نے درخت سے ایک شاخ توڑ کر اسے آگ لگا لی اور اس جلتی ہوئی شاخ کو بل میں ڈال دیا تو وہ آگ میری بیوی کو گل گئی اور میں خاموشی سے ایک طرف کھڑی مارے یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور میں کربھی کیا سکتا تھا۔

آج کی رات مجھے انسانی روپ ملنے والا تھا اس لئے میری طاقتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا، غائب ہونا بھی میری طاقتوں میں شامل تھا۔ سانپ چاہے سو سال کا بھی ہو جائے اپنا انتقام ضرور لیتا ہے سو آج میں نے اپنا انتقام لے لیا۔“

یہاں تک کہ کروہ انسانی سانپ جس کا نام دیپ تھا خاموش ہو گیا پھر اس کے ارد گرد دھواں چھانے لگا اور جب دھواں چھنا تو وہاں سانپ کھڑی مارے بیٹھا تھا پھر وہ رینگتا ہوا حویلی میں لگے بڑے سے درخت کی طرف بڑھ گیا۔

”دیکھا میرا پتر..... تیرے باپ کی کالی کرتوتیں اس کے ظلم سے انسان تو تنگ تھے ہی مگر اس نے دوسری مخلوق کو بھی پیچھے نہیں چھوڑا اسے اگر کاشف نہ مارتا تو کوئی اور مار دیتا کیونکہ اس کی ساری زندگی ظلم میں گزری ہے..... جنہیں بھی نواز نے اپنے سے دور اسی لئے رکھا تھا کہ تم بھی اس کی بہن کی طرح اس کی عزت سے نہ کھیل سکو..... لیکن پیار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں پتر۔ تم جب حویلی میں اتنے سالوں کے بعد واپس آئی تو تمہاری شکل ہو ہو میری نورین سے ملتی تھی نورین کی یاد میں، میں تمہارے گلے لگ کر خوب روئی۔“ جیلہ بیگم نے بظاہر میرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

سیرا کے سامنے اب اس کی ہم شکل عورت کا معرہ بھی حل ہو گیا تھا وہ اس کی چھوٹی نورین تھی جو بار بار اس کے سامنے آ رہی تھی اور اب بھی وہ سفید روشنی میں گھری اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور سیرا بھی بے اختیار مسکرا پڑی۔

☆☆

بجائے خوشیا کی تھی اور حویلی میں گونجنے والا فائر ہوائی فائر کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ جیسے ہی خوشیا نے اس ہندوق ٹرنگرو بانا چاہا چانک اس کے پیر میں درد کی تیز لہر اٹھی اور ہندوق کا رخ آسمان کی طرف ہو گیا اور کاشف کے لگنے والی گولی آسمان کا رخ کر گئی خوشیا نے دیکھا اس پر اسرار سانپ نے اسے ڈس لیا تھا سانپ کو دیکھ کر جیلہ بیگم اور سیرا کے منہ سے ایک مرتبہ پھر چیخیں نکلیں اب حویلی کے محن کے فرش پر تر پنے کی باری خوشیا کی بھی جلد ہی وہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی حویلی کے محن میں اب تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں چوہدری نواز، خوشیا اور نارنگ کی اس سانپ کے ارد گرد اب دھواں جمع ہونا شروع ہو گیا تھا پھر اس دھواں نے انسانی خدو خال اختیار کرنے شروع کر دیے تھوڑی دیر بعد وہاں ایک خوب صورت نوجوان کھڑا تھا۔

”آج میرا انتقام بھی پورا ہو گیا۔“ اس خوب صورت نوجوان کے ہونٹ ہلے کاشف سیرا اور جیلہ بیگم حیرت اور انجھن کے طے جلے اثرات سے اس خوب صورت نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”میرا نام دیپ ہے اور میں سانپوں کی خاص نسل سے ہوں ہماری نسل کے سانپ سو سال بعد انسانی روپ دھار لیتے ہیں میرے سو سال پورے ہو چکے تھے لیکن میں انسانی روپ نہیں دھار سکتا تھا کیونکہ میں انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا میرے انسانی روپ میں آنے میں انتقام ہی رکاوٹ بن رہا تھا وہ آج پورا ہو گیا اور میں انسانی روپ میں آ گیا۔“

چوہدری نواز اور خوشیا نے میری زندگی میں کبھی نہ پرہونے والا غلا پیدا کر دیا تھا میں اور میری بیوی چوہدری نواز کے ڈیرے کے پاس ہی ایک بل میں ہلکی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے اور ہم آنے والے بیس بچپن سالوں میں انسانی روپ دھارنے والے تھے۔

ایک دن میں بل میں موجود نہیں تھا اور میری بیوی بل کے باہر موجود تھی خوشیا اور چوہدری نواز کی نظر میری

63 برس کا فرق

29 سالہ چیرٹی مہا نے شادی کیا کی ان کی شامت آگئی، دراصل انہوں نے خود سے صرف 63 برس سینئر تاجر سے شادی کی ہے جس پر لوگ حیران ہیں لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ پیٹر گروہس انتہائی دولت مند ہیں اور 92 برس کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں کہ مرد کو شادی سے روکے۔

(جاوید علی - حیدر آباد)

احساس ہونے لگا اس وقت تک ساتھ کے گھروں سے لوگ بھی اٹھ کر نور حسین کے دروازے پہنچے ہونے لگے وہ سب مولوی صاحب سے پوچھنے لگے کیا ہوا لیکن ان کو خود کچھ معلوم نہ تھا تو وہ ان کو کیا بتاتے۔ انہوں نے پھر سے دستک دی لیکن اس دفعہ بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو سب نے مشورہ کر کے ایک آدمی کو دیوار سے اندر کودنے کو کہا اور مولوی صاحب نے ایک آدمی کو مسجد میں اذان دینے بھیج دیا۔

اندر اتر کر آدمی نے کڑی کھول دی تھی پھر آگے مولوی صاحب اور ان کے پیچھے باقی لوگ گھر میں داخل ہو گئے نور حسین کے کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے پہلے ان کو اونچی آواز سے پکارا لیکن کچھ دیر تک کسی کے بھی باہر نہ نکلنے پر وہ خود ہی اندر چلے گئے سامنے ہی فضل بے ہوش پڑا تھا، انہوں نے اس کو آواز دی اور پھر اس کو ہلانے لگے اس کو ہلاتے ہوئے ان کا دھیان سامنے چار پائی پہ نور حسین پہ چلا گیا وہ منظر دیکھ کر مولوی صاحب کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

نور حسین کا سر ان کے جسم سے الگ نظر آ رہا تھا۔ مولوی صاحب کی زبان پہ فوراً کلمہ جاری ہو گیا کچھ دیر تک وہ آواز بلند کلمہ کا ورد کرتے

اس کے والدین اس پہ ایک الوداعی نظر ڈال کر پیچھے کی طرف مڑے اور سفید بادلوں میں غائب ہو گئے اور وہ پیچھے سے آوازیں دیتے رہ گیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ ”اوہ..... تو یہ ایک خواب تھا“ اس نے جب اپنے آپ کو کمرے میں اپنے بستر پر پایا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا لیکن اس کے دماغ میں چھن اب بھی تھی اس کو سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی اس نے اٹھ کر کمرہ میں رکھے منگے سے پانی نکالا اور آدھا گلاس ہی پی سکا تھا کہ اس سے ایک جھٹکا سا لگا پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اپنے والدین کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اس کو یاد آیا کہ ابا تو سوتے ہوئے اونچے اونچے خراٹے لیتے تھے لیکن رات کو اس نے واپسی پہ کمرے میں جھانکا تو وہ بالکل خاموش سے سو رہے تھے جس سے اس کے دماغ میں کھٹک سی پیدا ہوئی جو کافی سوچنے کے بعد بھی اسے سمجھ نہ آ سکی اور اب پانی پیتے یاد آتا تو اس نے ان کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی طرح دوڑتے ہوئے اس نے دروازہ زور سے کھولا جس سے دروازہ دھڑ دھڑا اٹھا جس سے کافی شور ہوا لیکن اس کے والدین اتنا شور ہونے کے باوجود نہ جاگے تو اس کے دماغ میں ہچک سی ہونے لگی اسے کچھ انہونی ہونے کا ڈر سا لگ رہا تھا پھر وہ پوچھل قدموں سے آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ابا کے اوپر سے رضائی کھینچ لی لیکن لائٹن کی روشنی میں نیچے کا منظر دیکھتے ہی اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ دل تھام کر وہیں گر گیا۔

مولوی امام دین صبح کی اذان دینے کے لئے تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف جا رہے تھے وہ نور حسین کے گھر کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ان کو ایک چیخ سنائی دی جسے سنتے ہی وہ رکے پر مجبور ہو گئے انہوں نے جلدی سے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکٹایا لیکن کافی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو ان کو کسی گڑبڑ کا

سانس پھول گیا تھا کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر اس نے اپنا سانس درست کیا ساتھ ہی وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔

اس نے آہستہ سے والدین کے کمرہ میں جھانکا لائٹن کی مدھم بولیں وہ اپنی اپنی چار پائیوں پہ سوتے نظر آئے لیکن بس اسے کوئی بات بے چین کر رہی تھی کچھ دیر وہ کھڑا سوچتا رہا لیکن وہ بات اس کے دماغ میں نہ آ سکی اس کے دماغ میں ایک چھن سی تھی آخر کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرہ میں آ گیا اور چار پائی پر لیٹ کر قبرستان والے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا اس کی آنکھیں نیند سے پوچھل ہونے لگیں وہ غنودگی میں گیا ہی تھا کہ اسے کسی لڑکی کی کھٹک دار ہنسی کی آواز سنائی دی اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں کچھ سوچتے ہوئے اس نے لائٹن کی مدھم بول کو ادھونچا کر دیا اور پورے کمرے کو فور سے دیکھا لیکن اس کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے دوبارہ سے چار پائی پہ لیٹتے ہی آیت الکرسی پڑھی اور پھر آنکھیں بند کر لیں کچھ منٹ بعد ہی وہ نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

وہ ایک پہاڑی پہ کھڑا تھا سامنے ہی دوسری پہاڑی پہ اس کے والدین صاف ستھرا سفید لباس پہنے کھڑے تھے پہاڑی کی چوٹی پہ سفید سفید بادل اتر رہے تھے جو کہ آہستہ آہستہ اس کے والدین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنے والدین سے اپنے آپ کو اتنا دور دیکھ کر پریشان ہو گیا دونوں پہاڑیاں آپس میں جڑی ہوئی تھیں اس نے بے چین ہو کر والدین کی طرف دوڑ لگا دی لیکن ایک بہت ہی بڑی اور گہری کھائی نے اس کا راستہ روک لیا اس نے بہت ہی مشکل سے اپنے آپ کو اس کھائی میں گرنے سے بچایا۔ درمیان ہی فاصلہ بہت زیادہ تھا اس نے بے تاب سے ادھر ادھر دیکھا لیکن دوسری طرف جانے کا راستہ نہ پاس کا آخر وہ اداس ہو کر اپنے والدین کی طرف دیکھنے لگا جو کہ اس کی طرف چپ چاپ پیار بھرے انداز سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بالکل بے بس ہو گیا تب

اپنے چاروں طرف نظروں کو گھمایا لیکن اسے ساتھ چلنے والا اور کوئی بھی نظر نہ آیا۔

فضل حسین حافظ قرآن اور ایک بہادر لڑکا تھا اسی لئے نا تو وہ گھبرایا اور نہ ہی اسے ڈر لگا کچھ دیر تک وہ کھڑا دیکھتا رہا اور پھر سے وہ اپنے راستے پر ہولیا اس کا دھیان اپنے ابا کی طرف چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اگر ابا جاگ گئے تو خیر نہیں کیوں کہ اس کے والد نور حسین بہت ہی سخت آدمی تھے، فضل سولہ سال کا ہو چکا تھا لیکن اب بھی اس سے اگر کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کے والد اسے مارنے لگتے، یہ بات اس کے ذہن میں آئی تو اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

قبرستان میں ایک بہت ہی پرانا اور بہت بڑا سا بوہڑ کا درخت تھا جس کی لمبی لمبی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ فضل اس درخت کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ”چمن چمن چمن“ کی آواز سنائی دینے لگی اس کو بہت ہی عجیب لگا وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی لڑکی پائل پہنے اس درخت کے گرد گھوم رہی ہو۔ اتنی رات کو قبرستان میں لڑکی یہ کیسے ہو سکتا ہے اس نے سوچا اسی وقت پھر سے پائل کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نسوانی آواز نے بہت ہی پیار سے پکارا۔ ”فضل“ آواز سننے ہی وہ ٹھٹک گیا۔

اس آواز نے اسے سحر زدہ کر دیا اور وہ اس آواز کے تعاقب میں کھینچا چلا گیا لیکن اس نے درخت کی طرف کچھ قدم ہی بڑھائے تھے کہ اسے ایک زور دار جھٹکا لگا اور اسے اس قبرستان اور بوہڑ کے درخت کے بارے میں سنی بہت سی پراسرار باتیں یاد آنے لگیں جن پہ اس نے بھی توجہ نہیں دی تھی، پھر اتنی سردی میں بھی اس کے ماتھے سے پسینہ پھونٹنے لگا اس کے منہ سے خود بخود تلاوت قرآن پاک شروع ہو گئی اس کا تلاوت شروع کرنا تھا کہ ایک بلند نسوانی چیخ سنائی دی جو سنتے ہی فضل نے اپنے گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی ساتھ ہی اس نے تلاوت جاری رکھی اور پھر اپنے گھر کے پاس پہنچ کر دم لیا دوڑنے سے اس کا

رہے۔ آخر انہوں نے لائین اٹھا کر نزدیک سے دیکھا تو ان کو ایک جھٹکا لگا لائین ان کے ہاتھ سے گرتے گرتے پٹی۔

سردھڑ سے ایک طرف پڑا تھا لیکن بستر پہ خون کا قطرہ تک نہ تھا اور اس کی گردن کو دیکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی مضبوط ہاتھوں والے آدمی نے اپنی طاقت سے گردن کو مسل کر دھڑ سے الگ کر دیا ہو اس کے بعد مولوی صاحب نے ان کی بیوی کو دیکھا تو وہ ایک جھرجھری لے کے رہ گئے دونوں لاشوں کو ایک جیسا ہی حال تھا لیکن.....

جب لاشوں کی یہ حالت باقی لوگوں نے دیکھی تو وہ بہانے بہانے سے غائب ہونے لگے۔ مولوی صاحب ساری بات سمجھ گئے۔ پہلے وہ بھی لوگوں کی اس گھر کے بارے میں پراسرار باتوں کو قصے کہانیاں سمجھتے تھے لیکن یہ انوکھے قتل دیکھ کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئے ان کے علاوہ سب لوگ وہاں سے غائب ہو گئے تو انہوں نے اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو بلا لیا اور پھر خود مسجد میں نماز پڑھانے چلے گئے۔ نماز کے بعد وہ واپس آئے تو فضل حسین ہوش میں آچکا تھا اور بہت پریشان اور افسردہ تھا اپنے والدین کی اس طرح اچانک اور اتنی بے دردی سے اموات دیکھ کر اسے صدمہ تھا ہی نہیں، گاؤں والوں کی بے بسی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روئے کو چاہ رہا تھا اسی بات پہ مولوی صاحب بھی حیران تھے دس بجے ان کا جنازہ ہوا اس سے پہلے پولیس کے کچھ لوگ آئے لیکن لاشوں کی حالت دیکھ کر بغیر کوئی کارروائی کئے واپس چلے گئے۔ جنازہ میں ٹوٹل چار آدمی تھے مولوی صاحب، ان کے دو بیٹے اور خود فضل حسین۔

نور حسین اور ان کی بیوی پاکستان بننے ہی ہندوستان سے پاکستان اس گاؤں میں پہنچے ان کے پاس پہنے ہوئے کپڑے اور کچھ نقد رقم بھی گاؤں کے لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور گاؤں کے ایک طرف ہندوؤں کا چھوڑا ہوا مکان جس کی چار دیواری

نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ درختوں کی شاخیں لگا کر اس مکان کے سامنے پردہ سا بنادیا گیا تھا لیکن ان لوگوں کے لئے یہ بھی بہت تھا ان کو رہنے کے لئے ایک ٹھکانہ مل گیا تھا وہ بھی بغیر کچھ خرچ کئے۔

نور حسین لوہار کا کام کرتا تھا۔ مکان کے ایک طرف انہوں نے ایک چھپر سا بنا کر اس میں بھٹی لگا کر اپنا کام شروع کر دیا اس گاؤں میں پہلے کوئی لوہار نہیں تھا اسی لئے ان کا کام خوب چل نکلا اور آمدنی ہونے لگی پھر ان کے گھر فضل پیدا ہوا۔ جب جب ان کے پاس پیسے آتے گئے وہ گھر کو وسعت دیتے گئے سامنے ہی دو درخت ایک دوسرے سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پہ لگے ہوئے تھے، رات کو کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن نور حسین نے کبھی ان پہ دھیان نہیں دیا۔ انہوں نے فضل کو حافظ قرآن بنانے کے لئے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس چھوڑ دیا اس وقت گھر کی چار دیواری بڑھ کر ان دونوں درختوں میں سے ایک کو اپنے اندر لے چکی تھی۔

اسی رات بہت تیز ہوا چلنے لگی نور حسین نے جب باہر نکل کر دیکھا تو اپنی بڑا عجیب لگا ان دونوں درختوں کی شاخیں ہوا کے زور پہ ایک طرف ہی جھولتی چاہے تھیں۔ لیکن وہ تو ہوا سے ہلتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر آپس میں الجھ رہی تھیں اور وہ درخت ایک ایسے دوسرے کی طرف جھک رہے تھے جیسے کہ آپس میں دونوں گلے ملنا چاہتے ہوں اور اسی وقت مردوں اور عورتوں کی تین کرنے کی آوازیں آنے لگیں یہ سب دیکھ کر نور حسین کی ٹانگیں کاپٹنے لگیں انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ ”کیا ہوا یہ باہر کیسا شور ہے۔“ ان کی بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کک کک کک نہیں بس چپ کر کے سو جاؤ۔“ انہوں نے کانپتے ہوئے اپنی بیوی کو جواب دیا۔

”کچھ تو ہے۔۔۔۔۔“

”میں نے کہہ دیا کہ چپ کر کے سو جاؤ۔“ انہوں نے بیوی کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے غصہ سے کہا تو ان کی بیوی حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگی لیکن آگے سے کچھ بولے بغیر ہی وہ چار پائی پر لیٹ گئی وہ پوری رات انہوں نے جاگتے ہوئے گزار دی یہ آوازیں سن کر فضل حسین جو کہ ابھی چھوٹا تھا وہ بھی جاگ گیا پھر اس کی امی نے بہت مشکل سے اسے سلا یا۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا آخر وہ تنگ آ گئے لیکن ان کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل بھی نہ تھا وہ لوگ چار دیواری کو بڑھا کر پریشان تھے اب وہ یہ گھر بھی نہیں بچ سکتے تھے کیوں کہ ان کے پاس اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ لوگ بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کوئی عامل بلائے گا سوچا لیکن کچھ عرصہ تلاش کرنے کے باوجود بھی کوئی اچھا عامل نہ مل سکا اور یہ مسئلہ جوں کا توں رہا، اب تو پورے گاؤں میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ نور حسین کے گھر کوئی آسیب ہیں لوگ ان سے دور دور رہنے لگے۔ ہر رات ان کو اب بھی آوازیں آتی تھیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا ان کو مالی یا جانی نقصان نہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ان آوازوں کے عادی ہو گئے اور فضل کے پہلا پارہ حفظ کرتے ہی انہوں نے رات کو گھر کے چاروں کونے پہ تلاوت کی جس سے ایک دم ہی وہ آوازیں بند ہو گئیں وہ رات ان کے گھر کتنے عرصہ بعد سکون کی رات تھی اور یوں فضل نے روزانہ تلاوت کرنا شروع کر دی اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا وہ سب کچھ بھول بھال گئے اور جب ان لوگوں کو کچھ نہ ہوا تو گاؤں والے بھی آسیب کی بات بھول کر ان کے ساتھ گلے مل گئے فضل حسین کے حفظ مکمل کرتے ہی وہ اپنے ابا کے ساتھ کام کرنے لگا۔ آسیب والے واقعہ کو کافی عرصہ ہو گیا تھا نور حسین کی دکان کی چھت کافی خستہ ہو چکی تھی انہوں نے

چھت بدلنے کے لئے اس درخت کو کاٹنے کا ارادہ بنالیا اور اس کے لئے مضبوط قسم کا ایک کھٹاڑا بنایا۔

”اس درخت کو موت کا ٹو یا د نہیں جب چار دیواری ہم نے بنائی تھی تو کتنا مسئلہ بن گیا تھا۔“ انہوں کی بیوی نے اس کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ لیکن نور حسین نے اس کی ایک نہ سنی اور اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر درخت کو کاٹ دیا اور شام تک کچھ بھی نہ ہوا تو اس نے بیوی سے کہا۔

”دیکھو کچھ بھی نہیں ہوا تم ویسے ہی ڈر رہی تھیں۔“ لیکن اس کی بیوی کو یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا وہ خاموش لیکن بہت پریشان تھیں۔ انہی دنوں گاؤں کے ساتھ ایک میدان میں میلہ لگا تھا سب گاؤں والوں نے وہ میلہ دیکھ لیا تھا سوائے اس خاندان کے کیوں کہ نور حسین کو نہ تو خود ان چیزوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ وہ اپنے گھر والوں کو دیکھنے دیتے تھے لیکن..... فضل حسین کو اپنے دوستوں سے میلہ میں ملنے کی سرکس کے بارے میں دلچسپ کر تب سن سن کر سرکس دیکھنے کا اشتیاق ہوا اسی رات وہ سرکس دیکھنے کی خوشی میں تلاوت کرنا بھی بھول گیا اور امی ابو کا سونے کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے والد بھی اس رات کام کر کے بہت تھکے ہوئے تھے اسی لئے انہیں بھی تلاوت کرنا یاد نہ رہا، میاں بیوی تلاوت کرائے بغیر ہی سو گئے اور ان کے سوتے ہی فضل سرکس دیکھنے نکل گیا اور پھر مادرانی مخلوق جو کب سے ان پہ تاد کھائے ہوئی تھی اس نے بہت ہی خطرناک انتقام لیا،

ان لوگوں کے پراسرار قتل کو دیکھ کر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں کیوں کہ ان کے گلے مسل کر مردہ دیئے گئے تھے بستر پر خون کا قطرہ تک نہ تھا اور غسل دینے والوں نے دیکھا کہ ان کے جسموں سے بھی خون جیسے نچڑ لیا گیا تھا۔

اپنے والدین کی موت کے بعد فضل بالکل اکیلا رہ گیا اب تو لوگ بھی اس سے ڈرنے لگے تھے

ڈریکولا کی طاقت



بابا میں جانتا ہوں تم اپنے آپ کو ایک کامل بزرگ سمجھتے ہو، مگر نواب نے بھی آج تک کئی عامل بزرگوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔

آدمی رات کے وقت چاکا تک عبدالمجید کی آنکھ کھلی، شدید گرمی کی وجہ سے اس نے ہاتھ روم کا رخ کیا، جب اس نے پانی کا ٹکا کھولا تو چونک پڑا، تل سے پانی کی جگہ گاڑھا سرخ انسانی خون نکل کر اس کے سر پر چپکنے لگا، مجید ایک بہادر نوجوان تھا وہ زندگی میں بڑے سے بڑے خطرے سے کبھی نہیں گھبرایا تھا لیکن شہر سے دور اس دوران عمارت میں اس غیر متوقع صورت حال نے اس کا رنگ اڑا دیا تھا وہ جلدی سے باہر نکلا اور ساتھیوں کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد جاوید اندر داخل ہوا۔ جب اس نے مجید کی بات سنی تو بولا! تم نے ضرور کوئی خوفناک خواب دیکھا ہے یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر ہاتھ روم میں گھسا اور تل کو کھولا تو پانی برقی رقتاری سے نیچے بہنے لگا۔

یہ دیکھ کر عبدالمجید پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ فرش پر جما ہوا خون بھی غائب تھا۔ باقی رات انہوں نے جاگتے ہوئے گزاری۔

صبح ناشتے کی میز پر ہال کمرے میں نواب نے تمام واقعہ سنا اور بولا جائیز درست کہتا ہے ضرور مجید نے کوئی خواب دیکھا ہوگا، اس عمر میں ایسے خواب مجھے بھی آیا کرتے تھے، بہر حال جب تک تم لوگوں کی جیب ٹھیک نہ ہو جائے میں تمہیں اپنا مہمان بنانا پسند کروں گا، آج

اسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اور پھر سارے لوگ شور مچاتے ہوئے گاؤں سے جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ اتنے میں وہ درخت جل کر کوئلہ ہو چکا تھا اور فضل اس کے سامنے کھڑا آنسو بہا رہا تھا یہ سب کر کے اسے فرحت سی محسوس ہونے لگی اور وہ اپنے آپ کو سردیوں میں محسوس کرنے لگا۔ درخت کے جلنے کے بعد وہ بوہل قدموں سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور والدین کے کمرے میں والد کی چارپائی پہ بیٹھ کر بہت رویا۔ ”بابا امی میں نے آج آپ کا بدلہ لے لیا“ اور پھر وہ خیالوں میں اپنے والدین سے باتیں کرتے کرتے ادھر ہی سو گیا۔ اسے سوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی چارپائی ہلنے لگی اس کی آنکھ کھل گئی اسے یوں محسوس ہوا ہاتھ جیسے زور کا زلزلہ آ گیا ہو اس نے اٹھ کر باہر کی طرف دوڑ لگائی ہی تھی کہ اتنا زور دار جھٹکا لگا جس سے وہ مکان پورا ہلنے لگا اور پھر ایک دھماکہ سے اس کے اوپر آگرا اس کو ایسا لگا جیسے وہ منوں بو جھ تلے دب گیا ہو پھر اس کا دم گھٹنے لگا اور اسے کوئی ہوش نہ رہا۔

سارا گاؤں جنگل میں اکٹھا ہو گیا تھا وہ سب ڈر رہے تھے کہ اب نہ جانے کیا ہوگا، وہ ساری رات انہوں نے جنگل میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی جب وہ لوگ گاؤں میں داخل ہوئے تو فضل حسین کے گھر کی طرف دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیوں کہ اس جگہ ایک بہت بڑی قبر سی بنی ہوئی تھی جب کہ ان کے گھروں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ گاؤں والے وہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب چلے گئے مکان گر کر قبر کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس کی چار دیواری نے اندر کی طرف گر کر اس قبر کے ساتھ ایک چوڑے کی شکل بنا دی تھی قبر کے اوپر کسی جنگلی بوٹی نے سفید رنگ کے پھول کھلائے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ اس قبر کے پاس کھڑے حیران ہو رہے تھے اور ساتھ ہی وہ جلا ہوا درخت انہیں مسکراتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆

جس راستے سے وہ گزر رہا ہوتا لوگ وہ راستہ ہی چھوڑ جاتے یہاں تک کہ وہ مسجد میں جاتا تو وہاں بیٹھے لوگ نماز پڑھے بغیر ہی وہاں سے بھاگ جاتے جیسے کہ انہیں کوئی بھوت نظر آ گیا ہو اس ساری صورت حال سے وہ بہت پریشان تھا وہ جب گھر جاتا تو اس کو اپنے والدین یاد آنے لگتے اور گھر جیسے اس کو کانٹے کو دوڑتا جب جب اس کو والدین کی یاد سستاتی تب تب اس کے دل میں اس خوفنی مخلوق کے لئے غصہ بھرنا شروع ہو جاتا تھا وہ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔

ایک رات وہ گھر کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے وہ درخت اس پہ راس رہا ہو۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر اس درخت کی طرف غور سے دیکھا تو وہ فضل کو ایک بھیڑیے جیسا لگا جس کے سامنے کے بڑے بڑے دانت خون سے بھرے ہوئے تھے اور وہ بھیڑیا اس کی طرف بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

فضل بھاگ کر اندر گیا اور کمرے میں پڑے ایک کین جو کہ مٹی کے تیل سے بھرا ہوا تھا، لے کر اسی طرح بھاگتا ہوا اس درخت تک پہنچا اسے ایک زور کا دھکا لگا لیکن اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا اور پھر اونچی آواز سے تلاوت کرنے لگا ساتھ ساتھ درخت پہ مٹی کا تیل بھی چھڑکتا رہا۔

اسی وقت درخت سے رونے پینے اور آہ وزاری کی آوازیں آنے لگیں۔ لیکن اس نے کسی بھی آواز پہ دھیان نہ دیا تیل چھڑک کر اس نے درخت کو آگ لگادی سرسبز درخت نے بہت آہستہ آہستہ آگ پکڑی اور پھر آگ تیز ہونے لگی آگ کے تیز ہوتے ہی چیخ و پکار بھی تیز ہو گئی ان آوازوں کا شور بڑھتے ہی گاؤں کے لوگ گھروں سے باہر آنے لگے پہلے ان کو سمجھ ہی نہ آئی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن جب ان کو سمجھ آئی تو وہ سارے فضل حسین کو گالیاں دینے لگے، وہ فضل کو یہ سب کرنے سے منع کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان چیخوں کو سن کر اطمینان محسوس کر رہا تھا

جانیز قریبی قصبے میں جا کر جیب مرمت کے لئے دے آئے گا، جیسے ہی وہ درست ہو کر آئے تم باغ جناح روانہ ہو جانا۔ جب وہ سب باتیں کرنے لگے تو نواب اپنی جوانی کے کارنامے سنانے لگا۔ جنہیں سن کر ان کا خوف جاتا رہا ایک گھنٹے بعد نواب اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ مجھے ایک ضروری کام ہے، جا رہا ہوں، یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہم چار دوست تھے، عبد المجید، ظفر، نادر اور عباس۔ ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے، نادر اور میری دوست زیادہ تھی، ہم اگر کسی دن ایک دوسرے کو نہ ملنے تو ہمیں سکون نہیں ملتا تھا، عبد المجید کو ہم سب مجید کہہ کر پکارتے تھے اور ظفر کی شکل لڑکیوں کی طرح تھی اس لئے ہم سب اسے نیلم بلاتے تھے، ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم نے سوچا کہ ہم کسی خوب صورت گاؤں کی سیر کے لئے چلیں گے اور سوچ بچار کے بعد آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ باغ جناح جائیں گے، تین دن کے بعد ہم سفر پر روانہ ہوئے ہم ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ چانک ہماری گاڑی ایک جھکے کے ساتھ رکی اور بند ہو گئی میں نے نیچے اتر کر دیکھا تو انجن کا ایک پرزہ عارضی طور پر کام کرنا بند کر چکا تھا، میں اور ہمارے سب ساتھی پریشان ہو گئے سڑک بالکل سنان پڑی تھی اس لئے فوری طور پر مدد مانا بھی ممکن نہیں تھا، آخر کار ہم نے جیب کو دھکا لگا کر ایک جگہ پر کھڑا کیا اور اپنے اپنے سفری بیگ اٹھا کر جنگل میں داخل ہو گئے تاکہ اگر قریبی کوئی آبادی ہو تو مدد حاصل کی جاسکے۔ جنگل میں مختلف راستوں سے گزرتے وقت ہمیں مختلف خطرناک جانوروں کے چبھنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

دوستوں لگتا ہے آج ہم بہت برا پھنسے ہیں اس ویران جنگل میں، اگر مدد نہ ملے اور یہ نہیں ہمارا کیا شہر ہوگا۔ میں نے زبان کھولی لیکن اب کوئی نہ کوئی راستہ تو بچاؤ کا ہوگا۔ ڈھونڈنا ہوگا نیلم نے کہا۔

باقی دونوں دوستوں نے بھی اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

جنگل بہت طویل ثابت ہو رہا تھا۔ آخر کار ایک

گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد اچانک نادر کی نظر ایک عمارت پر پڑی اس عمارت کی دیواروں پر مٹی جی ہوئی تھی۔ عمارت کے ارد گرد چھوٹا سا باغ تھا جس کے درخت اور پودے مر چکے تھے اور باغ کے ارد گرد خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں، ہم چاروں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ عمارت کے مالک کے پاس چل کر پناہ طلب کی جائے۔

نیلم اس عمارت سے دور رہنے پر بعد تھی، میں بولا۔ اس مشکل ترین وقت میں عمارت کے بغیر اور چارہ نہیں در نہ ہم جنگلی جانوروں کی خوراک بن جائیں گے۔ آخر کار ہم لوگ باغ کے دروازے تک پہنچے۔ دروازہ نہایت ہی مضبوط آہنی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی چند سیکنڈ گزر گئے، میں دوبارہ دستک دینے ہی والا تھا کہ دروازہ ایک دھماکہ سے کھلا۔

سامنے ایک لمبا تڑکا شخص کھڑا تھا۔ جس نے کوٹ پتلون زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کی شرح آکھوں میں نہایت ہی تیز چمک تھی جبکہ چہرے پر ایک عجیب سی اداسی کا راج تھا، کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ اس کی آواز نہایت ہی کھروری اور جذبات سے خالی تھی۔

ہم لوگ مسافر ہیں باغ جناح جا رہے تھے کہ سڑک پر ہماری جیب خراب ہو گئی ہمیں صرف آج کی رات کے لئے پناہ دے دیجئے، نادر نے بڑے ادب سے کہا۔ اس مرتبہ مجھے شخص کے چہرے پر ایک تیز سسکاہٹ نمودار ہوئی اور بولا۔ ٹھیک ہے میں تمہاری مجبوری کو سمجھتے ہوں تمہیں اس عمارت میں ٹھہرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ یہ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گیا۔

ہم سب اندر داخل ہو گئے۔ اس شخص نے ایک جھکے کے ساتھ دروازہ بند کیا اور ہمارے آگے چل پڑا۔ عمارت اندر سے خاصی وسیع تھی اور صاف ستھری تھی، مختلف راستے سے گزرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں پہنچے، لمبا شخص دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ہم سب اس کے پیچھے اندر کا منظر دیکھ کر حیرت

میں ڈوب گئے۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جس میں کھانے کی ایک بہت بڑی میز پر بہت سارے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ ہم سب کھانے پر ٹوٹ پڑے، پھر نیلم نے اس سے پوچھا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام جانیز ہے میں اس عمارت کے مالک نواب کا نوکر ہوں۔“ ٹھیک اسی لمحے دروازہ کھلا اور نہایت عالیشان لباس میں ایک خوب صورت نوجوان اندر آ کر قریب کھڑا ہو گیا۔ نواب صاحب نے ہمارے لئے مہمان ہیں۔ یہ بیچارے جنگل میں جیب خراب ہو جانے پر یہاں پہنچے ہیں تو میں نے انہیں پناہ دے دی۔

تم نے بہت اچھا کیا، نواب کی آواز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا اسی وقت عبد المجید نے سوال کر دیا۔

”نواب صاحب آپ کو اس دیرانے میں رہنے کا خیال کیسے آیا؟“

نواب کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، اس نے جواب دیا۔ ”در اصل جب میں دنیا کے ہنگاموں سے اکٹا جاتا ہوں تو میں یہاں آ کر ایک دو ماہ تک مکمل آرام کرتا ہوں۔ یہ عمارت میں نے برسوں پہلے ایک جاگیردار سے خریدی تھی۔“

پھر جانیز ہمیں لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ جس میں پانچ بیڈ آرام دہ بستروں اور دیگر ضروری سامان سے آراستہ تھا۔ ہم بستروں پر دراز ہو کر آرام کرنے لگے۔

نواب اور جانیز کے جانے کے بعد ہم مختلف حصوں کی سیر کرنے لگے، ایک کمرے میں داخل ہوئے، ہم چونک اٹھے کمرے کی دیواروں پر مختلف انسانوں کی مسخ شدہ لاشوں کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ کسی کا سر غائب تھا، کسی کا ہاتھ کٹا ہوا تھا جبکہ کسی کے جسم پر کسی دھم دھامی دے رہے تھے۔

”یاریہ ہم کہاں آ پھنسے۔“ نیلم نے سوچ کر کہا۔

”گھبراؤ نہیں، ہم کسی بھی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔“ نادر نے کہا۔ حالانکہ وہ بھی اندر سے کانپ کر رہ گیا۔

اسی طرح ایک اور کمرے میں الماریوں میں خطرناک چھرے، چاقو، خنجر اور برہمیاں رکھی ہوئی تھیں، ایک اور کمرے میں دیکھنے پر چھت پر لٹکتے ہوئے پھانسی کے چند پھندے بھی نظر آئے اور رسیوں کا ایک بڑا ڈھیر فرش پر اتھا۔

میرا دماغ بڑی تیزی سے اس خطرناک صورتحال کو سمجھنے میں مصروف تھا۔ آخر عمارت کی سیر سے فارغ ہو کر ہم باہر باغ میں نکل آئے، باغ کے ایک کونے میں گھنے درختوں کے نیچے ایک پرانا کنواں نظر آیا یہ کنواں اندر سے تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم واپس اپنے کمرے میں آ گئے اور آپس میں بات کرنے لگے۔

شام کے وقت نواب اور جانیز کھانے کی میز پر آن موجود ہوئے کھانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے نواب سے تمام احوال کہہ دیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”دوستوں یہ عمارت میں نے جس حال میں خریدی تھی۔ اسی حالت میں ہے، اسی لئے اگر چند ناخوشگوار چیزیں نظر آئی ہیں تو میں اس کے لئے آپ سب سے معذرت خواہ ہوں۔“

آج شام ہی سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ رات کے بارہ بجتے ہی خوفناک آندھی شروع ہو گئی جس سے جنگل میں ہر طرف گرد و غبار کا طوفان برپا ہو گیا اور میلوں تک بھی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اور میرے دوست خوش گیموں میں مصروف تھے، آخر کار ایک بجتے ہی ہم سب سو گئے، ابھی ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ کمرہ ایک زوردار چیخ سے گونج اٹھا، یہ چیخ میرے منہ سے نکلی تھی۔ جو میرے چہرے سے ہوائیاں اڑا رہی تھی اور کیوں نہ اڑاتی کیوں کہ ہمارا دوست مجید بستر پر موجود نہیں تھا۔

عباس اب ہم کیا کریں ہم اس خوفناک عمارت میں بہت برے محسوس کئے ہیں۔“ نادر نے مجھ سے کہا۔

اور ہم نے خفیہ طور پر عمارت کا کونا کونا چھان مارا مگر مجید کا کوئی سراغ نہ ملا اس سنگین صورت حال نے ہمیں متحیر کر دیا۔

صبح ناشتے کی میز پر ہم نے نواب اور جانی کو بہت خوشگوار موڈ میں پایا تو انہیں سخت حیرانی ہوئی نواب نے مجید کی کشیدگی پر جائیز سے استفسار کیا۔

اس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے تھلاں شروع کرنے کی تجویز پیش کی، عمارت کے اندر اور باہر دو گھنٹے کی تلاش کے باوجود مجید کا کوئی نام و نشان نہیں ملا، نواب کی کمرے میں چلا گیا اور جائیز اپنے کمرے میں جا گھسا۔

ہم خاموشی سے باغ میں بیٹھے اور اندھیرے کنوئیں میں پھیل نارج نکالی اور اس کی روشنی میں ہمیں کنوئیں میں خوفناک منظر دکھائی دیا کہ خوف سے ہمارے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا، دماغ نے سوچنا سمجھنا بند کر دیا اور دہشت نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند منٹ تک ہم گم سم کھڑے رہے۔

کنوئیں میں بڑی مجید کی مسخ شدہ لاش نے حواس گم کر دیے، جائیز سے پوچھنے پر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، آخر کار مجید کی لاش کو جنگل میں ایک جگہ دفن کر دیا گیا۔

ہم سب دوست متحیر ہو گئے، ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی جو اس عمارت میں چلے آئے سارا دن پریشانی میں بسر کیا، شام کو نواب نے ساری بات سن کر افسوس کا اظہار کیا اور بولا صبح اس معاملے پر غور کریں گے ہم سب رات ہوتے ہی سو گئے۔

آدھی رات کے وقت اچانک میں نے خواب میں دیکھا کہ نیلم ایک کمرے میں ریسیوں کے پھندے میں جکڑا رہا تھا اور اس کے قریب کھڑا جائیز ایک تیز دھار چھری سے زخم لگا رہا تھا جس سے نکلنے والا خون نواب اپنا منہ کھول کر پی رہا تھا۔ پھر نیلم نے ایک چیخ ماری اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھلی میرا پورا جسم پسینے سے تر ہوتا اور

سائیں کسی لوہار کی دھوکنی کی طرح تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔

میں نے نادر کو اٹھا کر خواب سنایا اور ہم دونوں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلے اور عمارت کے صدر دروازے تک پہنچے۔ چار کفن پوش مردوں نے ہمارا راستہ روک لیا ان مردوں کو دیکھ کر ہم سخت گھبرائے، ایک مردہ قہقہہ لگا کر بولا، ہمارے ممکن سے آج تک کوئی انسان زندہ واپس نہیں گیا ہے، کمرے میں چلے جاؤ ورنہ کچا چپا جائیں گے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار مکہ ایک مردے کی ناک پر رسید کیا تو وہ سر پکڑ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر نادر نے جب سے شکاری چاقو نکالا اور ایک مردے کے سینے پر پہنچ مارا مردے نے ایک ہولناک چیخ ماری اور دونوں غائب ہو گئے۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے آگے بڑھے، سامنے نواب اور جائیز کے ہمراہ چار کفن پوش مردے کھڑے تھے، خوفناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

نواب خوفی ڈر کیولا دکھائی دے رہا تھا جبکہ جائیز کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ دونوں کے منہ نیلم کے خون سے تھڑے ہوئے تھے۔

مردوں نے ہمیں پکڑ لیا اور ہمیں ایک کمرے میں بند کر کے چلے گئے مردوں کے جانے کے بعد میں نے کھڑکی کھولی تو ایک کفن پوش مردہ مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

میں نے ایک پتھر مردے کے سر پر دے مارا مردہ چند سیکنڈ کے لئے غافل ہوا میں اور نادر کھڑکی سے باہر اور ہتھیاروں والے کمرے میں جا کر دو لمبی کتواریں اٹھالیں، اسی دوران کفن پوش مردوں کی ایک ٹولی جس کی تعداد چار تھی کمرے میں داخل ہوئے اب ہمارے درمیان ایک خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا۔

مردے ہم پر ایک خطرناک انداز سے وار کر رہے تھے اور ہم نے جان بچانے کے لئے سر دھڑکی بازی لگادی اور آخر کار تمام مردوں کے سر اڑائے اچانک جائیز دروازے سے اندر داخل ہوا اور اڑتا ہوا نادر

پر حملہ آور ہوا نادر فرش پر گر پڑا۔

جائیز نے اسے دیوچ لیا اور اپنے نوکیلے دانت لہر لہہ اس کی شہرگ کے قریب لے جانے لگا میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتوار کا وار جائیز کی گردن پر کر دیا۔

ایک خوفناک چیخ کے ساتھ ہی جائیز کی گردن اڑ کر دور جا گئی۔ ٹھیک اسی لمحے عمارت خوفناک چیخوں سے گونج اٹھی، ہم دونوں بھاگتے ہوئے عمارت کے صدر دروازے کی طرف دوڑے، مگر ہمیں دور سے کفن پوش مردے اور ڈر کیولا دکھائی دیے جو دروازے کے سامنے موجود تھے پھر ہم عمارت کی طویل سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر پہنچے لیکن یہاں بھی ایک غیر متوقع صورت حال نے ہمارا استقبال کیا کیونکہ چھت پر دو کفن پوش مردے کھڑے تھے وہ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔

آخر کار موقع تاک کر میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک مردے کو زوردار لٹ رسید کیا وہ عمارت کی چھت سے نیچے جا گرا، دوسرے مردے کو نادر نے کتوار مار کر اس کی گردن اڑادی۔

پھر ہم دونوں عمارت کے پائپ سے نیچے اترنے لگے چھت پر مردے اور ڈر کیولا آگئے اور انہوں نے بلند آواز میں شور مچانا شروع کر دیا۔ دوڑو پکڑو، بھاگنے نہ پائیں۔

ہم نیچے اتر کر بھاگتے ہوئے کھجے جنگل میں گھس گئے، کئی کفن پوش مردے اور ڈر کیولا ہمارے تعاقب میں رہے۔ آخر کار ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں گھس کر ہم نے خود کو بچایا۔ پھر تمام مردے اور ڈر کیولا ہماری تلاش میں آگے سے گزر گئے۔ بڑی مشکل سے جان بچاتے ہوئے ہم دونوں اس جنگل کے درمیان میں پہنچے، یہ دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی کہ ایک بڑی سی جھوپڑی موجود تھی۔

ہم اس جھوپڑی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے، جھوپڑی میں ایک لائین روشن تھی، ہم نے ایک سفید ریش بزرگ کو ایک چٹائی پر بیٹھے اللہ کی عبادت

میں مصروف دیکھا۔ ہم آگے بڑھ کر بزرگ کے قدموں میں گر گئے، ”بابا خدا کے لئے ہمیں بچالو“ بزرگ نے چونک کر دیکھا اور بولے۔ ”اب تم بالکل محفوظ ہو، رحمان بابا کے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بھی پکا نہیں کر سکتا“ یہ سن کر ہماری جان میں جان آئی ہم نے تمام قصہ تفصیل سے رحمان بابا کے گوش گزار کیا۔

رحمان بابا بولے تم خدا کا شکر ادا کرو تم میری پناہ میں آگئے ورنہ جنگل میں موجود اس خونی عمارت نے آج تک ہزاروں انسانوں کا خون پیا ہے۔ اس عمارت میں نواب نامی ایک ڈر کیولا کفن پوش مردوں اور دیگر شیطانی طاقتوں کا سردار ہے۔ چونکہ وہ شیطان کا خاص چملا ہے۔ اسی لئے اس کے اندر شیطانی طاقتیں بھی موجود ہیں۔

چند سیکنڈ بعد جھوپڑی کے باہر خوفناک تہمتوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

پھر کمری نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”بابا ہمارے شکار ہمیں واپس کر دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ رحمان بابا ہمیں لے کر جھوپڑی کے باہر نکلے،

جھوپڑی کے چاروں طرف کفن پوش مردوں، ڈر کیولا اور بھوت، چڑیلوں کی ایک فوج کھڑی تھی ان کے عزائم نہایت ہی خطرناک اور جارحانہ لگ رہے تھے رحمان بابا تیز نظروں سے ان کو گھورا اور بولے۔ اچھا ہوا جو تم خود ہی موت کے منہ میں چلے، خلق خدا تم سے بہت شک ہے تمہارا وجود اس کائنات کے لئے نہایت مہلک ہے۔

بابا میں جانتا ہوں تم اپنے آپ کو ایک کامل بزرگ سمجھتے ہو، مگر نواب نے بھی آج تک کئی عامل بزرگوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔ نواب کی یہ بات سن کر رحمان بابا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

نواب نے اپنے ساتھیوں کو حملے کا حکم دیا۔ چاروں طرف سے مردوں نے یلغار کے انداز میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

رحمان بابا نے جلدی سے چند مقدس کلمات پڑھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا کر کے ان کا رخ

چھلاوا



اس چھلاوے نے سارے گاؤں والوں کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ بڑے بڑے عامل

آئے مگر سب اپنی جیبیں بھر کر چلے گئے۔

پیوست ہو جائے گی۔

آج کا انسان چاند کو بغیر کرنے کے بعد مرغ اور سورج پر جانے کے لئے پر توڑ رہا ہے۔ مگر آسبیلی دنیا پر قابو پانا اس سائنس کے بس کی بات نہیں اس معاملے میں سائنس بالکل ناکام و نامراد نظر آتی ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر دیہاتوں میں آج بھی آسبیلی جگہ، آسبیلی جوہر اور جن بھوت کے بسیرے موجود ہیں۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ انسانوں سے زیادہ تعداد ان کی ہے اگر آسان سے سوئی نیچے زمین کی طرف پھینگی جائے تو وہ ضرور کسی نہ کسی جن یا بدروح کے جسم میں

خونفک کہانیاں 41 اپریل 2018ء

شیطانی طاقتوں کی طرف کر دیا۔ انگلیوں سے بجلیاں نکل نکل کر شیطانی فوج کے سپاہیوں کو جسم کرنے لگیں۔ ویران جنگل شیطانی فوج کے کارندوں کی بھیا تک جیٹوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تک مقابلہ جاری رہا پھر تمام فوج جل کر راکھ ہوئی یہ دیکھ کر نواب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر پھونک ماری تو آگ کی ایک روشن دیوار نے رحمان بابا اور ہمیں گھیر لیا پھر نواب نے قہقہہ لگایا اور ایک اور منتر پڑھا تو دس کفن پوش مردے نمودار ہو کر ہمارے گرد گھیر اڑاں کر کھڑے ہو گئے نواب آگے بڑھ کر بولا۔ رحمان بابا آخر تم بھی میرے جال میں پھنس گئے اب میں تمہیں عبرت ناک موت دوں گا۔ ابھی اس نے یہی کہا تھا کہ رحمان بابا نے کچھ کلمات پڑھ کر پھونک ماری تو آگ غائب ہو گئی اور مردے ڈر کر پیچھے ہٹنے لگے۔

”رحمان بابا اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاؤ۔“ نواب نے کہا۔

اب رحمان بابا تیزی سے اپنی جھوپڑی میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد نکلے تو ان کے ایک ہاتھ میں قالین تھا اور دوسرے ہاتھ میں طلسمی تلوار تھی، قالین پر ان کے کھڑے ہوتے ہی وہ تیزی سے فضا میں بلند ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر نواب اور اس کے ساتھی بھی ہوا میں اڑنے لگے، قالین کی رفتار تیز ہونے کے باوجود بھی درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار نواب قالین کے قریب پہنچا اور رحمان بابا پر چھٹا تو رحمان بابا نے تلوار کا وار کر دیا تو اس کا ہاتھ کٹ کر نیچے جا کر نواب ایک بھیا تک چیخ مار کر دور ہو گیا اور پھر دوبارہ حملہ آور ہوا۔

اس بار اس کا دوسرا ہاتھ بھی کٹ کر نیچے جا کر۔ اب اس کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا جبکہ مردوں نے قالین کو گھیرے میں لے لیا۔ رحمان بابا کی تلوار برق رفتاری سے چلنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ رحمان بابا کچھ پڑھتے بھی جا رہے تھے۔ آخر کار تمام کفن پوش مردے مارے گئے۔

اب نواب کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا تو سینکڑوں عقاب رحمان بابا پر چھنے، رحمان بابا کے چہرے پر لگ کر مندی کے آثار نمودار ہوئے پھر منہ میں کچھ پڑھ کر تلوار کا رخ عقابوں کی طرف کر دیا۔

☆☆

خونفک کہانیاں 40 اپریل 2018ء

خوف و ہراس کے افق پر شکستیاں کرتی جسم و جان کو لرزادینی والی دل گرفتہ و دل شکستہ روداد جو کہ پڑھنے والوں کو اچھے میں ڈال دے گی۔



”کیا کھا.....؟“ چاندنی اچھل پڑی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔

”کیا تم کوئی پاگل عورت ہو.....؟ دیکھ نہیں رہی ہو کہ میں انسان ہوں؟ کوئی جانور نہیں جسے بھون کر کھایا جائے.....؟“

”نہیں..... نہیں..... میں پاگل نہیں ہوں.....؟ کیا پاگل عورت مجھ جیسی ہوتی ہیں.....؟“

اس نے استہزاء سے لہجے میں جواب دیا۔

”دنیا میں انسان کے گوشت سے زیادہ لذیذ، ذائقہ دار اور مزے دار گوشت کسی جانور اور حیوان کا نہیں ہوتا ہے..... کیا تم نے اپنی زندگی میں کسی آدمی کا گوشت نہیں کھایا؟“

”انسان کا گوشت پاگل نہیں بلکہ آدم خور کھاتے ہیں.....؟ انسان نہیں کھاتا ہے..... وہ حیوان، پرندوں، چھلیوں کا گوشت کھاتا ہے..... یہی اسے مرغوب بھی ہوتا ہے.....“ چاندنی نے کہا۔

”لیکن ہم لوگ کھاتے ہیں؟ نہ صرف بڑے ذوق و شوق اور رغبت سے بلکہ اس کا خون اور ذائقہ منہ کو ایسا لگا ہوا ہے کہ کسی اور کا گوشت مزہ نہیں دیتا ہے؟ اگر تم نے کبھی کسی انسان کا گوشت کھایا ہو تو بھولے سے بھی کسی اور کا گوشت کھانا پسند نہیں کرو گی؟“

”چونکہ کبھی شاید انسان کا گوشت کھانا نصیب نہیں ہوا اس لئے تم اس کے ذائقے اور لذت سے محروم

”ہو..... یہ تمہاری بد نصیبی اور احساسِ محرومی ہے؟“

”لگتا ہے کہ تم جنگلی اور وحشی ہو اس لئے انسانی گوشت رغبت سے کھاتی ہو.....؟ میرا تعلق مہذب دنیا سے ہے اور ایسا ممکن نہیں کہ..... آدمی کا گوشت آدمی کھائے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”ہم نے سنا ہے کہ مہذب دنیا میں آدمی کا گوشت آدمی کھاتا بلکہ اس کا خون بھی پیتا ہے..... اس لئے وہاں خون خرابہ، قتل و غارت گری آئے دن ہوتی رہتی ہے.....؟ کیا یہ بات غلط ہے.....؟“

”اس کی وجہ دولت، عورت اور ہر قسم کی ہوس گیری ہوتی ہے..... وہ اس کے حصول میں اندھا ہو جاتا ہے..... قتل و غارت گری تو ہوتی ہے لیکن اس کا گوشت نہیں کھایا جاتا ہے۔“

”کاش.....! ہم تمہارے شہر میں ہوتے تو مڑا آ جاتا..... وارے وارے نیارے ہو جاتے۔ ہم روز انہ آدمیوں کا گوشت کھاتے..... واہ کتنا مزہ آئے گا۔“

چاندنی نے اندازہ کر لیا کہ یہ عورت پاگل اور خطی حواس ہے، اس لئے نہ صرف یہی کہی بلکہ ایسی باتیں کر رہی ہے کہ سامنے والا دہشت زدہ ہو جائے۔ اس نے سوچا کہ نہ صرف اس کی خوشامد بلکہ اس کی منت ساجت اس کی تعریف کر کے فریب سے کام لیا جائے اس تدبیر کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔

”اچھا..... اپنی تعریف سن کر اس عورت کا چہرہ

کھل اٹھا وہ اتنی حسین نہ تھی کہ اس کی تعریف کی جائے لیکن وہ مرنے نہ کیا کرتی۔ "لیکن تم بھی بہت حسین ہو دل نہیں کر رہا ہے کہ تمہیں بھون کر کھایا جائے؟"

"جب تمہارا دل نہیں کر رہا ہے تو پھر یوں کرو کہ مجھے جانے دو۔" چاندنی نے بڑے شے شے لہجے میں کہا۔

"تمہیں کوئی اور لڑکی، عورت مل جائے گی۔ میں ایک مسافر عورت ہوں..... مجھ پر رحم کرو۔"

"برسوں کے بعد ایک حسین لڑکی تو نظر آئی ہے۔" وہ بولی۔

"اور پھر میرے دو ایک ساتھیوں نے تمہیں دیکھ لیا ہے وہ آ رہی ہیں میں ان کا انتظار کر رہی ہوں..... بس ان کے آنے کی دیر ہے۔ پھر تمہیں ذبح کر دیا جائے گا۔"

اس عورت کے آخری جملے کوں کر اس کے بدن پر نہ صرف سن سنا ہٹ دو دھنکی بلکہ اس کا سینہ دھڑک اٹھا بلکہ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور سارا جسم پسینے میں بھینکنے لگا۔

"کیا..... کیا.....؟" چاندنی کے گلے میں آواز چھنے لگی۔

"کیا تم اکیلی نہیں ہو..... تمہارے اور بھی ساتھی ہیں؟ کیا وہ سب کے سب آدم خور ہیں؟ کیا یہ آدم خوروں کی بستی ہے.....؟"

"ہم آدم خور نہیں ہیں.....؟" وہ بتانے لگی۔

"یہ کوئی تیس برس پہلے کی بات ہے کہ یہاں ایک جوڑا آیا تھا اور اس نے ہم لوگوں پر حملہ کر دیا ہم سب نے مل کر انہیں قتل کر دیا تھا لہذا عورتوں سے نہ صرف ان کا خون پی گئے بلکہ ان کا گوشت بھون کر کھائے کبھی ہم نے حیوان کے علاوہ انسان کا گوشت نہیں کھایا۔ پرندوں، مویشیوں اور مچھلی پر گزارا ہوتا تھا سانپ، بچھو، گرچھ اور اڑدھسے بھی کھاتے رہے تھے۔ جب آدمیوں کا گوشت کھایا تو ایسی لذت، ذائقہ اور مزاحمت کو لگا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم آدمی کا گوشت کھانے لگے۔ شکاری تلاش میں ہم لوگ نکل جاتے تھے

لیکن یہاں کوئی آدمی قدم نہ رکھتا تھا۔ جب کوئی مرد، عورت اور لڑکی مل جاتی تو اسے لے آتے..... برس دو ایک برس میں شکار ملتا تھا تم دو برس کے بعد ہاتھ لگی ہو..... تمہیں دیکھ کر خوشی سے جو میرا حال ہوا اور ہو رہا ہے میں اسے زبان سے کہہ نہیں سکتی۔"

تم لوگوں کو ایک انسان کو ذبح کرتے ہوئے ترس نہیں آتا ہے..... جب کہ میں عورت ہوں.....؟" چاندنی نے کہا۔

"مرد ہو..... عورت ہو..... لڑکی یا لڑکا ہو.....؟ جس طرح گھوڑا گھاس کھائے بغیر نہیں رہتا ہے اس طرح ہم بغیر انسانی گوشت کھائے کیسے رہ سکتے ہیں.....؟" وہ عورت نے ہنسنے ہوئے کہا۔

"جب بھی کوئی شکار لگ جاتا ہے تو ہم جشن مناتے ہیں اسے ذبح کرنے سے پہلے.....؟"

"کیسا جشن.....؟" اس کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ چاندنی کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی چہرہ جو زرد پڑ گیا تھا وہ سفید پڑنے لگا نہ صرف اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز بلکہ سینے کی دھک دھک بھی بڑھنے لگی۔ اس کی رگوں میں لہو ٹھمدہ ہونے لگا وہ برف کا تودہ بنتی جا رہی تھی جیسے۔

"اس بستی میں صرف ہم خود ہی ہیں۔" وہ کہنے لگی۔

جب کوئی عورت یا لڑکی ملتی ہے تو ہم ایک عرق پلاتے ہیں تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے..... پھر ہم اس کے جسم کے تشیب و درغراز، تناسب اور ایک انگ میں چاقو اور خنجروں سے سوراخ، چھید اور زخم کر دیتے ہیں تو ان میں سے خون اگلنے لگتا ہے اور ہم منہ لگا کر اس طرح پیٹے ہیں جیسے وہ کوئی نہ ہو۔ پھر اس کے جسم میں لہو کی پوند بھی نہیں رہتی اور پھر وہ موت کی آغوش میں جانے لگتی ہے کچھ دیر بعد وہ بے جان ہو جاتی ہے پھر اسے ذبح کر دیا جاتا ہے پھر اس کے جسم کے سارے اعضاء الگ کر لئے جاتے ہیں۔ پھر الاؤ روشن کر کے بھوننا جاتا ہے لڑکی اور عورت کا جسم زیادہ بھونینے کی

نوبت نہیں آتی ہے وہ دھبی آگ پر جلد ہی بھون جاتی ہے پھر ہم سب ایک بڑی تھال میں رکھ لیتے ہیں اس کا سر بھونتے ہیں تو بالوں اور آنکھوں سمیت..... اس کے کان، ناک، گال اور ہونٹ میں ایک عجیب سا سوندھا سوندھا پھین اور لذت ہوتی ہے پھر ہم اسے فوراً جٹ کر جاتے ہیں مردوں میں یہ بات نہیں ہوتی، انہیں زیادہ دیر تک بھوننا پڑتا ہے جو لذت اور ذائقہ تو جوان لڑکی اور جوان سال عورت میں ہوتی ہے وہ ایک مرد میں نہیں ہوتی ہے۔"

یہ عورت جو قدرے تفصیل اور وضاحت سے بتا رہی تھی اس کی بات سن کر چاندنی کے رونگٹے کھڑے ہوئے جارہے تھے۔ اس کے منہ کو کچھ آ رہا تھا۔ اگر وہ ایک عورت ہوتی تو پھر اسے نکل کر کسی نہ کسی طرح اس پر قابو پالیتی..... لیکن نوا فراد تھے سات عورتیں اور دو مرد..... وہ تمہا ان سے کیسے مقابلہ کر سکتی تھی اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

پھر ایک لذت چاندنی کو خیال آیا کہ سب سے بڑا ہتھیار رذ ہات ہوتی ہے۔

اس عورت سے باتوں کے درمیان اس بات کا خیال آیا تھا، کوٹھری سے جب اسے باہر لے جایا جائے گا کہ اور آدم خور جب اس کو کھلونا بنائیں گے تب وہ اپنا ہتھیار استعمال کرے گی۔

اس نے سوچا کہ جب کوئی مرد اس کی طرف بڑھے گا تو اس کے پاس جو ہتھیار ہوگا وہ یہ کہ اپنا لباس نکال کر بے لباس کی حالت میں آ جائے گی وہ چونکہ نہ صرف بے حد حسین اور بے پناہ پرکشش بھی..... اس حالت میں مرد اسے دیکھ کر مسحور ہو جائیں گے اور یہ عورتیں جل جائیں گی اس عورت کو دیکھ کر چاندنی کو اندازہ ہوا کہ ساری عورتیں یقیناً اس عورت کی طرح بد صورت، بد نما، موٹی بھدی اور بے کشش ہوں گی ان کی رنگت بھی کوئے کی طرح سیاہ ہو رہی تھی۔

جس جگہ اسے لے جایا جائے گا کہ جشن منائیں گے وہ یقیناً اس مکان سے باہر نکلیں گے۔ وہ بے

لباس ہونے کے بعد ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔ اسے دوڑنے میں کوئی دشواری اور رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ اس کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی یوں بھی وہ تیزی سے بھاگنے میں بڑی مہارت رکھتی ہے کیونکہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی میں وہ ہمیشہ چار سو میٹر کی ریس میں اول آتی رہی ہے یہ وحشی آدم خور دوڑنے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے چونکہ وہ ساڑھی میں ملبوس ہے اس لئے تیز رفتاری سے دوڑ نہ سکے گی پھر اس کے خوف ہراس کا اعتماد بھال ہونے لگا۔

چند لمحوں کے بعد چاندنی نے اس سے کہا۔ "ہمارے شہر میں گوشت کی ایسی ایسی چیزیں بھون کر پتی جاتی ہیں کہ اس کا ذائقہ، مزہ، اور لذت انسانی گوشت سے بھی بڑھ کر بھی ہوتی ہے۔ تم میرے ساتھ یہاں سے بھاگ کر چلو..... میں تمہیں روزانہ یہ گوشت کھلاؤں گی..... اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں ایسی لذیذ ہوتی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو؟"

"نہیں..... میں تمہارے ساتھ کہیں بھی بھاگ کر نہیں جاسکتی اور نہ جانا چاہتی ہوں اس لئے کہ میں نے اس بستی میں جنم لیا ہے..... اور پھر میرے ساتھی مجھے جانے نہیں دیں گے....."

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی یہاں رہ جاؤں اور تم لوگوں میں محل مل جاؤں.....؟" چاندنی نے جیسے ترپ چال چلی۔

"نہیں.....؟" وہ بولی۔

"ہم کسی اجنبی کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت اپنے ساتھ کسی قیمت پر بسانا پسند نہیں کرتے ہیں..... اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے.....؟"

"وہ کس لئے.....؟"

"اس لئے کہ ہم جو آدمی کا گوشت کھاتے ہیں اس میں کسی کو حصہ دار نہیں چاہتے ہیں..... کیوں کہ یہ گوشت ہمارے لئے بھی بہت کم پڑ جاتا ہے۔"

چاندنی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس عورت کو کیسے

شیشے میں اتارے؟ یہ بہت تیز اور ہوشیار لگ رہی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اس کے سامنے آنے سے پہلے اسے فریب دے کر اعتماد میں لے لے۔ کسی نہ کسی طرح بچرے سے باہر آ جائے۔ باہر آنے کے بعد وہ کسی تدبیر سے اس پر قابو پانے کی کوشش کرے گی اس کے لئے یہ آسان نہیں تھا کیوں کہ اس عورت کا جسم مردوں کی گھٹنا ہوا اور مضبوط تھا اسے زیر کرنا آسان نہیں تھا وہ مرد مار جسم کی عورت تھی، یہ عورت ایک ہاتھ ماروے تو وہ بہت دیراٹھنے اور سنبھلنے کے قابل نہیں رہے گی وہ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔۔۔۔۔ دوسرا دروازہ عورتیں گھس آئیں اسے دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ سب بچرے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے گھورنے اور اپنی رال پکانے لگے۔

”ارے تو نے یہ شکار کہاں سے پکڑا ہے۔۔۔۔۔ تجھے کہاں ملا۔۔۔۔۔؟“ ایک مرد نے اس عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر لیا۔

”کتنی دیر ہوئی۔۔۔۔۔؟ تو خوش خبری سنانے آئی کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“

اتنا کہہ کر وہ اس عورت کے چہرے پر جھک گیا۔۔۔۔۔ دونوں تھوڑی دیر تک جذباتی ہوتے رہے۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟ تھوڑی دیر پہلے ہی تو ہاتھ لگی ہے۔۔۔۔۔ یہ مسافر عورت ہے۔۔۔۔۔ راستہ بھول کر ادھر آ گئی۔۔۔۔۔؟“ اس عورت نے اس مرد کے گلے میں جواہری مریں اور عریاں ہاتھیں حاکن کی ہوئی تھیں وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

”دیے تو نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جو اسے لا کر بچرے میں قید کر دیا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”جب ہم اسے بھون لیں گے تو تیرا انعام یہ ہوگا کہ اس کا جو حصہ عضو اور خطوط اور تناسب جتنا چاہے کھا سکے گی؟ ویسے یہ لڑکی جتنی حسین ہے اس کا گوشت بھی انتہائی لذیذ، ذائقہ دار اور مرے دار ہوگا۔۔۔۔۔ برسوں کے بعد زبردست شکار ملا ہے۔۔۔۔۔ اب تو ہمیں ہر طرح کا

جشن منانا ہوگا اسے دیکھ کر بھوک تیز ہونے لگی ہے۔“

اس دوران چاندنی نے ان ساتھی عورتوں کو دیکھا جن کا لباس نامناسب اور مختصر سا تھا۔ گوہ جواں سال تھیں اور ان کے نشیب و فراز بچان خیر تھے لیکن وہ سب کالی، بھلٹی، بہت ہی بد صورت اور بھیاں لگ رہی تھیں وہ سب کی سب دراز قد تھیں وہ اسے بری طرح گھور رہی تھیں ان پر چاندنی کو چڑیلوں کا دھوکہ ہو رہا تھا۔

چاندنی کو یہ عورتیں چڑیلوں اور مرد بد روح نہیں لگ رہے تھے یہ وحشی قبائلی تھے ان کے منہ کو انسان کا گوشت لگ گیا تھا اس لئے یہ درندہ صفت اور خون آشام بن گئے تھے۔ آدم خور ہو گئے تھے یہ بد صورت اور بھیاں لگ اور چڑیل نما عورتیں اس کے حسن و شباب کو حسد و جلن اور رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ ایک نوجوان دو تیز ہے اپنی جان اور آبرو بچانے کے لئے بے لباس ہو کر کیا بھاگ سکے گی؟ اگر صرف عورتیں ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ جو مرد تھے ان کے سامنے وہ کیسے بے لباس ہو کر فرار ہو سکتی ہے؟ لیکن اپنی زندگی بچانے کے لئے اسے اس بے چارے کی حالت میں آنا پڑے گا۔۔۔۔۔ ورنہ یہ دونوں مرد اس کے ساتھ جشن منائیں گے اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ پھر اس ذبح کر دیں گے۔۔۔۔۔؟

کون سی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ اپنی عزت اور جان بچائے۔۔۔۔۔؟ وہ لباس میں تیز رفتاری سے دوڑنے سے رہی۔ اسے مرد اور عورتیں بھی تعاقب کر کے دیوچ لیں گے؟ قابو میں کر کے بے بس کر دیں گے؟

خوف و دہشت سے اس کا جسم لرزنے لگا۔ وہ عورتیں بچرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس آئیں اور اسے نرغہ میں لے لیا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ شاید اسے بے لباس کر کے گھر سے باہر لے جائیں گی۔ لیکن اسے بے لباس تو نہیں کیا البتہ ایک نے اس کی ہاتھیں دبا لیں۔ دوسری نے گلے سے نیچے ہاتھ پھیرتے

ہوئے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔۔۔۔۔

ان عورتوں نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ تاثر دیا تھا کہ انہوں نے چاندنی کے جسم کے گوشت کا حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔۔۔۔۔ اس پر ان کا حق ہے۔

بچرے کے باہر جو وہ دونوں مرد کھڑے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کہا۔

”اس کا سر ہم دونوں کا ہوگا۔۔۔۔۔ آنکھیں اور ناک اور کھوپڑی اور اس کے جسم میں جو کچھ بھی ہوگی اور وہ اس کے پاؤں بھی صرف ہمارے ہوں گے۔“

وہ عورت جس نے گھر میں لا کر بچرے میں قید کر دیا تھا وہ اپنے ساتھیوں سے بولی۔

”اب اس شکار کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر میدان میں لے چلو۔۔۔۔۔ اسے دیکھ کر اور اس کے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک نے بھوک تیز کر دی ہے۔ کتنے مہرے کے بعد بلکہ برسوں کے بعد ایسا گلابی شکار ملا ہے۔“

”ہاں جلدی کرو۔۔۔۔۔“ ان مردوں میں سے ایک نے کہا۔

پھر وہ عورتیں اسے جبر و زبردستی اور سفاکی سے کھینچتی ہوئی مکان سے باہر لے آئیں۔

خوف و دہشت کی کیفیت میں بھی چاندنی نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

ایک سمت کوئی تیس چالیس قدم پر اسے ایک کھائی نظر آئی جو ایک پہاڑی کے دام میں تھی۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ کھائی کتنی گہری ہے۔۔۔۔۔ مقابل جو سمت تھی اسے وہاں ایک گھنا بھنگل نظر آیا۔

اس کے دائیں بھائیں کھیت اور پگ ڈنڈیاں تھیں ایک ناہوار کچا راستہ جو ایک کھلے میدان میں چار تھا اس میدان کے ارد گرد جھاڑیاں تھیں لمبی لمبی اور خاردار۔۔۔۔۔ جن کے عقب میں چھپ جانے والا نظر نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔ ان جھاڑیوں کے درمیان جو راستہ

گزرتا تھا اس کی حد نظر نہیں آ رہی تھی۔

چاندنی کو جس میدان میں کھڑا کیا گیا تھا اس سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر الاؤ تھا۔۔۔۔۔ اسے ذبح کرنے کے بعد یہ الاؤ روشن کر دیا جائے گا۔ اس الاؤ کے پاس لکڑیاں اور گھاس پھوس بھی تھی جولاؤ کو دھکانے کے لئے رکھی ہوئی تھی وہ الاؤ شاید یہ وحشی سانپ، بچھو اور موسیٰ شاید بھون کر کھاتے تھے۔۔۔۔۔ وہاں بہت ساری راکھ بھی موجود تھی۔

چاندنی کی میدان کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔۔۔۔۔ دونوں مرد عورتیں دائرہ بنا کر کھڑی ہو گئیں تاکہ تماشا دیکھ سکیں چاندنی نے خود پر اور اپنے حواس پر قابو پایا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ اس قدر خوف زدہ نہیں تھی اور نہ ہی ڈر رہی تھی۔۔۔۔۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہ بھینٹ یا مرد اپنے گھناؤنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ایک مرد نے بھیڑے نکل کر اپنی لمبی اور گھنی اور خوف ناک مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

”اے عورت۔۔۔۔۔ تو اپنے کپڑے اتار دے تاکہ میں تجھ سے کھیل سکوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں اتاروں گی۔۔۔۔۔ میں عورت ہوں۔“ چاندنی نے جواب دیا۔

”عورت۔۔۔۔۔؟“ وہ تھپہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔

”یہ سب عورتیں ہیں۔۔۔۔۔ صرف اشارے پر کپڑے اتار دیتی ہیں۔“

پھر اس نے ان عورتوں کی طرف دیکھا اور ان سے حکمانہ لہجے میں کہا۔

”تم سب اپنے کپڑے اتار دو۔۔۔۔۔ تاکہ یہ بھی اپنے کپڑے اتار دے۔۔۔۔۔؟“

ان سب عورتوں نے ایک ایک کر کے اپنے کپڑے اتار کر ایک طرف پھینک دیئے۔۔۔۔۔ وہ سب حیوان کی حالت میں ہو گئی تھیں، ان کے جسم پر تن پر ایک دھجی تک نہیں رہی تھی۔

”دیکھو..... ان سب نے اپنے اپنے کمرے اتار دیے ہیں..... اب بھی اتار دو.....“ مرد فرمایا۔

”میں کسی قیمت پر اپنے کپڑے نہیں اتاروں گی.....“ چاندنی نے غصے سے کہا۔

اس مرد نے ان عورتوں سے کہا۔

”تم سب مل کر اس کے کپڑے اتار دو.....“

پھاڑو..... یہ بڑے خمرے دکھا رہی ہے.....“

عورتیں جب چاندنی کی طرف بڑھنے لگیں اس عورت نے چیخ کر جس نے اسے لاکر پنجرے میں قید کیا تھا بذاتی کیجے میں کہا۔

”نہیں..... نہیں..... اس کا لباس نہ اتارو اور نہ ہی پھاڑو.....“

”وہ کس لئے تم منع کر رہی ہو.....؟“ اس مرد نے کہا۔

”تمنا دیکھنے میں لطف نہیں آئے گا.....؟“

”اس لئے کہ اس کا لباس بہت اچھا، خوب صورت اور شان دار ہے..... ہمارے پاس ویسے ہی کپڑے نہیں ہیں..... اور پھر اس لڑکی کے گوشت پر نہ صرف میرا حق ہے بلکہ اس کے کپڑوں پر بھی.....“ عورت نے جواب دیا۔

”میں نے اگر اس کے تن پر سے کپڑے اتارنے کی کوشش کی تو خمرے دکھائے گی اور پھر اس کے کپڑے پھٹ سکتے ہیں.....“ مرد نے کہا۔

ساہی مرد نے اس مرد سے کہا۔

”میں اس لڑکی کو دو بوج کر قابو میں کرتا ہوں.....“

تم آ کر اسے لباس سے محروم کر دو۔“

وہ مرد اسے کسی درندے کی طرح گھورتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس سے تین چار قدم دور تھا کہ وہ ٹھوکر کہا کر منہ کے بل گر پڑا۔ پھر چاندنی نے بل بھر کی تاخیر بھی نہیں کی اس کے منہ پر لات رسید کی اور ان عورتوں کی طرف بڑھی تاکہ ان کے درمیان سے گزر جائے دوسرا مرد چاندنی کو دو بوجے کے لئے بڑھا تو چاندنی نے ایک لات اس کے پیٹ میں پوری قوت سے رسید کی

تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، زمین پوس ہو گیا۔

اس کے راستے میں جو عورتیں جاگلی ہو رہی تھیں ایک دم سے خوف زدہ ہو کر تیزی سے ہٹ گئیں۔

پھر چاندنی نے ساڑی کو گھٹنوں سے اوپر اٹھا کر جدھر منہ اٹھا اُدھر بھاگی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ سر اسکی کے باعث وہ کھائی کی طرف آگئی ہے.....

پھر اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا..... وہ مرد اور عورتیں جتنی چلاتی ہوئیں اس کے تعاقب میں آ رہی ہیں..... وہ غصے سے پاگل ہو رہی ہیں۔

چند لمحوں کے بعد اس نے خوف و ہراس کی کیفیت میں ایک ایسا منظر دیکھا جو اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ وہ خیر زدہ ہو کر رہ گئی۔ سانسوں کے زبردیم سے اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں..... سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سینہ شق ہو جائے گا، اس کا دل باہر نکل آئے گا۔

وہ دونوں مرد اور عورتیں اندھوں کی طرح فضا میں ہاتھ چلا رہی تھیں۔

وہ عورت جس نے اسے پنجرے میں قید کیا تھا وہ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

”میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے..... مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے.....؟“

”میں بھی اندھی ہو گئی ہوں.....؟“ دوسری عورت نے کہا۔

”مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے.....؟“ تیسری عورت نے چیخ کر کہا۔

”میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے..... کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے.....“ چوتھی عورت نے کہا۔

”میری بینائی کو کیا ہو گیا ہے.....؟ تم سب کہاں ہو.....؟“ ایک مرد نے کہا۔

”کچھ خبر نہیں.....؟ میں بھی اندھا ہو گیا ہوں.....“

لگتا ہے کہ یہ عورت کوئی جادوگرنی ہے جس نے جادو سے ہم سب کو اندھا کر دیا ہے.....؟“ دوسرے مرد نے کہا۔

”اسے جلدی پکڑ لو..... جانے نہ دو.....“

”وہ دکھائی ہی نہیں دے رہی ہے تو اسے کیسے پکڑیں.....؟“ پہلے مرد نے کہا۔

یہ امر نہایت حیرت انگیز ناقابل یقین اور سنسنی خیز تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں مرد اور عورتیں دیکھتے ہی دیکھتے ہی پاگل ہو گئے تھے۔ پھر وہ سب ایک ایک کر کے کھائی میں گرتے گئے فضاء جوان کی دل خراش چیخوں سے گونج رہی تھی وہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتی گئیں پھر ایک بے کراں سانسٹا اٹھا گیا۔

چاندنی جو اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی تھی اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی بھیا تک خواب دیکھ رہی تھی۔

جب اس کا سینہ اور سانسیں اعتدال پر آئیں تو کھائی کی طرف بڑھی اور پھر اس نے کھائی میں جھانک کر دیکھا۔

یہ کھائی کوئی سوٹ گہری تھی نیچے ان آدم خور مرد اور عورتوں کی لاشیں خون میں لت پت اور بکھری پڑی تھیں ان سب کا حشر شر ہو گیا تھا ان سب کے سر پھٹ گئے تھے جسموں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں ان کے ہاتھ پیر بھی سلامت نہ رہے تھے کھائی میں جو خونخوار درندے تھے وہ سب ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔

یہ آدم خور مرد اور عورتیں جو اس کا تماشا دیکھنے والے تھے وہ خود تماشا بن گئے تھے۔

ان درندوں نے اس کا گوشت بھون کر کھانے کے لئے اسے ذبح کرنے والے تھے۔ لیکن کھائی میں ان کی لاشیں بکھری پڑی ہوئی تھیں درندے مزے لے لے کر ان کا کچا گوشت کھا رہے تھے۔

وہ ایک کھنے درخت کی چھاؤں میں اس کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

وہ سوچنے لگی کہ اب کہاں جائے.....؟ یہ بستی جو بڑی پر اسرار اور خوف ناک وادی کی طرح ہے اس سے باہر جتنا جلد از جلد ہو سکے نکل جائے..... وہ بے عزت اور بے آبرو ہونے سے بال بال بچی تھی وہ

دونوں مرد اس کی بے رحمی کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اسے فنا کر دیا جاتا اور پھر اسے بھون کر کھا جاتے اور وہ ان سب کا لقمہ بن جاتی.....؟

ایک بات جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور معمرہ بن گئی تھی کہ وہ آدم خور صفت مرد اور عورتیں اندھے یک لخت کیسے بن گئے تھے اگر وہ اندھے نہیں ہو جاتے تو وہ ان کے ہاتھوں سے کسی قیمت پر بچ نہ پاتی..... اس نے اپنی زندگی میں شاید کسی کے ساتھ بھلائی کی ہوگی کہ جو آج اس مصیبت کی گھڑی میں کام آگئی اور آتی جا رہی ہے..... کیا کسی ناہیدہ ہستی نے اسے وہ اس کی عزت و آبرو اور زندگی بچائی ہے۔

پھر وہ ابھی اور اس نے اپنا سفر جاری رکھنے اور اس آسپاسی بستی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا..... اب وہ یہاں رک کر کیا کرنی؟ ہر طرف اسے موت رقصاں نظر آ رہی تھی کسی بھی لمحے موت اسے نکل سکتی تھی۔

وہ شمالی جنوب کی طرف چل پڑی کہ شاید اسے کوئی بڑی شاہراہ مل جائے۔ بڑی شاہراہوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت دن رات رہتی تھی شاید کوئی بس آؤ یا ریلوے اسٹیشن بھی قریب ہو، ایک آس اور موہوم سی امید پر چلنے لگی اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں رہا تھا..... اور پھر اسے بڑے زور کی جھوک لگ رہی تھی۔

ایک کھٹنے کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے ایک کنیا نظر آئی تو وہ دسے پاؤں اور بے آواز کنیا کی طرف بڑھی کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے اندر کوئی بلایا آدم خور ہو، کوئی چیل، بدروح اور سر بریدہ لاش..... اس کنیا کے علاوہ کوئی گھریا عمارت نظر نہیں آئی۔

اس کی نگاہ کنیا کی دیوار پر پڑی، اس میں درمیان میں ایک جھری سی تھی، اس نے جھری سے اندر جھانکا اندر ایک کمرہ تھا اور اس کے ایک کونے میں چار پائی تھی، اس پر ایک میلا پکیلا سا بستر بچھا ہوا تھا ایک کونے میں پانی کا گھڑا، چولہا اور کچھ برتن دکھائی دیے، پھر وہ کنیا کے اندر گھس گئی کہ شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔

ایک پتیلی جو گھڑے کے پاس رکھی تھی اس کا

دھکن اٹھایا دھکن اٹھاتے ہی اس کا خون جیسے خشک ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ برتن خون سے بھر اہوا تھا اور اس میں دو انسانی آنکھیں اور برکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور پھر وہ آنکھیں مسکرانے لگیں تو چاندنی فوراً ہی کنپلیا سے نکل کر چند ہر منٹ اٹھا دھرتیز سے دوڑنے لگی۔

وہ اس قدر ڈری اور خوف زدہ ہو گئی تھی کہ کچھ دیر بعد وہ بڑی شاہراہ پر آئی اس قدر حواس باختہ ہو رہی تھی کہ مخالف سمت سے تیزی سے آنی ہوئی کار کو دیکھ نہ سکی۔ سڑک پار کرنے لگی تو کار سے ٹکرائی، کار چلانے والے نے احتیاط نہیں برتی اور بریک نہ لگایا ہوتا تو وہ اس کے پیچے کی زد میں آ کر پکلی جا چکی ہوتی۔ کار کی ٹکر سے وہ گر کر بے ہوش ہو گئی۔

اور پھر وہ کتنی دیر بے ہوش رہی اسے اندازہ نہ ہو سکا جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بڑی اور آرام دہ مہری کے بستر پر دراز پایا۔ پہلے وہ یہ سمجھی کہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے دوسرے لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے وہ کسی گھر کے بیڈ روم کے بستر پر دراز ہے۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا اس کے سامنے بڑے صوفے پر اس کی ہم عمر تین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں وہ نہ صرف نوجوان بلکہ حسین اور دلکش خدوخال کی تھیں اسے بیدار دیکھ کر اس کے پاس آئیں۔

”اب آپ کیسی ہیں۔۔۔۔۔؟“ اس لڑکی نے سوال کیا جو گلابی لباس میں ملبوس تھی اس نے پوچھا۔

”میں۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔؟“ چاندنی نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”آپ لیٹی رہیں۔۔۔۔۔“ اس لڑکی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے نہیں دیا۔

”ہم بہت پریشان تھیں کیوں کہ آپ دو تین دن سے بے ہوش تھیں لیکن حالت خطرے سے باہر تھی۔۔۔۔۔“

آپ کی بے ہوشی تشویش کا باعث تھی۔۔۔۔۔“

”کیا آپ نے خودکشی کی کوشش کی تھی؟ کیا میں اس کی وجہ معلوم کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ چاندنی نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ڈپٹی طور پر بہت پریشان تھی اس لئے سڑک پار کرتے ہوئے میں گاڑی دیکھ نہ سکی تھی۔۔۔۔۔ گاڑی کے بریک نہ لگتے تو میں شاید بچ نہ پاتی۔“

تیسری نے بڑے پیار سے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”آپ کتنی پیاری ہیں۔۔۔۔۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں چودھویں کے چاند کو اس کمرے میں دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔“

”آپ لوگ کون ہیں۔۔۔۔۔؟ آپ کتنی اچھی اور عظیم ہیں، کوئی اور ہوتا تو مجھے علاج کے لئے نہ لاتا اور نہ ہی میری زندگی بچاتا اور وہ بھاگ جاتا کہ کہیں پولیس کیس نہ بن جائے کیا آپ ختیوں نہیں ہیں۔۔۔۔۔؟“ چاندنی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہم ختیوں سہیلیاں ہیں۔۔۔۔۔ بچپن کی سہیلیاں اور ایک دوسرے کو نگہ بہنوں سے بھی بڑھ کر چاہتی ہیں۔“ گلابی لباس والی بولی۔

”میرا نام شیلہ ہے، یہ جو براؤن لباس میں ملبوس ہے اس کا نام مونا ہے، یہ تیسری ستارہ ہے۔۔۔۔۔“

”آپ کا نام کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”میرا نام چاندنی ہے۔“ چاندنی نے بتایا۔

”آپ کا نام جس نے بھی رکھا بالکل صحیح رکھا ہے۔“ شیلہ نے اس کے چہرے پر جھک کر چوم لیا۔

”آپ چودھویں کا چاند ہیں ایسا لگتا ہے کہ بنانے والے نے آپ کو فرمت میں بنایا ہے۔۔۔۔۔“

”میری اتنی تعریف نہ کریں۔“ چاندنی مسکرائی۔

”میں اس وقت کہاں ہوں۔۔۔۔۔؟“

”آپ میرے ہاں ہیں۔۔۔۔۔“ شیلہ نے جواب دیا۔

”آپ کو اسپتال یا کسی کلینک لے جاتے تو پولیس سوالات سے ناک میں دم کرو جیتی اور رشوت

لگی مانتی۔۔۔۔۔ میری ایک دوست ڈاکٹر سرجن ہے اسے گھبرا کر دکھایا۔۔۔۔۔ اس نے کہا خطرے کی بات نہیں ہے سر میں اندرونی چوٹ آئی ہے دو ایک دن میں ہوش میں آ جائیں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ ایک بد نصیب گواہی محبت اور پیادیں گی۔۔۔۔۔؟“ چاندنی نے اداسی سے کہا۔

”آپ اور بد نصیب۔۔۔۔۔؟“ شیلہ نے حیرت سے پکلیں جھپکائیں۔

پھر چاندنی نے ان تینوں کو اعتماد میں لے کر اپنی حیرت انگیز اور درد بھری کہانی سنائی۔

☆ ☆ ☆

چاندنی نے اس شہر میں سکونت مستقل طور پر اختیار کر لی تھی۔

اس لئے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا تین برس قبل اس کے ماں باپ دنیا سے روٹھ گئے تھے، نہ بھائی تھا اور نہ ہی بہن، رشتہ دار بہت دور کے تھے، شیلہ نے راجو کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس نے کسی ماڈل گمرل سے شادی کر لی ہے۔ چاندنی کو بہت دکھ ہوا اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کا محبوب ہرجائی اور خود غرض لکھے گا۔

شیلہ، مونا، اور ستارہ اس کی مخلص اور بے حد چاہنے والی سہیلیاں بن گئیں ان کی محبت و دوستی اور رفاقت میں اس نے اپنے دل سے راجو کی محبت نکال دی اسے شہر میں شیلہ نے جو کمرہ کرایہ پر دلا یا تھا وہ اس کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھے اس مکان کے نچلے حصے میں دو میاں بیوی رہتے تھے وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے کرایہ پرانے نام ہی تھا کیونکہ چاندنی ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی اور ان کی اس طرح سے خدمت کرتی تھی جیسے وہ اس کے سنے ماں باپ ہوں اور وہ ان کی بیٹی ہو کھانا بھی وہی دیا کرتی تھی اور کپڑے دھوتی بھی تھی وہ بھی اپنی سگی بیٹی کی طرح چاہتے تھے پہلے وہ ہوٹل میں کچھ دن رہی تھی پھر اس مکان میں آ گئی تھی

اس نے جوبی کام کا امتحان دیا ہوا تھا اس کا نتیجہ آچکا تھا اس نے امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی۔

شیلہ نے اس کی مالی امداد کی بھی نتیجہ آنے تک وہ دو تین ٹیوشن کرتی رہی تھی۔ اب وہ ملازمت کر کے اپنی زندگی اور مستقبل بنانا چاہتی تھی شادی کر کے گھر بسانا چاہتی تھی۔ شادی کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ جائزے کی چاندنی تھی۔ لڑکے والوں کو لیکن دین اور جہیز کی بڑی ہوس ہوتی ہے، ماسٹر جی نے اسے برائے نام مکان کرایہ پر دے کر بڑا احسان کیا تھا کسی کسی مہینے وہ کسی نہ کسی بہانے سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ اس کی ذات پر انہوں نے جو احسان کیا تھا وہ آخری سانس تک نہیں بھول سکتی۔ وہ انہیں ماسٹر جی کہتی تھی۔ انہوں نے ایک اسکول میں تین برس پڑھایا ہوا تھا وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس کے پاس سونے کے زیورات، کپڑے، پہاڑے، اخراجات اور لڑکے کو جوڑے میں دہنے کے لئے رقم نہ ہو۔

چاندنی صبح دس بجے انٹرویو کے لئے گھر سے نکلی۔ وہ ریڈ اسکوٹر کی عمارت کے سامنے رکشے سے اتری اس میں منزل وسیع و عریض پر شکوہ اور عظیم الشان عمارت میں ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں دفاتر تھے۔ یہ عمارت جدید ترین تھی اس میں سبک رفتار متعدد لفٹیں تھیں جو ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ اس کا دب دہ ایسا تھا کہ چاندنی احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک عام سی لڑکی ہے کیا اسے اس فرم کے دفتر میں ملازمت مل جائے گی کوئی پیشگی ہے گوکہ اس نے اپنے صوبے میں امتحان میں ٹاپ کیا تھا لیکن اس کے پاس صرف اعلیٰ تعلیم کی سند ہی لیکن تجربہ کوئی نہیں تھا۔ اسے اس کی ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ تجربہ بہت ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر ملازمت کا ملنا ناممکن ہوتا ہے۔ یا پھر سفارش ہو لیکن وہ بہت اونچی۔۔۔۔۔ عام سفارش کی کام کی نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتنے لڑکے لڑکیاں اور عورتیں ملازمت کے لئے ماری ماری پھر رہی ہیں وہ

روز ہی اخبار دیکھتی اور ضرورت ہے کا اشتہار پڑھ کر درخواست بھیج دیا کرتی تھی اس نے ایک اخبار میں اس بلٹی فرم میں ضرورت ہے کا اشتہار دیکھ کر درخواست بھیج دی تھی اس کے باوجود اس میں لکھا ہوا تھا کہ کم از کم پانچ برس کا تجربہ ہو، جبکہ اسے پانچ گھنٹے کا بھی تجربہ نہ تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے کال کر لیا گیا تو اسے یقین نہیں آیا حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ انٹرویو لیٹر کو اس نے پچاس بار اس خیال سے پڑھا تھا کہ کہیں غلطی سے اس کے نام تو نہیں آگیا ہے؟ پھر وہ انٹرویو لیٹر لے کر شیلہ کے ہاں پہنچی۔

شیلہ نے اس کا انٹرویو لیٹر دیکھ کر کہا۔ ”چاندنی..... تو بڑی خوش نصیب ہے یہ تو ملٹی پٹیشنل فرم ہے اس کی شاخیں دہلی، سعودی عرب اور یورپ میں تک بکھیلی ہوئی ہیں اور اس کا ہیڈ آفس امریکہ میں ہے اگر تجھے اس فرم میں ملازمت مل گئی تو تجھے لے کر تیری زندگی خوشحال اور مستقبل تابنا کی بن گیا۔“

”لیکن مجھے اس کی کوئی امید نہیں..... میں نے اندھیرے میں میں تیر چلا دیا تھا، میں اتنا جانتی ہوں کہ خواب میں بھی اس فرم میں ملازمت ملنے سے رہی۔“

”تو کیوں مایوسی اور ناامید ہو رہی ہے؟“ شیلہ نے کہا۔

”اس لئے کہ میری پڑون کہہ رہی تھی جو ایک فرم میں جاب کرتی ہے..... کہ بغیر تجربے کے کسی طور میں بھی ملازمت نہیں ملتی..... اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں.....؟“ چاندنی رو ہنسی ہو گئی۔

”وہ سچ کہہ رہی تھی، اس نے غلط نہیں کہا۔“

”کیا میں انٹرویو بھانڈ کر پیچیدگ دوں.....؟“

”تم اپنا دل چھوٹا کیوں کر رہی ہو.....؟“ شیلہ نے دلا سہ دیا۔

”یہ مقدار کی بات ہوتی ہے.....؟ حوصلہ نہ ہارو چاندنی.....؟“

”مکمل کی کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جو برسوں سے ملازمت کی تلاش میں خوار ہو رہی ہیں۔ روزانہ کہیں نہ

کہیں انٹرویو دینے جاتی رہتی ہیں۔“

”سمن..... ان باتوں میں کیا رکھا ہے.....؟ اچھا یہ بتا کہ تو کس لباس اور وضع قطع میں انٹرویو دینے جا رہی ہے.....؟“

”میرے پاس جو لباس ہے وہی پہن کر جاؤں گی.....؟“ چاندنی نے جواب دیا۔

”کیا تیرا دماغ چل گیا ہے.....؟“ شیلہ سنجیدہ ہو گئی۔

”یہ بات کیوں بول رہی ہے کہ تو آیا کی ملازمت کے لئے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ فرم میں ملازمت کے لئے جا رہی ہے..... دفتر کا چہرہ ای تو تجھے اندر کھینے بھی نہیں دے گا..... کیا تو نہیں دیکھ رہی ہے کہ گھروں میں کام کرنے کے لئے جولاکیاں اور جوان سال معمر اور بوڑھی عورتیں کام کرنے جاتی ہیں وہ کیسے تنگ و چست لباس میں بیٹھتی ہیں۔“

”ارے مجھے دیکھنے کے لئے لڑکے والے تھوڑی آ رہے ہیں جو میں بن ٹھن کر جاؤں.....؟“ چاندنی ہنس پڑی۔

”ارے میں انٹرویو دینے جا رہی ہوں میری جان.....“

”حق کی اماں..... آج کل انٹرویو دینے کے لئے اس طرح جانا پڑتا ہے جس طرح لڑکے والوں کے سامنے ایک لڑکی بولڈ انداز سے جاتی ہے..... اس لئے کہ دنیا بہت آگے چلی گئی ہے اور بہت تیزی سے جا رہی ہے..... جو وقت کے ساتھ چلتا اور اس کے تقاضے پورے کرتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔“

”تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں.....“ چاندنی نے کہا۔

”بولڈ انداز سے وہ لڑکیاں جاتی ہیں جو مقابلہ حسن میں شرکت کرنے جاتی ہیں۔“

خیر چاندنی نے شیلہ کے مشورے پر عمل نہیں کیا تھا..... جب اس نے شیلہ کا دیا ہوا لباس پہن کر سنگار میز کے آئینے میں خود کو دیکھا تو اسے ایسا لگا تھا

کہ جیسے وہ بنا لباس کے ہے۔ اسے خود سے شرم آنے لگی۔ غسل خانے میں آزادی سے نہانا اور بات بھی اس لباس میں بیٹھنے سے نہانا دینے جانا اس کے لئے معیوب بات تھی۔ اسے اس بات پر بڑا ناچ تھا کہ شیلہ اس نامناسب لباس میں انٹرویو دینے کیسے چلی گئی تھی؟ اس نے سفید ساڑی اور آستینوں والا بلاؤز ہی پہنا وہ ہر طرح کا لباس پہنتی تھی لیکن اسے ساڑی والا لباس زیادہ پسند تھا، بالوں کا چھوٹا سا جوڑا بنایا اس نے نہ تو میک اپ کیا اور نہ ہی کوئی خوشبو لگا لی وہ بڑی سادگی سے تیار ہو کر دفتر پہنچ گئی تھی۔ شیلہ اسے اس عالم میں دیکھتی تو اپنا ماتھا پیٹ لیتی۔

استقبالیہ پر نو جوان عورت بیٹھی تھی اس نے حیرت اور ناقدانہ نظروں سے چاندنی کو اوپر سے نیچے تک اس طرح سے دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو..... وہ کہے باندھ سکی تھی۔

”کیا آپ اس معمولی سی جاب کے لئے آئی ہیں.....؟“

”جی ہاں.....“ چاندنی نے اپنا خوش نماسہ بلایا۔

”جاب تو جاب ہوتی ہے.....؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ معمولی یا بڑی ہو..... اگر یہ جاب مل گئی تو میرے لئے اس لئے خوش نصیبی ہوگی کہ یہ پہلی ہوگی؟“

”سوال یہ ہے کہ آپ کو دفتر میں جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے.....؟“ وہ عورت کہنے لگی۔

”آپ جیسی لڑکی کے لئے اس جاب کی کیا ضرورت اور اہمیت رہتی ہے۔ جو تنخواہ ملے گی اس سے شاید ہی آپ گزارہ کر سکیں؟“

”اس لئے کہ میں ایک ضرورت مند عورت ہوں..... جاب کر کے کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لوں گی اس لئے انٹرویو دینے آئی ہوں۔“

”آپ نہ صرف نہایت حسین و جمیل بلکہ غیر معمولی پرکشش ہیں میرا خالص مشورہ تو یہ ہے کہ جاب کرنے کی بجائے آپ شو بیز کی دنیا میں چلی جائیں دفتر

کی نوکری میں کیا رکھا ہے.....؟ آپ کو کسی فلم یا ڈرامہ سیریل میں چانس مل جائے گا تو دولت، عزت اور شہرت آپ کے قدم چوم لے گی۔“

لیکن مجھے فلم اور ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں ہے، میں دولت، عزت اور شہرت کے پیچھے بھاگنا بالکل میں پسند نہیں کرتی ہوں اس لئے میں نے کبھی بھولے سے بھی شو بیز کے بارے میں سوچا ہے۔“

وہ کس لئے.....؟“ عورت کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔

”اس لئے کہ شو بیز غلامت سے بھرا دلدل ہے۔

میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ وہی لڑکی فن کارہ بنتی ہے جو اپنا سب کچھ سوئپ دے اور اوپر سے نیچے تک ہر کسی کو خوش کرے.....؟“ چاندنی نے جواب دیا۔

”آپ تو دقیانوسی اور سو برس پہلے کی عورت کی طرح بات کر رہی ہیں..... اصل بات اور حقیقت یہ ہے کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے مجھے آپ کی کسی بات سے انکار اور اختلاف نہیں ہے..... عزت، آبرو اور عصمت کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے، اب ایسا دور ہے کہ ماں باپ یہ جانتے ہوئے بھی اپنی بیٹی، بہن اور بہو کو بھی اس نگری میں خوشی خوشی بھیج دیتے ہیں تاکہ دولت سے اپنے ارمان اور خواب پورے کر سکیں۔“

”دراصل ہر شخص کی سوچ مختلف ہوتی ہے اور اس کا مزاج بھی الگ ہوتا ہے۔ ویسے میں آپ کی بات پر سنجیدگی سے غور کروں گی آپ کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ ہیں۔“ چاندنی نے کہا۔

اس عورت نے چہرہ ای سے کہا کہ یہ مس انٹرویو دینے آئی ہیں پھر چہرہ اسی چاندنی کو اس کمرے میں لے گیا جس میں لڑکیاں اور عورتیں انٹرویو دینے کے لئے بیٹھی ہوئیں اپنی باری کی منتظر تھیں وہ بھی اس جاب کی امید دار تھیں انہوں نے حیرت، حسد و رشک اور ظلم سے چاندنی کو دیکھا ان امید داروں میں وہ واحد لڑکی تھی جو اس قدر سادگی سے آئی تھی۔ ورنہ ہر لڑکی عورت خوب

سرعام عاشق کی دھلائی

محبوبہ کی فرمائش پوری نہ کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہیں لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس غلطی کا ایسا بھیاں تک نتیجہ نکل سکتا ہے جو ایک مظلوم چینی نوجوان کو دیکھنا پڑ گیا۔ سوشل میڈیا پر حال ہی میں ویڈیو اپ لوٹ کی گئی ہے جس میں ایک لڑکی کو اپنے سامنے نوجوان پر ناقابل تصور ظلم کرتے دکھایا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ جوڑا ایک مارکیٹ میں پھولوں کی ریڑھی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ لڑکی نے پھل خریدنے کی فرمائش کی جسے لڑکے نے پوری کرنے سے انکار کر دیا جس پر لڑکی غصے میں آ گئی اور جھگڑنے لگی۔ اسی دوران کسی نے موبائل فون سے ویڈیو بنانا شروع کر دی، جس میں لڑکی کو غصے سے پھونکارتے سنا جاسکتا ہے ”تم پھل خرید رہے ہو یا نہیں؟“ جب لڑکی نے آخری بار یہ سوال کیا اور نوجوان نے پھر انکار کیا تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئی اور اپنی دائیں ٹانگ کو ہوا میں گھماتے ہوئے پوری قوت سے نوجوان کو کنگ مار دی۔ غصے سے بھری لڑکی کو اس پر بھی چین نہ آیا اور اس نے گرے ہوئے نوجوان پر لاتوں سے حملہ جاری رکھا جب کہ اس دوران وہ مسلسل چلاتی رہی ”تم پھل خرید رہے ہو یا نہیں؟“ بیچارے نوجوان کی حالت غیر ہوتے دیکھ کر پھل فروش اور دوسرے افراد نے زمین پر گرے ہوئے نوجوان کی جان بچائی۔ اس ویڈیو کو انٹرنیٹ پر ہزاروں بار دیکھا جا چکا ہے اور اکثر انٹرنیٹ صارفین تشدد کا نشانہ بننے والے نوجوان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کر رہے ہیں۔

(حسن علی - کراچی)

نہیں ہے جو ہمارے معیاری ہو۔ شاید اس لئے کہ ایسا لگا تھا کہ وہ انٹرویو دیتے نہیں بلکہ اپنے جسم کی نمائش کرنے کے نامناسب لباس میں آئی ہیں شاید اس بات نے مجھے غفلت کر دیا تھا پھر اس لڑکی کا انتخاب کرنے کا دل چاہنے کوئی تجربہ نہیں تھا میں نے اس لئے ترجیح دی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔“

”اس لڑکی نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو میرا دل رواں خوشی سے جھوم اٹھا اور وہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے دو دھیا چاندنی کا تھمدو دیا آ گیا ہو۔۔۔۔۔۔ میرے دل نے کہا کہ یہ لڑکی اہل ہو یا نہ ہو اسے رکھ لینا چاہئے، اگر وہ کچھ کج کی ناکن ہو تو وہی حال میرا ہوتا جو اسے دیکھتے ہی ہوا تھا۔“ امرت بیک نے کہا۔

”جچ پوچھیں تو اس ناکن چینی لڑکی نے ہم تینوں ہی کو ڈس لیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم تینوں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صرف اسے ملازمت پر رکھیں گے چاہے وہ اہل ہو یا نہیں۔۔۔۔۔۔ آ کاش نے کہا۔

”لیکن جاتے جاتے وہ جادو کر گئی۔“ ڈی ایس ملک نے کہا۔

”اس کے سونڈھی سونڈھی خوشبو سے ابھی تک کمرہ مہک رہا ہے اور دل و دماغ معطر ہو رہا ہے۔“

”لیکن ایک بات غور طلب اور فکر کی ہے۔“ امرت بیک نے کہا۔

”اس نے ہماری بات نہیں مانی اور ہمارے منصوبے پر عمل کرنے کو تیار نہ ہوئی تو وہ مقصد ہی بیکار ہو جائے گا جس کے لئے اسے رکھا جا رہا ہے۔“

”لیکن ہم غلت سے کام نہیں لیں گے۔۔۔۔۔۔ سیدھی باتی سے بھی نہیں ٹکٹا ہے تو کیا کیا جاتا ہے۔“ آ کاش نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

”اگر ہم نے غلت بازی کی تو پھر سب کچھ دھارہ جائے گا ہمیں یہ کام غیر محسوس انداز سے دھیرے دھیرے کرنا ہوگا۔ سکون وطمینان سے۔۔۔۔۔۔ جب وہ یہاں آئی گئی ہے تو جائے گی کہاں۔۔۔۔۔۔“

سے اتنی دیر کس لئے لیا گیا؟ جب وہ کمرے سے باہر آئی تو اسے ایسا لگا کہ اس کے سرے جیسے منوں بوجھ اتر گیا ہو اور اس کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے ہوں۔ جب وہ اس کمرے سے نکل کر استقبالیہ کمرے کی طرف جا رہی تھی تب اس نے اس دفتر کے کمروں اور اس ہاں کا بھی جائزہ لیا تھا جس میں بہت سارے وہ لڑکیاں عورتیں اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

چاندنی جیسے ہی اس کمرے سے نکلی تو آ کاش نے کہا۔

”کتنی سندر لڑکی تھی، یوں تو ہم آئے دن ایک سے ایک حسین لڑکیاں دیکھتے رہتے ہیں لیکن میں نے شاید ہی ایسی حسین لڑکیاں دیکھی ہیں اگر کوئی دیکھی ہے شاید ہی۔۔۔۔۔۔ وہ اتنی حسین ہے کہ باہر نکلتی ہے تو ہر مرد اسے بار بار لڑکے بھینٹ دیتا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ امرت بیک نے تائیدی لہجے میں کہا۔

”لیکن میں نے ایسی من موہنی لڑکی شاید ہی دیکھی ہو البتہ میں نے افریقہ، بنگال، ہندوستان اور آسام کے جنگلوں میں بہت ساری حسین لڑکیاں دیکھی ہیں کہ ان کا مقابلہ کوئی بھی حسین عورت نہیں کر سکتی لیکن اس لڑکی کے حسن کے آگے ان کا حسن بھی ماند پڑ جائے۔“

”کیسا عجیب و غریب اور حسین اتفاق ہے کہ ایک حسین ناگن ملکہ ناگنوں کی ملکہ انٹرویو دینے کے لئے دفتر میں کھس آئی ہم لوگوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک حسین ناگن سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔“ ڈی ایس ملک نے کہا۔

”ہمیں ایک ایسی حسین ناگن کی ضرورت تھی، ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہمیں بیٹھے بیٹھے ایک حسین ناگن مل گئی۔“

”میں تو ان تمام امیدوار لڑکیوں عورتوں سے باپوس ہو گیا تھا حالانکہ ان میں کئی برسوں کی تجربہ کار تھیں لیکن ایسا محسوس ہوتا رہا کہ ان میں سے ایک بھی ایسی

بن سنور کے اس طرح آئی ہوئی تھیں جس طرح شیا چاہتی تھی۔ ان کے لباس بھڑکیلے تھے جس نے انہیں بے حجاب کر دیا تھا۔ ان کے لباسوں سے خوشبو پھوٹ رہی تھی اور کمرے کی فضا مہک رہی تھی وہ چہرے مہرے اور منہ قطع سے اداکاراؤں کی طرح بولڈ دکھائی دیتی تھی۔ اپنے جسم اور نشیب و فراز کی نمائش کر رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے آخر میں آئی تھی وہ ناامید اور باپوس سی ہو گئی تھی اسے کامیابی کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔

انٹرویو لینے والے تین عہدیدار تھے شاید اس لئے کہ اس جاب کی نوعیت بہت اہم تھی۔ ان تینوں نے چونک کر چاندنی کو دیکھا جو انتہائی سادگی سے آئی تھی۔ لیکن اس غیر معمولی سادگی میں بھی اس کا بے مثال حسن و جمال جوا لکھی بنا ہوا تھا۔ اتنی جوا امیدوار آئی تھیں ان میں کوئی ایک بھی سادگی اور ایک گھریلو لڑکی کے انداز میں نہیں آئی تھی۔

چاندنی کمرے میں داخل ہونے کے بعد قدرے نرم اور پریشان سی ہو رہی تھی کمرہ انٹرکنٹیننٹ تھا اس کے باوجود وہ اپنی پیشانی عرق آلود اور سارے بدن میں پسینہ پھوٹا محسوس کر رہی تھی اس لئے بھی کہ وہ اپنی زندگی میں پہلا انٹرویو دے رہی تھی اس کمرے کا پروقار اور خواب ناک ماحول اور انٹرویو لینے والوں کی شخصیت نے اسے بہت مرحوب اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اس نے خود کو سنبھالنے میں بری کوشش اور جدوجہد کی تھی۔

اس نے ان تینوں مردوں نے کوئی بیس منٹ تک سوالات کئے جس کا وہ سنبھل سنبھل کر جواب دیتی رہی رفتہ رفتہ اس کا اعتماد بحال ہوتا گیا اور اس نے اپنی گھبراہٹ اور سر اسٹیک پر قابو بھی پالیا۔ اس نے ان کے ہر سوال کا جواب دیا اس نے دیکھا اور محسوس کیا اور پریشان سی ہوئی رہی تھی کہ جو لڑکی بھی انٹرویو دینے اندر گئی وہ پانچ سات منٹ میں باہر آ گئی تھی لیکن اس

”اسے پھاری میں بند کرنے کے لئے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔۔۔۔۔؟“ ایس ڈی ملک نے سرگوشی میں کہا۔

☆.....☆.....☆

چاندنی کو جو پہلی تھی وہ اس کی توقع کے برعکس بہت اچھی، بہت آسان اور ہر لحاظ سے شان دار تھی۔ سکون و اطمینان سے کام کرنے کی تھی اس کی تنخواہ جو بھی وہ بھی قدرے معقول تھی جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو فرم کے پاس آکاش نے اسے کمرے میں بلا کر دروازے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”تم اسے رکھ لو۔“

چاندنی نے حیرت سے اس لفافے کی طرف دیکھا کہ نہیں اس کی برطانی کا نوٹس تو نہیں ہے؟ اس کا ماتھا عرق آلود ہو گیا۔

”اس لفافے میں چار ہزار کی رقم ہے یہ تمہیں میری طرف سے بھی ہر ماہ تنخواہ ملا کرے گی۔“

”شکر یہ سر۔۔۔۔۔؟“ وہ اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر ممنونیت سے بولی۔

”کیا میں آپ کی طرف سے ملنے والی تنخواہ کی بابت کچھ دریافت کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟“

”میں اس رقم کی بابت تمہیں بتانے والا تھا۔ اس کے پاس نے کہا۔“

”ایک تنخواہ تمہیں فرم کی جانب سے اور دوسری تنخواہ میری طرف سے اسٹاف کو ملتی ہے تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا رہے۔“

”اگر کسی نے آپ کی طرف سے ملنے والی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو کیا بتاؤں۔۔۔۔۔؟“

”اول تو کوئی پوچھے گا نہیں کیونکہ یہ بھی کو اس کے متعلق علم ہے کسی نے پوچھا تو بتا سکتی ہو۔۔۔۔۔؟“

چاندنی نے چٹھی سے قبل شیلا کو اس کے دفتر فون کر دیا تھا کہ وہ اس کے دفتر کے باہر ملے پہلی تنخواہ ملنے کی خوشی میں وہ نہ صرف چائے پلائے کی بلکہ فلم بھی دکھائے گی اور پھر ڈنر پر جائیں گے۔

جب چاندنی اپنے دفتر کی عمارت سے نکلی تو شیلا اسے سڑکیوں پر مل گئی پھر دونوں چائے پینے قریبی رہسٹورنٹ میں جا بیٹھیں، چاندنی نے چائے اور سموسے کا آرڈر دیا پھر اس نے شیلا کو اس سے ملنے والی تنخواہ کے بارے میں بتایا۔

پاس سے ملنے والی تنخواہ کے بارے میں سن کر شیلا بڑے زور سے چوکی۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر فکر مندگی چھا گئی۔

”تو نے یہ بڑی عجیب بات بتائی۔۔۔۔۔؟“ شیلا کے لہجے میں تشویش تھی۔

”یہ واقعی بڑی عجیب و غریب سی بات ہے۔۔۔۔۔؟“ چاندنی نے سر ہلایا۔

”کیا تیرے دفتر میں بھی ایسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“ پاس الگ تنخواہ دیتا ہے۔۔۔۔۔؟ میں نے بھی کسی سے نہیں سنا اس تنخواہ کے متعلق؟ میرا دل لفافہ لینے کو نہیں چاہتا۔۔۔۔۔؟“

”مجھے تو دال میں کچھ کا لافظ آتا ہے۔۔۔۔۔؟“ شیلا نے شکوک لہجے میں کہا۔

”میرے دفتر میں ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی اور دفتر میں بھی ایسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟ میں تجھ سے کچھ پوچھوں گی تو کیا مجھے سچ سچ بتائے گی۔۔۔۔۔؟ مجھ سے کوئی بات چھپائے گی تو نہیں۔۔۔۔۔؟“

”میں نے تجھ سے بھی کوئی بات چھپائی ہے۔۔۔۔۔؟“ چاندنی بولی۔

”میں سچ سچ بتاؤں گی۔۔۔۔۔ تو نہ صرف میری عزیز سہیلی، خلیص اور حسن بھی ہے۔۔۔۔۔ تو کیا پوچھنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔؟“

اس وقت ویٹر چائے اور گرم گرم سموسے لے آیا تھا جب وہ رکھ کر چلا گیا تو شیلا نے پوچھا۔

”کوئی تین چار مرتبہ جاتی ہوں۔۔۔۔۔ پہلے ڈاک لے جاتی ہوں۔۔۔۔۔ پھر چائے بنا کر لے جاتی ہوں۔۔۔۔۔ ان کی سیکرٹری فائل یا خطوط دیتی ہے کہ دستخط کروا کے لاؤ تو چلی جاتی ہوں میں نے تجھے بتایا ہوا ہے کہ میں

پاس کی سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔“ چاندنی نے جواب دیا۔

”کیا بھی ایسا ہوا کہ انہوں نے تجھے کسی کام کے بہانے روک لیا ہو۔۔۔۔۔؟ غیر محسوس انداز سے تیرے حسن کی تعریف کی ہو، قربت سے فاصلے مٹانے کی کوشش کی ہو۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔۔؟“ چاندنی بولی۔

”پاس نے بھی کام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔؟“

”جب تو چائے بنا کر لے جاتی ہے تو پاس نے کہا کہ تو بھی ان کے ساتھ چائے پی لے؟ کیا تو نے بھی ان کے ساتھ چائے پی۔۔۔۔۔؟“

”حالانکہ میں اکیلی ہی چائے لے کر ان کے کمرے میں جاتی ہوں۔۔۔۔۔ پاس نے بھی بھی چائے پینے کے لئے نہیں کہا۔۔۔۔۔؟ لیکن جب سیکرٹری موجود ہوتی تو وہ ساتھ چائے پینے کے لئے کہتے۔“

”پاس کی سیکرٹری کیسی ہے؟ کیا وہ حسین اور جوان سال ہے یا پھر چالیس اور پچاس برس کی ہے؟ خراشت قسم کی ہے؟“

”وہ نہ صرف بے حد حسین ہے بلکہ پرکشش بھی ہے کہ جن سے اور غیر شادی شدہ اور اساتذہ بھی ہے اور عمدہ جامہ زیب بھی ہے اس کی عمر پچیس پچیس برس کی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے کہ پاس نے اس کے ساتھ دوستی اور تعلقات قائم کئے ہوئے ہوں عموماً دفاتر میں جو لڑکیاں عورتیں اپنے پاس کی پرائیویٹ سیکرٹری ہوتی ہیں ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھی جاتی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ پاس، ایم ڈی اور ڈائریکٹرز اور مینجیر وغیرہ جو اپنے لئے سیکرٹری رکھتے ہیں وہ حسین اور پرکشش اور نو جوان ہوتی ہیں وہ تیرے مقابلے میں حسین نہیں ہوگی پاس اپنا جال بچھا رہا ہوگا۔“

”اچھا یہ بتا کہ تیرے پاس نے کبھی تنہائی اور سیکرٹری کی غیر موجودگی میں تجھے سیر و تفریح اور کسی

فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لئے کہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”پاس کے سیکرٹری سے تعلقات نہیں ہیں اگر ہوتا تو اس کا علم ہو جاتا اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں رہتی ویسے پاس بہت شریف آدمی ہے اور اسٹاف اس کی بہت تعریف کرتا ہے سیکرٹری بھی کوئی تین برس سے کام کر رہی ہے وہ مزاج اور عادات اطوار کی سی بہت اچھی ہے اور یہی اس کے اچھے کردار کے معترف ہیں۔“ چاندنی نے کہا۔

”پاس نے بھی بھولے سے بھی دعوت نہیں دی اور نہ ہی منگلی اور مردوں کی ایسی گرسنہ نظروں سے دیکھا جو مرد سہ راہ لڑکیوں عورتوں کو دیکھتے ہی اس کے علاوہ دوسرے عہدیداروں نے بھی نہیں۔۔۔۔۔ ان کی کم زوری لڑکیاں ہوتیں تو شاید وہ میری طرف پیش قدمی ضرور کرتے۔“

”تو میری ایک بات اپنی گرہ میں باندھ لے کہ وہ اپنی شرافت کی آڑ میں تجھے اعتماد میں لے رہا ہے اور اسے غلت نہیں ہے کہ شکار کہاں بیچ کر جائے گا تیرا حسن بڑا خطرناک اور گھائل کر دینے والا ہے تو کسی ناگمن سے کم نہیں ہے وہ ایک دن موقع پا کر تجھے ناگ کی طرح ڈس سکتا ہے تو بھی اس بات سے واقف ہوگی ایک مرد کی فطرت ناگ کی طرح ہوتی ہے۔“

”میں دفتر جاتی ہوں تو ہر لمحہ بڑی محتاط، چوکنا اور ہوشیار رہتی ہوں کیونکہ اسٹاف کے مرد مجھے سے دوستی کرنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔“

”اچھا سن میری جان۔۔۔۔۔؟“ شیلا نے چائے سب کرتے ہوئے کہا۔

”سنیچر کے دن سہ پہر کے وقت میری سال گرہ ہے تو ضرور نا بہت اچھا گفٹ لانا۔“

”میرے خیال میں تمہارے لئے بہترین گفٹ میرا بوسہ ہوگا۔“ چاندنی نے شوخی سے کہا۔

☆.....☆.....☆

چاندنی اس کے لئے کوئی ایسا تحفہ خریدنا چاہتی تھی جو نہ صرف بہت خوب صورت بلکہ یادگار بھی ہو۔ اس

میں ایسی کوئی انفرادیت اور خصوصیت اور نادارین ہو کہ اس کی بے مثالی پر شیلا عیش عیش کراٹھے پھر وہ اس کی پسند اور انتخاب سے متاثر ہو کر داد دینے کے بہانے چوم لے تھخہ بھی بے پایاں محبت کا ثبوت ہوتا ہے۔

جمعرات کا دن تھا، شیلا کی سالگرہ میں ابھی دو دن باقی تھے آج چونکہ اس کے پاس وقت تھا اور فرصت میں تھی چونکہ کوئی کام نہ تھا اس لئے وہ گھر جانے کی بجائے رکشہ لے کر نوادرات کی طرف چل دی۔ وہ نوادرات کی اس دکان پر شیلا کے ساتھ کئی بار آچکی تھی اس دکان کی مالک ایک ادھیڑ عمر کی خوب صورت اور صحت مند عورت تھی وہ نہ صرف چاق و چوبند اور نرم خوش طبع اور نرم کھمبھی تھی اس کا نام کیا تھا وہ جانتی نہیں تھی لیکن اسے ہر کوئی آنٹی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اور وہ اس نام سے مشہور بھی تھی۔

چاندنی اس دکان میں داخل ہوئی تو اس وقت دکان میں کوئی گاہک نہ تھا آنٹی ایک میز پر بیٹھی موٹے رجسٹر میں کچھ اندراج کر رہی تھی اس نے چاندنی کو دیکھا تو دل کس اور ششامسکراہٹ سے استقبال کیا۔

چاندنی نے اسے آداب کر کے رکھی جملوں کے تبادلے کے بعد شیلا کے لئے تھخہ تلاش کرنے لگی۔ آنٹی نوادرات کے معاملے میں بڑی باذوق واقع ہوئی تھی وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ بلکہ نفاست پسند تھی وہ نوادرات کی خریداری کے لئے اندرون اور بیرون ملک بھی جاتی رہتی تھی اس کی دکان میں جو نوادرات تھیں شہر کی کسی بھی نوادرات کی دکان میں نہیں تھی۔ اس وقت وہ دکان میں اکیلی تھی اس کی سیز گرل کسی وجہ سے نہیں آئی تھی وہ دکان کے وسط میں کھڑی نگاہیں دوڑا کر سوچ رہی تھی کہ شیلا کے لئے کیا تھخہ خریدنا چاہئے۔ دکان کے ایک گوشے میں دنیا کے ہر ملک کی گڑیاں موجود تھیں۔

یہ گڑیاں نہ صرف ایک سے خوب صورت بلکہ بڑی پیاری پیاری تھیں جانے کیوں اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ شیلا کو کوئی گڑیا تھخے میں دے دے.....؟ گو یہ عمر گزرتے گزرتے کھیلنے کی نہیں تھی لیکن یہ گڑیاں ایسی تھیں کہ نہ صرف نوادرات میں بلکہ ڈیکوریشن

بچوں کے طور پر جانے سے کمرے کی رونق بڑھ سکتی تھی۔ تقریباً پچاس کے لگ بھگ گڑیاں تھیں ان میں عروسی لباس میں بھی تھیں یہ گڑیاں دنیا کے مختلف ممالک کی تھیں ان کی وضع قطع اور چہرے مہرے سے ظاہر ہوتا تھا محاسن کی نگاہ ایک مشرقی دکان پر جم کر رہ گئی یہ جو گڑیاں تھیں ہر قسم کی اور ہر سائز کی تھیں یہ گڑیاں جس نے بھی بنائی تھی اس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی پیکر تراشا گیا ہو کوئی بڑا اور عظیم فن کار لگتا تھا انتھک محنت اور توجہ سے بنایا ہوگا اس مشرقی دکان میں اتنی کشش اور جاذبیت تھی کہ وہ بے اختیار ٹھٹھک کے رک گئی۔

اس کے سارے جسم پر ایک ان جانے خوف کی لہر سنسنی بن کر پھیل گئی لمحے کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کوئی حسین ناگن ہے جو اس کی نظروں کے سامنے کھڑی اسے تنگ کر دے کہ وہ کبھی رہے ہو؟ یہ گڑیاں نہیں ہے؟ اس کی نظروں کو دھوکا ہوا ہے؟ وہ دیکھ رہا ہے دوسرے لمحے ہنس بڑی دکان میں جتنے بھی نوادرات تھے ان سب میں یہ دکان گڑیاں سب سے خوب صورت اور کی مہارانی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سا سرسار، خصوصیت اور انفرادیت تھی اور دکان میں جتنی گڑیاں تھیں اور جتنے بھی ایک سے ایک نوادرات تھے وہ اس گڑیا کے حسن کی تمکنت کے آگے ماند پڑ گئے تھے پھر اسے اس گڑیا نے کشاں کشاں اپنی طرف مٹھ لیا تھا۔

یہ دکان گڑیا کوئی بہت بڑی نہ تھی وہ سوائف لمبی اور آدھا فٹ چوڑی تھی اس کی بے حد سیاہ اور چمک دار اور بڑی بڑی آنکھیں اور سر میں کھینچی چمکیں کسی قصہ کہانی کی شہزادی کی طرح جادو بھری تھیں اور ان میں مقناطیسی کشش تھی اس کا چہرہ جس کے چمکے چمکے نقش و نگار سبک نواں ناک اور چھوٹا سا دہانہ ایسے محور کن تھے کہ وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے یہ گڑیا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے اس کی تھجڈ آنکھوں کی زبان اس سے کچھ کہے دے رہی ہیں پھر اس نے ایسا محسوس کیا کہ یہ پیاری اور سن موہن سی دکان گڑیا اس کی

سانسوں میں خراماں خراماں اتر کے اس کے من کی گہرائیوں میں اپنی جگہ بن رہی ہے۔

اس گڑیا میں جانے ایسا کچھ تھا کہ وہ اس کی اسیر ہو کر دنیا و مافیاء سے بے نیاز ہو گئی چند لمحوں تک اس پر طلسماتی سی کیفیت طاری رہی۔ وہ اسے خود فراموش کی حالت میں دیکھتی رہی۔

اس کے ذہن میں ایک آوارہ سا خیال کوندا بن کر لگا..... آنٹی ابھی تک رجسٹر پر جھکی ہوئی اندراج کرتی جاری تھی یہ گڑیا تمام گڑیاؤں سے ہٹ کر نمایاں جگہ رکھی ہوئی تھی پھر اس سے رہا نہیں گیا پھر اسے ہاتھ بڑھا کر اس چاندنی گڑیا کو اٹھایا پھر اسے دیوانہ وار چومنے لگی اس نے اپنے ہونٹ نہ صرف گڑیا کے رخساروں پر رکھ دیئے بلکہ اس کے ہونٹوں پر بھی ثبت کر گئی تھی اس ایک لمحے میں اس نے گڑیا کے بہت سارے بوسے لے ڈالے۔

اس نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اس گڑیا کے لمس ایک انوکھا اور لطیف احساس تھا حالانکہ وہ گوشت پوست کی نہ تھی لیکن اس کے سارے جسم میں حدت سی پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اس نے گڑیا کو واپس اسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔

پھر وہ دوسری نوادرات کو دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اور نوادرات پسند آجائے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ گڑیا اس کی ساری توجہ اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی گڑیا کی آنکھیں اسے اس طرح دیکھے جاری تھی جیسے وہ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہستی ہو۔ اس کی نظر میں اس کے وجود میں ہیوست ہوئی جاری تھی اسے لگا یہ گڑیا جیسے اس سے کہہ رہی ہو۔

”مجھے خرید لو..... اپنی آغوش میں لے لو..... میں تمہاری ہوں..... صرف تمہاری..... اور تم میری ہو.....“

چاندنی نے دل میں سوچا کیا اسے اس گڑیا کو خرید لینا چاہئے؟ معلوم نہیں آئی اس کی کیا قیمت مٹائے گی؟ اس کی جیب اجازت دے گی؟ اگر وہ اس

گڑیا کو کسی نہ کسی طرح خرید لیتی ہے تو کیا شیلا کو تھخہ میں دے دے؟ نہیں..... وہ شیلا کو یہ گڑیا تھخے میں نہیں دے گی؟ کوئی اور چیز دے دے کی کیونکہ اسے اپنے کمرے میں ایک ڈیکوریشن بچوں کی طرح رکھے گی بچپن میں گڑیوں سے بہت کھلتی تھی بہت سارے لوگ اور شہ دار اسے گڑیا کہتے تھے۔

اس نے پھر سے دکان میں رکھے اور سجے ہوئے نوادرات دیکھے لیکن ان میں ایک نوادری ایسا نہیں تھا جو اس گڑیا پر بھاری ہو اور بھی جو گڑیاں تھیں ان میں کسی میں ایسا حسن اور دل کشی نہیں پائی تھی وہ اس گڑیا کے سامنے ماند پڑ رہی تھیں۔

نہ جانے اس گڑیا پر اسے اس قدر اور بے ساختہ پیار آیا کہ گڑیا کو اٹھا کر بے تحاشہ چوم لیا۔ اس کی یہ حرکت عجیب اور انہونی تھی جیسی اگر آنٹی دیکھ لیتی تو وہ نچائے کیا سوچتیں؟ یہ کیا پاگل پن تھا..... حالانکہ اور بھی جو گڑیاں تھیں وہ بھی بہت حسین اور پیاری پیاری سی تھیں اسے صرف اس گڑیا پر اتنا پیار کیوں آیا؟

پھر اس نے اس گڑیا کو ہر قیمت پر خریدنے کا فیصلہ کر لیا پھر وہ میز کے پاس جا کر کرسی مٹھ کر بیٹھ گئی چند لمحوں کے بعد آنٹی نے رجسٹر بند کر کے ایک طرف رکھا اور مسکرا کے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی اور اپنائیت کے لہجے میں پوچھا۔

”کیا تمہیں کوئی چیز پسند آئی.....؟“

”ہاں.....“ چاندنی نے اثنائی انداز میں سر ہلادیا۔ پھر اس نے اپنی پسند کی ہوئی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ گڑیا مجھے بے حد پسند آئی ہے.....“

”اچھا.....“ آنٹی نے اس گڑیا کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

”تم نے بڑا اچھا انتخاب کیا ہے.....“

”میں نے اپنی زندگی میں اتنی شان دار اور خوب صورت گڑیا نہیں دیکھی؟ کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ یہ گڑیا آپ نے کس سے خریدی ہے؟ کہاں سے

خریدی۔“
”یہ گڑیا میں نے کسی سے نہیں خریدی بلکہ عجیب
وغریب اور پراسرار حالت میں ملی ہے۔“ آنٹی نے
جواب دیا۔

”جی.....“ چاندنی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔
”اتنی خوب صورت اور پیاری گڑیا کیسے اور کہاں
سے مل گئی؟ آپ بچ کھد رہی ہیں؟“
”میں بچ کھد رہی ہوں.....“ آنٹی کہنے لگی۔

”مجھے یہ گڑیا ایک مکان سے ملی ہے..... یہ عجیب
وغریب اور پراسرار اور ناقابل یقین بات ہے میں جب
بھی اس گڑیا کو دیکھتی ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا ہے میں
نوادرات کی خریداری کے لئے اندرون ملک بھی جاتی
رہتی ہوں مجھے کسی نے بتایا ایک پراسرار خوف ناک
مگر سرسبز وادی رام گرجو یہاں سے سو میل کے فاصلے پر
ہے دس برس پہلے طوفان کے باعث اجڑ گئی بہت سے
اس طوفان کی نذر ہو گئے پھر وہاں سانپوں، ناگوں اور
بدروحوں کا بسیرا ہوا تو آبادی ویران اور خالی ہو گئی
۔ وہاں اس وقت نوادرات کا ایک خزانہ موجود تھا میں
چونکہ تو ہم پرست نہیں ہوں اس لئے تجس اور نوادرات
کے حصول کے لئے چلی گئی وہاں جانے کے لئے
میں نے ایک موٹر بوٹ کرائے پر حاصل کی اس لئے کہ
یہ شارت کٹ تھا خشکی سے دو سو میل پر واقع ہے موٹر بوڈ
چلاتے وقت مجھے پچھتاوا سا ہوا کہ میں کیوں اس
پراسرار خوف ناک اور آسیب زدہ وادی کی طرف جارہی
ہوں ان دس برسوں میں ناگوں، سانپوں، بدروحوں
اور درندوں کا اضافہ ہو گیا ہوگا۔ وہاں محل نما حویلی تھی
اس میں ایک جاگیر دار تھا جس کی دس بیویاں تھیں
اور اولاد کوئی نہ تھی اس نے جس لڑکی سے بھی شادی کی وہ
اپنے ساتھ بے پناہ جہیز لائی تھی وہ جو طوفان آیا تھا
زہریلا تھا اس کی زہریلی ہوانے وہاں کی نہ صرف
ساری آبادی بلکہ جاگیر دار اور اس کی بیویوں کو بھی
ہلاک کر دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس طوفان نے جو ہلاکت خیزی

کی تھی اس کے بارے میں سن کر شاید موت کے خوف
سے کوئی نہ گیا ہوگا، میں نے تمام اندیشے خوف اور
دوسوے دل سے نکال دیئے پھر ہمت اور حوصلہ کر کے
اس وادی میں پہنچ گئی یہ وادی نہ صرف بڑی پراسرار
، خوف ناک بلکہ آسپیی کی بھی اور ہر طرف خشونت، ویرانی
اور ویران برس رہی تھی آبادی اجڑی پڑی تھی بہت
سارے مکانات منہدم ہو کر ملبہ کے ڈھیر بنے ہوئے
تھے ایک ان جانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

وہ حویلی جو کہ محل نما تھی اب بھی اس کی پر شکوہ
حالت اور شان شوکت اور دبہ برقرار تھا میں دھڑکتے
دل سے حویلی کے اندر کھس گئی زیریں حصے کے تمام
کمرے خواب گاہیں وہاں باورچی خانہ اور دیوان ویران
اور خالی تھے ان کا فرنیچر تباہ حالت میں تھا الماریاں بھی
خالی تھیں ان کی دراز میں جو شاندار ملبوسات تھے انہیں
دیکھ کر کھانسی گئی ان میں کوئی زور نہ تھا۔

پھر میں حویلی کی پہلی منزل پر گئی تو میرا سینہ ایک
ان جانے خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے کسی
نا دیدہ ہستی نے مجھے بری طرح دیوچ کر من مانیوں کی
ہوں..... سانس تھیں کہ بے ترتیب ہو رہی تھیں اس
لئے کہ بدروحوں کے سائے ہر جگہ دھس کرتے محسوس
ہو رہے تھے۔

پھر میں ایک خواب گاہ میں داخل ہو کر ٹھٹھک کے
رک گئی اس کمرے میں ایک عراب میں یہ گڑیا نظر آئی
جو زرق برق عروسی لباس میں تھی وہ ایک بڑی سرخ
اور سفید میں لپٹی ہوئی تھی وہ بڑے دل کش انداز سے
مسکرا رہی تھی مجھے ایسا لگا کہ یہ جیتتی جاگتی گڑیا ہے اتنی
خوب صورت، پیاری اور اونچی گڑیا جسے ابھی ابھی اسے
یہاں شادی کے لئے لائی گئی ہو اگر میں تو ہم پرست
ہوتی تو یہ بھیجی کہ کسی بدروح نے یہ بہرہ روپ بھرا ہو۔ میں
نے ایسی سندر گڑیا بھی اپنی زندگی میں کیا سنے میں بھی
نہیں دیکھی۔ میں لپک کر اس کے پاس گئی کہ اپنا وہم
اور ٹھٹھک و شبہ دور کروں قریب پہنچ کر اسے ہاتھ لگایا وہ
کوئی بدروح ہوتی تو اس کا جسم دھواں دھواں ہوتا اور بس

محسوس نہ ہوتا۔ وہ پلاسٹک کی تھی اور اس کا سارا بدن اس
کے عروسی لباس اور سرخ اور سفید میں ملیں تھا۔

اس کی خوب صورت اور اس کی جادو بھری
آنکھوں نے مجھے مبہوت سا کر دیا۔ میں جانے کتنے
لمحوں تک اسے خود فراموش اور جوییت دیکھتی رہی اور دنیا
و مافیا سے بے نیاز ہو گئی میں بھی اس کی آنکھوں کی
گرفت میں تھی وہ زندہ گڑیا لگ رہی تھی اور زندہ ہی لگتی
بھی تھی جس نے بھی اسے بنایا بڑی عرق ریزی سے
..... اس کی مہارت اور کمال کی داوند دینا بد ذوقی تھی۔

اس کمرے میں اس گڑیا کے علاوہ کوئی اور شے
نہیں تھی مجھے اس نوادر کو دیکھ کر کسی اور نوادر کی تلاش کی
فکر اور جستجو نہیں ہوئی اس لئے میرا اندازہ اور خیال تھا کہ
اس حویلی میں کیا اس وادی کے کسی مکان میں بھی کوئی
نوادر نہیں ملے گا، کیونکہ یہ وادی آسیب گیری بن چکی ہے
اب اس گڑیا کو لے کر واپس چلو..... اس کی ایسی منہ
مانگی قیمت ملے گی کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔

میں نے اس گڑیا کو اس طرح سے اٹھایا جیسے ایک
اشمول، نایاب اور بے حد قیمتی نوادر ہے۔

پھر میں دروازے کی طرف بڑھی، میں نے
دو قدم بھی طے نہیں کئے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا
جو میں نے کسی وجہ سے بند کیا تھا ایسا لگا جیسے کوئی دروازہ
کھول کر اندر آ رہا ہے۔ میرے سارے جسم پر سنسنی کی
لہر دوڑ گئی میں ایک دم سے ٹھٹھک کے رک گئی یہ کون
ہو سکتا ہے؟

میرے دل کے کسی کونے میں ایک انجانے خوف
کی ہر آنکھ جس نے مجھے بری طرح دہلا دیا۔

شاید اس وادی میں کوئی شخص رہ رہا ہوگا؟ اس نے
شاید مجھے دیکھ لیا ہے؟ اگر اس نے مجھے دیوچ کر قابو میں
کر لیا اور میں اس کے ہاتھ میں بے بس ہو گئی تو.....
میرے پاس مزاحمت اور دفاع کے لئے کوئی ہتھیار بھی
تو نہیں ہے اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوا تو اس کے
رحم و کرم پر ہو جاؤں گی اس کی ہر بات ماننا پڑے گی وہ
من مانیوں اور درست درازیاں بھی کرے گا۔

میں یہ سوچ کر لرز رہی تھی کہ دروازہ ایک دھماکے
سے کھلا چارنا نکلیں پھنکارتی ہوئی کمرے میں کھس
آئیں اور وسط میں کھڑی ہو کر مجھے شعلہ پارنگا ہوں سے
کھورنے لگیں وہ خطرناک زہریلی بھی تھیں انہیں غضب
ناک دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی میرے ہاتھ پر برف
کی طرح نہ ہونے لگے مجھے ایسا لگا کہ میری موت میری
نظروں کے سامنے کھڑی ہوئی ناچ رہی ہے..... میں
ساکت و جامدی ہو گئی تھی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟
میرے فرائد کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں کوئی
کھڑکی ایسی نہیں تھی کہ اس سے نکل سکوں کیونکہ اس میں
اتنی مضبوط اور قریب قریب سلاخیں لگی ہوئی تھیں ایک ملی
کا پچہ بھی نہیں نکل سکتا تھا کمرے سے نکلنے کے سوا کوئی
راستہ نہیں تھا ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ناگہیں بیک وقت مجھ
پر ٹوٹ پڑیں گی اور پل بھر میں ڈس لیں گی میرے
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صلب ہو چکی تھی ان سے بچ
کر نکلنے کی کوئی تدبیر اور صورت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

پھر اچانک ایک تدبیر میرے ذہن میں کوندان بن
کر لپکی۔

میں نے سنا ہوا تھا کہ سانپ، ناگن اور ناگ کے
منہ پر کپڑا ڈال دیا جائے تو وہ اندھے ہو کر بے بس
ہو جاتے ہیں۔ لہذا میں نے سوچا کہ اپنے کپڑے نکال
کر ان کے منہ پر ڈال دوں اس وقت بھی میں ساڑی
میں ملبوس تھی میں ساڑی ہی پہنتی ہوں اس وقت تم بھی
دیکھ رہی ہو کہ میں ساڑی میں ہی ملبوس ہوں اور یہ لباس
مجھے ہمیشہ سے ہی پسند رہا ہے وہ چاروں ایک ساتھ
صف کی صورت میں کھڑی ہوئی تھیں میں نے سوچا کہ
ان پر ڈال دوں پھر میں فوراً ہی کمرے سے نکل جاؤں
اور باہر سے دروازہ بند کر کے کنڈلی لگا دوں میں کسی
قیمت پر گڑیا سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھی۔

یہ صورت حال بڑی سنگین اور گھمبیر تھی میری سمجھ
میں نہیں آیا تھا میں نے سوچا کہ پہلے تو اس کمرے سے
نکلوں جان بہت پیاری ہوتی ہے بعد میں کسی نہ کسی

کال گرل



”مسٹر اسٹیفن! آپ کو صرف اس لئے چھوڑ رہی ہوں کہ آپ بھی میری طرح سچائی پسند ہیں اور فلاحی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، ورنہ ناب تک 56 لوگوں کو اپنا شکار بنا چکی ہوں۔“

جنگل کے پتوں پچنی پچنی سڑک پر میری کار گولی کی سی رفتار سے چل رہی تھی میں کسی ضروری کام سے میکسیکوٹی جا رہا تھا جہاں کچھ برنس کے معاملات ٹھانے تھے میرا نام مائیکل ہے اور میں شادی شدہ ہوں، میں ایک برنس مین ہوں، میرا کاروبار امریکہ کے مختلف شہروں میں پھیلا ہوا ہے میں والدین کا اکلوتا وارث ہوں اور ان کے گزر جانے کے بعد سارے کاروبار کا بھی اکلوتا وارث ہو گیا اور شادی کر کے ایک طوفانی زندگی جی رہا ہوں میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں مھوٹ سے سخت نفرت ہے اور ایمانداری سے برنس چلانے کا قائل ہوں شراب و شباب سے دور رہتا ہوں

ایسا بھی نہیں کہ کبجوں ہوں دل کھول کر خرچ کرتا ہوں اور غریب و نادار لوگوں کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں فلاحی کاموں سے مجھے سکون حاصل ہوتا ہے گولی کی رفتار سے چلنے والی میری کار اچانک ایک سنسان سڑک پر رک گئی۔

”اوہ شیٹ! اب اسے کیا ہو گیا آج رات مجھے میکسیکوٹی ہر حال میں پہنچنا ہے ورنہ وہ برنس ڈیل کینسل ہو جائے گی اور مجھے لاکھوں ڈالرز کا نقصان ہوگا۔“ کار کا بونٹ کھولا انجن کافی گرم ہو گیا تھا جبکہ پانی کا کین بھی خالی تھا لگتا ہے اسے پانی کی ضرورت ہے میں نے گھڑی پر ناٹم دیکھا شام کے 6 بج رہے تھے آس

میں نے پلوہ شانے اور سینے سے ہٹایا گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلوہ سینے اور شانے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ فائدے اور راسخہ تھی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، ناگ اور انکس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں۔ ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ بھر سکتی تھیں۔

میں چاروں ستوں کو تاحد نگاہ دیکھتی ہوئی دریا کی طرف جا رہی تھی مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا میرے قدم منوں بھاری ہو رہے تھے ایک ایک قدم میلوں کی مسافت بننا جا رہا تھا حالانکہ موسم خوش گوار تھا ہوا میں خشکی تھی اس کے باوجود میرا ماتھا عرق آلود تھا اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے پلوہ شانے اور سینے سے ہٹایا گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلوہ سینے اور شانے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ فائدے اور راسخہ تھی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، ناگ اور انکس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں۔ ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ بھر سکتی تھیں۔

میں چاروں ستوں کو تاحد نگاہ دیکھتی ہوئی دریا کی طرف جا رہی تھی مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا میرے قدم منوں بھاری ہو رہے تھے ایک ایک قدم میلوں کی مسافت بننا جا رہا تھا حالانکہ موسم خوش گوار تھا ہوا میں خشکی تھی اس کے باوجود میرا ماتھا عرق آلود تھا اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے پلوہ شانے اور سینے سے ہٹایا گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلوہ سینے اور شانے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ فائدے اور راسخہ تھی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، ناگ اور انکس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں۔ ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ بھر سکتی تھیں۔

میں چاروں ستوں کو تاحد نگاہ دیکھتی ہوئی دریا کی طرف جا رہی تھی مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا میرے قدم منوں بھاری ہو رہے تھے ایک ایک قدم میلوں کی مسافت بننا جا رہا تھا حالانکہ موسم خوش گوار تھا ہوا میں خشکی تھی اس کے باوجود میرا ماتھا عرق آلود تھا اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے پلوہ شانے اور سینے سے ہٹایا گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلوہ سینے اور شانے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ فائدے اور راسخہ تھی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، ناگ اور انکس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں۔ ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ بھر سکتی تھیں۔

میں چاروں ستوں کو تاحد نگاہ دیکھتی ہوئی دریا کی طرف جا رہی تھی مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا میرے قدم منوں بھاری ہو رہے تھے ایک ایک قدم میلوں کی مسافت بننا جا رہا تھا حالانکہ موسم خوش گوار تھا ہوا میں خشکی تھی اس کے باوجود میرا ماتھا عرق آلود تھا اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے پلوہ شانے اور سینے سے ہٹایا گڑیا کو بلاؤز کے درمیان رکھ کر پلوہ سینے اور شانے پر لے جا کر اس کا کونا کمر میں اڑس لیا اس طرح گڑیا نظر نہیں آتی تھی، میں گڑیا کو یہاں سے ہر قیمت پر لے جانا چاہتی تھی اس لئے بھی کہ یہ میرے لئے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

میں حدودِ فائدے اور راسخہ تھی اور سینہ تھا کہ اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں پھر ان ناگوں سے واسطہ نہ پڑ جائے میں نے سنا ہوا تھا کہ جس طرح سانپ، ناگ اور انکس انسان کی خون کی پیاسی ہوتی ہیں یہ بدروجن ہیں۔ ایک طرح سے یہ بدروجن چڑیل ہیں ہوتی تھیں جو ہر جاندار کا بہرہ بھر سکتی تھیں۔

میں چاروں ستوں کو تاحد نگاہ دیکھتی ہوئی دریا کی طرف جا رہی تھی مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا میرے قدم منوں بھاری ہو رہے تھے ایک ایک قدم میلوں کی مسافت بننا جا رہا تھا حالانکہ موسم خوش گوار تھا ہوا میں خشکی تھی اس کے باوجود میرا ماتھا عرق آلود تھا اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

سکون کا خوب صورت فرش

انسان کی تخلیقی صلاحیتیں کسی بھی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں، اور اکثر چھوٹی اور بظاہر کسی ایک مقصد یا بے مقصد نظر آنے والی چیزوں کو بھی انسان اس تخلیقی انداز سے استعمال میں لاتا ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ امریکی سائنس دان سینٹ یا پتینی جو ملک بھر میں سب سے کم قیمت کا حامل ہوتا ہے کوئی اسے پرانے فرش کو نئے میں تبدیل کرنے کے لیے بھی کام میں لے سکتا ہے، ایسا شاید کسی نے نہیں سوچا ہوگا۔ امریکی ریاست اوریگون کے شہر پورٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والی ٹونیا ٹورنز نے اپنے گھر کے پرانے فرش کو اپنی تخلیق کے ذریعے نئی اور خوبصورت شکل دینے کے لیے 13 ہزار سے زائد سکے استعمال کیے۔ بتایا گیا ہے کہ ٹونیا ٹورنز نے اس کے لیے بینک سے 50 ڈالرز کے پیئرز سے بھرے ہوئے تین بیگ لیے، ساتھ ہی انھیں فرش پر چپکانے کے لیے گوند، وڈ فلر، گراؤٹ اور کچھ مہنگی ایپوکی (خاص قسم کی گوند) کا استعمال کیا۔ انھیں یہ پروجنکٹ مکمل کرنے میں چند ماہ لگے۔ ٹونیا ٹورنز کا کہنا تھا کہ اس کام کے آغاز سے قبل ان کے ذہن میں کوئی خاص ڈیزائن نہیں تھا، جس کے باعث انھوں نے فرش کی، ہیرے کی شکل کے ڈیزائن میں آرائش شروع کر دی اور کچھ مہینوں کی محنت کے بعد خوب صورت فرش تیار کر لیا۔

(راحت علی عباسی - کراچی)

انسان سنان سڑک اور میں اکیلا اور یہ جنگل کیا خوب تھا کافی دیر تک وہ خوف ناک سوچ چلا رہا۔ اب میں بور ہو رہا تھا چھیل چھیل کیا ارے یہ کیا کتنا میں اتفاق تھا وہاں پر بھی وہی گانا چل رہا تھا بھرتیرا بدل عجیب بات ہے یہ سارے چیزوں پر آج ایک سوگ؟ میری حیرت کی انتہا ہو گئی آخر تک آ کر میں رہ پڑا ہند کر دیا۔

میں شروع سے ہی بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا تھا میں اپنی بیوی کو بولتا تھا کہ یہ جن بھوت تو صرف گھروں میں ہوتے ہیں اچانک ایک بھیڑیا کار کے سامنے آ گیا میں نے بریک پر پاؤں مارا لیکن تب تک گار سے اس کی ٹکر ہو چکی تھی۔

”اوہ.....“ میں نے گاڑی کو بریک لگا کر دوڑا دیا لیکن مجھے اس کی لاش نہیں بھی دکھائی نہیں دی۔

”کہاں گیا ہے یہ؟“ مجھے دیر ہو رہی تھی میں نے دوبارہ کار اشارت کی، کافی عجیب بھیڑیا تھا شاید دی ہو کر بھاگ گیا ہو گا یہ سوچ کر میں خود کو تسلیاں دینے لگا ابھی تھوڑا ہی دور گیا ہوں گا کہ سامنے بچ سڑک پر ایک نوجوان عورت دکھائی دی اس نے لفٹ کا اشارہ کیا اس کے قریب کار روکی شیشہ نیچے کیا ایک بھروسہ میرے قریب آئی۔

”مجھے لفٹ مل سکتی ہے.....؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

”حیرت ہے رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو اور تم کون ہو؟“ وہ ذریعہ مسکرائی۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گی، میں ایک کال گرل ہوں کچھ امیر زادوں نے سستی کر کے مجھے یہاں بھیج دیا اور پیسے بھی نہیں دیئے۔“ مجھے بھی جھوٹ پسند نہیں تھا اس کی صاف گوئی کی وجہ سے میں نے اسے لفٹ دی وہ کار کی چھیل سیٹ پر بیٹھی کار دوبارہ اشارت کی طویل خاموشی کے بعد میں نے اسے پوچھا۔

”یہ کام شوقیہ یا مجبوری سے کرتی ہو.....؟“ اس نے پھر صاف گوئی سے کام لیا۔

اپنی کار ٹھیک ہوئی میں دیر نہیں کروں گا۔“ اس کے بول کر اس نے فون رکھ دیا میں نے دوسری کال ملائی میرا ایک ملکیک دوست تھا۔

”ہیلو اینڈر پو یار میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں گاڑی اشارت نہیں ہو رہی اور انجن کے لئے پانی بھی نہیں مل رہا، آپ میری کوئی ہیلپ کر سکتے ہو؟“ اس نے کہا کہ میں گاڑی کے پاس جا کر دوبارہ کال کر دوں مجھے کوئی طریقہ بتانے والا تھا۔ جس سے میں کار اشارت کر سکتا تھا لیکن نہ جانے میں کہاں اور کار کہاں تھی میں سنان سڑک پر اکیلا خوار ہو رہا تھا کافی دیر پیدل چلتا رہا لیکن لگتا ہے آج اس سڑک پر کسی بھی گاڑی نے نہ آنے کی قسم کھا کر بھی لفٹ کا آسرا بھی ختم ہو رہا تھا، میں نے اپنی بیوی کو کال ملائی۔

”ہیلو سوہنی کیا ہو رہا ہے؟ یار میری کار خراب ہو گئی ہے اور پچھلے کئی گھنٹوں سے میں یہاں دیرانے میں خوار ہو رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا کہ وہ اسے سی آن کر کے دی وی پرفٹ ہال بھیج دیکھ رہی ہے۔

”یار تم عورتیں بھی نا..... اب جتا چلا کہ پیسے کتنا کتنا مشکل کام ہے اور آپ عورتیں منٹوں میں شاہجہد میں ایسے اڑاتے ہو جیسے۔“ وہ میرا منہ چڑانے کے لئے اور زور سے ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی نے مجھے کافی حوصلہ دیا اور میں بھی ہنسا وہ رہی میری کار میں نے موبائل بند کر دیا اور کار کی خوشی میں چلا اٹھا، میں نے ملکیک دوست کو فون کیا اس نے مجھے کچھ ہدایات دیں، میں کار کے انجن پر جھکا ہوا تھا اور اس کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کر رہا تھا کچھ تاریں ادھر سے ادھر جوڑیں اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو اشارت کیا اور پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو گیا اب دوبارہ گولی کی سی اسپینڈ میں وہ چل رہی تھی عجیب بات ہے سڑک پر اب کچھ گاڑیاں نظر آرہی ہیں جب ضرورت تھی تب..... میں نے ریڈیو آن کیا کیسا محسوس گانا چل رہا تھا چھیل چھیل کیا اب وہاں کسی ہارمونی کا ڈراؤنا سوینگ چل رہا تھا جو اس وقت میرے حالات پر پرفیکٹ جج

پاس جنگل ہی جنگل تھا میں نے خالی کین اٹھایا اور پونہ ایک طرف کو چل پڑا کافی گھٹنا جنگل تھا جگہ جگہ جنگلی گھاس اور پتھر ملی زمین پر مشتمل یہ خطہ میرے لئے نیا تھا میں شہر کا رہنے والا تھا گاڑی بنگہ نوکر چاکر لیکن ایک مثبت بات یہ تھی کہ میں اپنا کام خود سرانجام دینے کی عادت رکھتا تھا کافی دیر تک مجھے کہیں بھی پانی دکھائی نہیں دیا مجبوری تھی پانی کے سوا انجن اشارت نہیں ہوگا اور مجھے دیر ہو رہی تھی شام کے سائے بڑھ رہے تھے دو گھنٹے میں پونہ چلتا رہا لیکن بے سود لگتا ہے میں رستہ بھٹک گیا تھا اور اب تو واپسی کا رستہ بھی کھو گیا تھا۔

”اوہ گاڈ! اب کیا کروں.....؟ اندھیرا پھیلنے سے پہلے مجھے کار تک پہنچنا چاہئے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پورا جنگل رات کی تاریکی میں ڈوب گیا، میں نے موبائل فون نکالا لیکن یہاں کوئی میٹ ورک نہیں چل رہا تھا بس اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اسکی ٹاریج آن کر کے روشنی کا انتظام ہو گیا، میں رستہ بھول گیا تھا میں نے کھڑی دیکھی رات کے فونج جگے تھے اب تو جنگلی چرند پرند اور حشرات کی آوازیں ہر طرف سے صاف سنائی دینے لگی تھیں اب تک میرے سامنے بھالو، ہرن، گیدڑ، جنگلی خرگوش چلتے پھرتے نظر آرہے تھے شاید جنگلی جانوروں کو آدم بومسوں ہو گئی تھی اس لئے وہ کثرت سے میرے گرد جمع ہو رہے تھے اور اب تو شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی دور کہیں سے سنائی دے رہی تھی لیکن مجھے ان کا خوف نہیں تھا مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں بزنس ڈیل نہ کینسل ہو جائے اور میں خالی ہاتھ ہی واپس گھر کا رستہ ناپوں۔ پونہ چلتے چلتے میں اسی مرکزی سڑک پر پہنچ گیا مجھے کافی اطمینان ہوا اور ساتھ ہی موبائل پر سٹکل بھی بحال ہونا شروع ہو گئے سب سے پہلے میں نے سیکسکو سٹی میں اپنے بزنس پارٹنر ”مسٹر وائن“ کو کال کی وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔

”دیکھو وائن..... میری کار خراب ہو گئی ہے اور میں رستہ بھول گیا ہوں آپ بس کچھ گھنٹوں کے لئے یہ بزنس میٹنگ موخر کر دیں۔“ جونہی مجھے کوئی لفٹ ملی یا

پاکیزہ محبت

مریم شاہ بخاری - سرگودھا



”بابا جان محبت کرنا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں ہم دونوں کا ملاپ ممکن نہیں پر اس کے باوجود میں اسے چاہتا ہوں کہ میں نے اس کی روح سے محبت کی ہے

نشی حیات اللہ اولاد کی نعمت سے محروم ہے اس کی بیوی باجرہ جو کہ اوجیز عمری کی جانب بڑھ رہی ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتی۔ ”خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔“ کے مقولے پر یقین رکھے ہر دروازے پر اولاد کی امید لئے دستک دیتی ہے ڈاکٹر ز کا کہنا ہے کہ ان میں کوئی خرابی نہیں بس خدا کی قدرت اور رحمت کا انتظار ہے جبکہ نشی حیات اللہ کی ماں دل پر صبر کی سل رکھ چکی ہے وہ باجرہ کو مایوسی سے دیکھتی اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتی ہے وہ نشی حیات اللہ سے کئی بار دوسری شادی کا کہہ چکی ہے مگر وہ صاف انکار کر چکا ہے آج بھی باجرہ مصلیٰ بچائے خدا کے حضور گڑ گڑاتے

پاکستان کا یہ ایک چھوٹا سا نواحی علاقہ ہے جہاں بی ہریالی اور قدرتی شادابی میں بے مثل ہے اس کے چار جانب کھیتوں اور لہلہائی فصلوں کی بہتات ہے جن کے بیچ میں کچی سرک ہے جو مختلف دیہاتوں کو اس علاقے سے ملاتی ہوئی گزرتی ہے۔ لوگ مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں کچی بستی کے علاوہ ہر جگہ کچے مکان اور رنگوں سے بھر پور کھنیاں اپنی بہار دکھلا رہی ہیں انہی مکانوں کے درمیان نشی حیات اللہ کا گھر ہے جو تین کمروں، باورچی خانے اور باتھ روم پر مشتمل ہے اس گھر میں حیات اللہ کے علاوہ اس کی بیوی باجرہ اور پورے ماں ریشداں رہتی ہے۔

دور بھاگتے ہو بس اسی عادت کی وجہ سے آج بچ گئے اور ہاں میں ایک روح ہوں جو آپ کی کار میں بھی غائب ہو سکتی ہوں۔“ کال کٹ گئی اور مجھے تھوڑی دیر پہلے اٹھنے والے سارے سوالوں کے جواب مل گئے۔ کار کا اسے ای آن تھا لیکن پھر بھی میرے پسینے چھوٹ رہے تھے یہ آج کی رات اتنی طویل کیوں ہوئی تھی میں زندگی میں اتنا نہیں تھکا ہوں گا جتنا آج کی رات، میری کیفیت بدل چکی تھی، میں خود کو کتنا پر فیکٹ اور اسٹرانگ سمجھتا تھا لیکن ایک آتما کے مشاہدے نے میری زندگی بدل ڈالی۔ میں نے ایک دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت پر سارے ریڈیو جوتلو پر ایک ہی گانا چلتا ہو؟ وہ پہلے تو خوب ہنسا اور آخر میں یہ کہہ کر فون رکھ دیا کہ۔ ”واٹ آ جوک۔“ بریس نے مذاق تو نہیں کیا تھا؟ بھیریا کون تھا؟ لڑکی کون تھی؟ ان سارے سوالوں کے جواب سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ جب آٹھ گھنٹی تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا وہاں میری بیوی کھڑی تھی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور مجھ سے چٹ گئی۔

”میں یہاں کیسے.....؟“ اس نے میرے بال سنو اتے ہوئے جواب دیا کل رات آپ کا ایکسینٹ ہو گیا تھا شر ہے آپ تو بچ گئے مگر“ میں حیرت سے۔

”مگر کیا.....؟“ وہ افسردہ لہجے میں۔ ”مگر جس گاڑی کی آپ کی کار سے مکر ہوئی تھی اس میں سوار ایک لڑکی اور اس کا پالتو بھیریا مارا گیا۔“ آپ اسپتال میں ہو مجھے یہ اطلاع آپ کے میکسیکو کے بزنس پارٹنر نے دی..... آپ ریشن کے بعد آپ قومہ میں چلے گئے تھے اور آج تھک چوٹیں گئے بعد آپ کو ہوش آیا ہے، لیکن شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔“ آج برسوں بعد بھی مجھے وہ رات نہیں بھولی اور شاید ہمیشہ یاد رہے لیکن کافی تحقیق کے بعد بھی مجھے کچھ سوالوں کے جوابات نہیں مل سکے۔

☆☆

”پہلے شوقیہ پھر مجبوری بن گئی۔ غلط کاری کی وجہ سے سب نے اکیلا چھوڑ دیا، میں نے والدین کا دل دکھایا تھا وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن مجھے شرافت راس نہیں آئی اور سب کے سمجھانے کے باوجود ایک امیر زادے کو اپنا سب کچھ سوپ دیا اور وہ دن اور آج کا دن روزے نئے امیر زادے.....“

میں غصے سے چلایا۔ ”تب ہی تو میں شراب اور لڑکیوں سے دور بھاگتا ہوں..... اپنے شوق کو مجبوری کا نام دے کر لوگوں کی ہمدردی طلب کرتی ہو۔“ دوبارہ طویل خاموشی کے بعد میں نے اس سے نام پوچھا؟ کوئی جواب نہیں ملا میں نے دوبارہ پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ لیکن پھر بھی جواب نہیں ملا تب میں نے غصے سے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو خوف و دہشت کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کیونکہ پیچھے کوئی نہیں تھا سیٹ خالی تھی۔ ”یہ نہیں ہو سکتا وہ آخر کہاں چلی گئی؟ گاڑی کے دروازے بھی لاک تھے تو پھر؟“ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”اوہ مائی گاڈ.....! کہیں وہ ڈائن تو نہیں تھی؟“ پہلے ریڈیو کے ہر چینل پر ایک ہی آہنی سونگ کا چلنا پھر بھیرے کا کار سے نکلنا اور پھر اس کا گرل نما ڈائن کا یوں غائب ہونا..... یہ سب کیا ہے.....؟“ اب میں نے جانا کہ جن بھوت اپنا وجود رکھتے ہیں اور اکیلے انسان کو ستاتے بھی ہیں میں نے کار کی اسپید اور بھی تیز کر دی تھی میں کافی دیر تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہا کہ چانک موبائل کی بیل پر چونکا۔

”ہیلو کون.....؟“ آواز آئی۔ ”مسٹر اسٹیفن! آپ کو صرف اس لئے چھوڑ رہی ہوں کہ آپ بھی میری طرح سچائی پسند ہیں اور فلاحی کاموں میں حصہ لیتے ہیں..... ورنہ اب تک 56 لوگوں کو اپنا شکار بنا چکی ہوں۔ میں کوئی کال گرل نہیں ہوں، البتہ اپنا شکار ڈھونڈنے کے لئے کال گرل کا گیت اب ضرور کرتی ہوں، میں صرف بدکار لوگوں کو اپنا شکار بناتی ہوں، تم شراب اور لڑکیوں سے

ہوئے دعا کر رہی تھی دعا مکمل کر کے اس نے جلدی سے مصلیٰ تہہ کر کے کمرے میں رکھا اور بچن میں چلی گئی وہ تیزی سے کام نبھاتے ہوئے باہر بھی جھانک لیتی جہاں شام کے سائے اترنے لگے تھے اس کی ساس اس کی بے چینی کو سمجھ رہی تھی ہاجرہ نے جلدی جلدی روٹیاں پکا کر ہاٹ ہاٹ میں رکھیں سارے برتن سمیٹ کر باہر نکل آئی اس کے ہاتھ میں ایک پوٹی تھی جسے اس نے اپنی بڑی سی چادر کے نیچے کر رکھا تھا ہاجرہ صحن میں چار پانی پر بھی ساس کی طرف چلی آئی۔

”اماں..... میں ذرا پیر سچا سرکار کے دربار پر جا رہی ہوں فشی کے آنے سے پہلے گھر لوٹ آؤں گی یہ نذرانہ دینے جا رہی ہوں اور بھی روٹیاں بھی آج جمعرات ہے ناں.....“ وہ آرام سے بولتی ہوئی ساس کو بڑی امید سے دیکھنے لگی رشیدان خاتون کے چہرے کے تاثرات کرخت ہو چکے تھے نہایت ضبط کے باوجود وہ جیسے پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

”بس کر ہاجرہ..... بس کر..... کب تک تو میرے بیٹے کی کمائی کو یونہی اڑاتی رہے گی۔ کیا دیا ہے پیر سچا سرکار نے تجھے ان دس سالوں میں.....“ ہاجرہ حق دق سی اپنی ساس کو بولتے ہوئے سن رہی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ آج ساس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔

”اماں ایسے نہیں بول.....“ وہ بے بسی آواز میں بولی۔

”تو کیسے بولوں..... ہاں..... ارے بی بی تو وہ خیر زین ہے جہاں سے کوئی کوئیل نہیں پھوٹنے والی..... خالی خولی خیر.....“ وہ رشیدان بی بی کے الفاظ پر تڑپ کے رہ گئی اس کے چہرے پر کرب سا پھیل گیا تھا۔ رشیدان بی بی کو بھی اپنے سخت رویے کا احساس ہو چکا تھا..... اس نے ہاجرہ کو دیکھا اور گہری سانس بھری۔

”اچھا تو جا.....“ آہستہ سے کہہ کے وہ چار پانی پر لیٹ گئی تھی ہاجرہ مے مے قدم اٹھاتی پیر سچا سرکار کے مزار کی طرف بڑھنے لگی..... آج اس کا دل سمجھ سا گیا تھا اگر وہ ابھی تک اولاد سے محروم ہے تو اس میں اس

کا کیا دوش..... یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں اور بھلا اس کی مرضی کے خلاف کوئی کیا کچھ کر سکتا ہے؟ وہ اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی دربار کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی اس نے ہاتھ میں پکڑی پوٹی دربار کے نگران کے سامنے رکھ دی جس نے فاتحہ پڑھ کر اسے واپسی تھمادی۔ وہ دھیرے سے قدم اٹھاتی دربار پر موجود اک درویش مست حالی کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”بابا یہ کھانا لے لو.....“ فقیر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں..... اور ہاجرہ کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے پوٹی تمام لی..... اس نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے تو اس درویش نے اسے پکارا۔

”سنو بیٹی.....“ وہ درویش کی پکار پر ہنسم گئی اور پلٹ کر ان کو دیکھنے لگی۔

”آزماش کا وقت ختم ہوا..... جاؤ خدا تمہاری مراد پوری کرے..... جاؤ پیر سچا سرکار کے قدموں میں بیٹھ کر درود کرو عواماگو..... آج فیض کا دریا جوش پر ہے..... تم بھی اپنا حصہ لے لو..... ضرور ملے گا..... جو بھی مانگو ملے گا..... ضرور ملے گا..... حق اللہ ہو..... وہ درویش خوشخبری سنا کر پھر اپنے حال میں مست ہو گیا۔

درویش کی بات نے ہاجرہ کے تن مردہ میں جیسے نئی روح پھونک دی تھی پیر سچا سرکار کے مزار پر سانکوں کی قطار بندھی تھی جو سب اپنی اپنی مرضی لئے حاضر ہوئے تھے وہ بھی صاحب مزار کے قدموں میں بیٹھ کے اپنا دعا پیش کرنے لگی..... اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں خود کو سنبھالتی وہ بے بس ہوئی جا رہی تھی، ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور تیر پر پڑے سرخ گلاب کو اڑا کر اس کی ہتھیلیوں پر رکھ گیا..... اس نے چونک کر اپنی ہتھیلیوں کے درمیان نئے پھول کو دیکھا تو اک سرشاری سی رگ وے میں دوڑ گئی وہ اٹھنے کے قدموں درویش کی جانب بھاگی گھبرا گئی ہی لمحے ٹھنک کر ٹھہر گئی۔ درویش اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے اس نے سارا دربار چھان مارا مگر وہ کہیں پر بھی نہ تھے..... وہ حیرت زدہ گھر کی جانب چل دی راستے میں درویش

کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ تب ہی ایک سرگوشی سی بلند ہوئی..... خوب صورت بیٹی کی آمد مبارک ہو..... آگے اس کے نصیب..... آگے اس کے نصیب..... دو دفعہ اس جملے کی تکرار کے بعد وہ آواز معدوم ہو گئی..... وہ جھٹکے سے پٹٹی مگر دور دور تک کسی ڈی روح کا نام و نشان نہ تھا..... آواز..... آواز کس کی تھی.....؟ وہ ابھی یہ تو میں نے سنی ہے..... تب ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا..... درویش بابا..... اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

چند ہفتوں بعد ہاجرہ کے دل کی کلی کھل اٹھی جب ڈاکٹر نے اس کے مکمل معائنے کے بعد اسے ماں بننے کی نوید سنائی..... فشی حیات اللہ تو خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا جبکہ رشیدان خاتون اور ہاجرہ نے خدا کے حضور شکرانے کے نفل ادا کئے تھے پھر جلدی ہی وہ وقت بھی آ گیا جس کا انہیں 25 برسوں سے انتظار تھا..... ہاجرہ نے قرعہ اپنال میں ایک بچی کو جنم دیا تھا..... بچی کی تسمیہ چاند کا کھڑا تھی..... جس نے بھی دیکھا خدا کی منائی پر انگشت بدندان رہ گیا..... ایک ننھی سی عورت جی جی آسان سے زمین پر اتر آئی..... ماں باپ و فقیروں کو خیرات لٹاتے ہوئے خوشی سے سرشار ”پیر سچا سرکار“ کی عظمت کے گمن گائے جا رہے تھے منت کی چادر اور نیاز کی دیکیں مزار پر پہنچاؤ گئی تھی فشی حیات اللہ نے اپنی بیٹی کا نام ”گل پری“ رکھا۔

گل پری نے قدم قدم چلنا سیکھا تو ماں باپ صدقے واری جانے لگے، اپنی تو مٹی زبان میں جب دادی کو پکارتی تو وہ جھٹ سے اس کی کشادہ پیشانی پر بوسہ دے ڈالتی..... بات بعد میں ہونٹوں سے نکلتی کہ جھٹ سے پوری ہو جاتی..... باپ کی انگلی تھا سہ جب وہ باہر نکلتی تو راہ چلتے لوگ کچھ دیر ٹھہر کر اس کو پیار کرتے..... جب مسکراتی تو گالوں میں پڑنے والے ہنور اسے اور بھی دلکش بنا دیتے..... لڑکپن سے نکل کر شہاب کی حدود میں قدم رکھا تو رعنائیوں میں وہ کھلتے ہوئے گلاب کی مانند مہک اٹھی، سرخ و سپید رنگت جیسے

کسی نے دودھ میں گلابی رنگ گھول دیا ہو، ہنسی ستواں ناک، ہنسنے ہوئے ابرو مکمل، سرخ یا تو قی ہونٹ، سفید موتیوں جیسے دانت ہنسنے لگی تھی تو اک روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی سیاہ غلابی چمکتی آنکھیں سرخی مائل سیاہ ملائم دراز زلفیں اور قیامت خیز چمکتی چال جدھر سے گزرتی من چلے دل تمام کر رہ جاتے..... جو بھی پہنتی ج جاتا..... میلے پکڑوں میں بھی آگن میں چاندنی سمیٹتی نظر آتی..... بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے..... حسن و لطافت کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق و کردار بھی لا جواب..... آواز میں سوز اور مردوں موجود..... محفل میلاد میں بعد شوق شرکت کرتی اور اپنی خوب صورت آواز میں ایک سحر ساداری کر دیتی۔

☆ ☆ ☆

ہاجرہ کو جواں سالہ خوب صورت بیٹی کا حسن پریشان کئے رکھتا تھا..... اس نے محسوس کیا تھا کہ ”گل پری“ کو ایک انخانی سی خوشبو اپنے حصار میں لئے رکھتی ہے حالانکہ وہ خوشبو استعمال نہیں کرتی تھی درویش بابا کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی..... وہ جلد سے جلد اس کا اچھا سا لڑکا دیکھ کر اسے رخصت کر دینا چاہتی تھی ساس کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ فشی حیات اللہ زمینوں کے پتھر میں الجھا رہا تھا وہ جب بھی اس سے گل پری کی شادی کی بات کرتی تو وہ ہنس پڑتا ارے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، مت لکریں پالو اس کی..... اللہ خیر کرے گا..... الغرض فشی حیات اللہ کے آگن کا یہ پھول ہر فکر سے آزاد پروان چڑھ رہا تھا۔

”اماں..... چلو ناں مزار پر حاضری دینے چلیں..... آج میرا بہت دل چاہ رہا ہے.....“ گل پری کے اصرار پھر لہجے میں ہاجرہ نے غور کر اسے دیکھا تھا۔

”دماغ خراب ہے تمہارا..... اس وقت زوال کا وقت ہے..... اس جھمکتی دوپہر میں جاؤ گی..... خود بھی جلوگی اور مجھے بھی جلاؤ گی ناں بھی مجھ بوزمی میں ہمت نہیں رہی اب خاموش بیٹھی رہو.....“ ہاجرہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”ہاں..... ہمارے چلنے تک زوال کا وقت ختم ہو جائے گا..... اور دیکھو تو آج اتنی گرمی بھی نہیں ہے۔“ گل پری نے ہاجرہ کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پھر سے اصرار کیا تھا۔

”اماں..... میری پیاری اماں..... ہمیں کون سا سوئیل دور جانا ہے..... بس آدھا گھنٹہ ہی تو لگے گا..... چل ناں.....“ اس نے لاڈ سے اپنی ہاتھیں ماں کے گلے میں ڈال لیں اور چٹا چٹ گل چوم لئے..... ہاجرہ بیٹی کی ادا پر مسکرا دی۔

”اچھا ٹھیک ہے لیکن وہاں سے جلدی آنا ہوگا..... سمجھی..... مزار پر جا کے تو تم بھول ہی جاتی ہو واپسی کی راہ..... تمہارے ابا بھی بس زمینوں کے ہو کر رہ گئے ہیں..... گھر بار کی کوئی فکر نہیں۔“ ہاجرہ نے حامی بھری۔ تو وہ فافٹ اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی چادر اوڑھنے..... ہاجرہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر اس کی پشت پر ہلاتی لمبی چوٹی کو دیکھا تھا۔

”جھلی ہے پوری.....“ دھیرے سے بڑبڑاتی تھی۔

گل پری اور ہاجرہ نے دربار کے احاطے میں جونہی قدم رکھا ہوا کے سر جوھوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا تھا..... ہاجرہ حیران رہ گئی تھی کیونکہ گھر سے دربار تک کے فاصلے پر انہیں ایسی ہوا کا جھوٹا بھی چھو کے نہ گزرا تھا بلکہ گرمی کی شدت اور جس پہلے سے بھی بڑھتا ہوا محسوس ہوا تھا ہاجرہ نے گل پری کو دیکھا تھا جس کے خوب صورت چہرے پر ایک سکون سا پھیلا ہوا تھا سیاہ چادر میں اس کا خوب صورت چہرہ چاند کی مانند دک رہا تھا اس نے گھبرا کر اپنی بیٹی کے چہرے سے نگاہ ہٹائی تھی۔

”ماشاء اللہ چشم بدوور.....“ کہہ کر مزار کے برآمدے میں آن رکی تھی..... اپنی چادر کے پلو سے بندھے چند نوٹ کھول کر لوہے کے سنے بکس میں ڈالے تھے جبکہ گل پری دربار کے ایک ایک گوشے کو عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اگر قبیلوں کی

خوشبو نفضا میں رنج کر ماحول کو سوغداری کے لہا دے میں لپیٹے ہوئی تھی۔ ہر شے پر سکوت سا طاری تھا..... گل پری نے صاحب مزار کی قبر پر عقیدت سے بوسہ دیا تھا۔ چڑیوں اور کوؤں کی چکار پورے قبرستان میں گونج رہی تھی گل پری نے اپنی چادر کو درست کیا اور اپنی سیاہ غلافی آنکھوں کو بند کر لیا..... اس کے یاقوتی سرخ لب ملے تھے اور اس کی پرسوز اور سحر انگیز آواز پورے مزار میں گونجنے لگی۔

حاضری کے لئے آنے والا نوجوان چوکھٹ پر ساکت و صامت کھڑا سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹے حسن مجسم کو سہرا رہا تھا..... جس کے نازک لبوں سے نعت کے ٹھٹھے بول ادا ہو رہے تھے وہ ارد گرد سے بے نیاز آنکھیں بند کئے پورے سر و رویف میں ڈوبی ہوئی تھی ہاجرہ نے ابھی خوب رونو جوان کو چوکھٹ میں ایستادہ دیکھا تو ٹھٹھک گئی..... اس نے گل پری کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

”گل پری..... اٹھو..... چلیں.....“ اس کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔

”اوہو..... اماں..... سارا مزہ خراب کر دیا۔“ ماں نے تنبیہی انداز میں گھورتے ہوئے مزار کی چوکھٹ کی طرف دیکھا تھا۔ گل پری نے بھی نا اچھی والے انداز میں ماں کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بھی شیشا سی گئی اور جلدی سے اٹھ بیٹھی..... سیاہ چادر کو خود سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔

”اماں چلو.....“ ہاجرہ اور گل پری نوجوان کے قریب سے گزری تو بل کی بل ان دونوں کی نظریں ملی تھیں گنتی چمک تھی نوجوان کی بلوری آنکھوں میں گل پری نے گھبرا کر نظر جھکا لی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

مزار کے احاطے میں لگے بڑے سے برگد کے درخت کے نیچے وہ سراپا انتظار بنے بیٹھا تھا ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر چونک جاتا کہ شاید وہ آئی ہو..... مگر اس دن کے بعد وہ دوبارہ حزار پر حاضری دینے نہیں آئی تھی..... آج اسے انتظار کرتے پا نچوال دن تھا..... یہ دن رات اس نے کس کس طرح گزرا ہے تھے یہ صرف

وہی جانتا تھا..... ہر آہٹ پر چونک جاتا..... ہر چہرے میں اس کو تلاش کرتا..... ویدی کی پیاسی اکھیاں سراب ہی نہ ہو پاری تھی دل تھا کہ ہمک ہمک کر اس کی آرزو کرتا..... بے چینی سی تھی جو اس کے رگ و پے میں بھر چکی تھی۔ اپنی جھلک دکھانے والی سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی تھی..... اس کی سر پہ گداز آواز اس کے کانوں میں گونجتی تو وہ خود پر اختیار کھونٹنے لگتا۔

”کہاں چلی گئی ہو..... آ جاؤ..... آؤ دیکھو اپنے دیوانے کو ذرا.....“ وہ بے قرار سا ہو کر مزار کی طرف آنے والے کپے رستے پر آن کھڑا ہوا..... شام کے سائے جوں جوں گہرے ہو رہے تھے اس کی بلوریں آنکھوں میں چلتے دیپ بھی بجھنے لگے تھے۔ وہ سر جھکائے پائوس سا دوبارہ برگد کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا..... تب ہی اس کی نظر سامنے سے آتے چند افراد پر پڑی تھی وہ نہایت تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آن رکے۔

مدھم مدھم سرگوشیوں میں جانے اس سے کیا کہہ رہے تھے کہ وہ جین سا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”چلو..... جانے کا وقت آ گیا ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے پرٹول نگاہوں سے مزار کو دیکھا اور آنے والے افراد کے ساتھ ہولیا۔

”آؤ آؤ صفدان..... مجھے تمہارا ہی انتظار تھا.....“ بارش بارعب بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔

”السلام علیکم..... باباجان.....“ صفدان نے نہایت ادب سے جھک کر ان کے ہاتھ کی پشت پر عقیدت سے بوسہ دیا تھا۔

علیک السلام..... برخودار..... انہوں نے مسکراتے ہوئے صفدان کے سر پر دست شفقت پھیرا تھا۔ موہب نظریں جھکائے صفدان اس وقت وہاں پر موجود دیگر افراد کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا وہ سب ایک قطار میں احتراماً ہاتھ باندھے کھڑے تھے صفدان کے والد نے سب کو بیٹھے کا اشارہ کیا اور اسے

اپنے قریب بیٹھا لیا..... سب اپنی نشستیں سنبھال چکے تو صفدان نے اپنے والد محترم سے سوال کیا۔

”باباجان..... آپ نے کس مقصد کے تحت یوں اچانک طلب فرمایا ہے مجھے..... کوئی خاص وجہ.....“

”ہاں..... بیٹا..... بہت اہم وجہ ہے..... خاقون قبیلے نے پھر سے شرانگیزی شروع کر دی ہے وہ قبیلے کے اصولوں کو توڑ رہے ہیں اپنے مذہب اسلام سے باغی ہو رہے ہیں..... وہ شیطانی قوتوں کے زیر اثر آ چکے ہیں۔“

”بہت مرتبہ کوشش کی گئی کہ وہ راہ راست پر آجائیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں مگر ان کی ہٹ دھرمی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے بہت سے لوگ ان کے ساتھ مل چکے ہیں کسی کی بھی عزت و آبرو محفوظ نہیں رہی..... وہ طاقت کے نشے میں چور زبردستوں پر ظلم کر رہے ہیں..... ابھی گزشتہ دنوں انہوں نے معمولی سی بات پر بھڑک کر ہمارے چند خاص آدمیوں کو قتل کر ڈالا ہے جس کی وجہ سے تمام قبیلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ چکی ہے..... وہ سب بدلہ لینے پر تہمت ہیں..... یہ افراد جو تم یہاں دیکھ رہے ہو یہ سب مختلف قبیلوں کے معزز آدمی اور سردار ہیں یہ سب یہی مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں ایسی سخت سزا دی جائے کہ وہ دوبارہ سرکشی کی جرأت نہ کر سکیں خون بہا لینے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو صفدان گویا ہوا۔

”باباجان..... کیا وہ مذہب اسلام سے بھی دوری اختیار کر رہے ہیں۔“

”ہاں بیٹا..... نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی تو ہم پرستی اور بت پرستی کی ترغیب دلا رہے ہیں شیطانی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانی بحیثیت چڑھا رہے ہیں۔“

”اوہ میرے خدا.....“ صفدان گھبرا کر کھڑا ہو گیا اس کے ہر انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

”باباجان..... پھر تو ان کے خلاف فی الفور کارروائی کی جائے ورنہ.....“ اس نے بات ادھوری

چھوڑ دی۔

”ہاں بیٹا..... ہم سب نے تمہیں اسی مقصد کے لئے بلایا ہے..... یہ لڑائی تم لڑو گے..... مجھے یقین ہے تم ہمارے اعتماد پر پورا اترو گے“..... صفدان کے والد نے وہاں پر موجود معزز افراد کو تائیدی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”ہاں..... بالکل صفدان ایک ذہین اور ہوشیار سپہ سالار ہے ہمیں اس پر پورا اعتماد ہے۔“

”آپ ہمارے سردار ہیں ہمیں آپ کے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں۔ خدا نے چاہا تو صفدان ضرور کامیاب ہوگا۔“ عظیم قبیلے کے بزرگ نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

صفدان نے سب کی رائے سنی تو ایک عزم سے بولا۔

”تو ٹھیک ہے جناب آمنون..... میں آج ہی سے ان دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاؤں گا..... قبیلے کے اصولوں کی بغاوت تک تو ٹھیک تھا مگر انہوں نے اسلام سے منہ پھیرا ہے..... لوگوں کو گمراہ کیا..... یہ جرم قابلِ محاکمہ نہیں..... مرتد کی سزا صرف موت ہے..... صرف موت.....“ صفدان کی آنکھیں لہورنگ ہوئی تھیں۔ صفدان کے والد فرطِ ہوش نے آگے بڑھ کر اپنی میان سے تلوار نکالی اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔

”یہ ہماری خاندانی تلوار ہے صفدان..... خدا تمہارا حامی و مددگار ہو۔“

☆.....☆.....☆

خاتون قبیلے سے گھمسان کا رن پڑا تھا..... ہر طرف تلواروں کی جھنجھار رہی تھی..... صفدان تیزی سے خاتون قبیلے کی صفوں میں گھسا اور انہیں گاجرموں کی طرح کاٹ کر پھینک رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ہمت و دلیری سے لڑ رہے تھے..... مخالف قبیلے کے بہت سے افراد مارے جا چکے تھے کچھ زخمی ہو کر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے خاتون قبیلے کا

شیطانِ سردار ”طانوح“ بھی دستِ بدست لڑائی میں شریک تھا صفدان نے اس کو دیکھا تو اس کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا اس نے آگے بڑھ کر طانوح کو مقابلے کی دعوت دی..... دونوں گھوڑوں سے اتر کر زمین پر آگئے دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر تلوار سے وار کر رہے تھے اس سے پہلے کہ صفدان کا داؤ اس پر چلتا طانوح نے تیزی سے تلوار سے وار کیا تھا جو اس کی ران پر گہرا اثر کر گیا..... صفدان کے ہونٹوں سے ”آ“ نکلی تھی اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا..... تکلیف کی شدت بڑھ چکی تھی طانوح نے جب صفدان کو بے بس پایا تو آگے بڑھ کر اس کا سر تلوار سے الگ کرنا چاہا کہ اسے میں اس کے ساتھی آگے آگئے طانوح گھبرا کر میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

صفدان بے ہوش ہو چکا تھا..... اس کے ساتھی اسے اٹھا کر طبیب کے پاس لے آئے تھے رات کو اس کے والد فرطِ ہوش اس کی عیادت کے لئے آئے تو بہت متشکر اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ صفدان ان کی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا وہ ان کا اکلوتا بیٹا اور جانشین تھا اس سے چھوٹی دو بیٹیاں اس اور کلبلیہ تھیں والدہ حیات نہیں تھیں۔ فرطِ ہوش نے انہیں نہایت شفقت اور محبت سے پروان چڑھایا تھا ان کی تربیت و تعلیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس کے بابا خود بہت بڑے عالمِ دین تھے لوگوں نے ان کے علم اور کردار کو دیکھتے ہوئے ان کو اپنے سردار بنالیا تھا۔

”باباجان..... آپ پریشان مت ہوئے..... میدان جنگ میں تو یہ ہوتا ہی ہے ناں.....“ اس نے ان کو برداشت کرتے ہوئے فہمت زدہ لہجے میں کہا تو فرطِ ہوش نے دیر سے سر ہلادیا۔

”جانتا ہوں بیٹا..... طانوح بہت سرکش جا رہا ہے۔“ وہ فکرِ مندی سے گویا ہوئے۔

”جی باباجان..... انشاء اللہ میں اس سرکش خاتمہ کر کے ہی رہوں گا یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ مجھے یقین ہے تم اسے ختم کر سکتے ہو مگر.....

وقت تم زخمی ہو اور تمہاری جان کو طانوح کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔“

”بابا..... میں خطروں سے نہیں گھبراتا۔“

”صفدان میں چاہتا ہوں، کہ تم صحت یاب ہونے تک کہیں روپوش ہو جاؤ طانوح کی پہنچ سے دور..... جہاں اس کے ہر کارے تم تک نہ پہنچ سکیں۔“

”باباجان..... آج مجھے بزدلی کا سبق دے رہے ہیں۔“ وہ تیز لہجے میں بولا مگر دوسرے ہی پل کراہ اٹھا۔

”یہ بزدلی کا سبق نہیں ہے صفدان بیٹا..... یہ مصالحت ہے بس چند دن کی بات ہے..... جب تم صحت یاب ہو جاؤ تو لوٹ آنا..... طانوح کو تم ہی شکست دے سکتے ہو بشرطیکہ..... تم زندہ ہو۔“ فرطِ ہوش نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”مگر میں جاؤں گا کہاں.....؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اپنے والد کو دیکھنے لگا اس کی بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے پھر جوان کی لبوں سے نکلا تھا اسے سن کر صفدان ششدر سا ہو کر انہیں کھینکے لگا۔

”بہتر چار کار.....“

بہت سی یادیں اس کے دل میں کھلبلی مچا گئی تھیں جبکہ فرطِ ہوش کے لبوں پر ممتی خیز کراہٹ درآئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کے وقت گل پری اپنی سہیلی کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو اسے اپنی گلی میں بچوں کا جھوم دکھائی دیا جو جانے کس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے کوئی ہوگا مداری والا تماشہ دکھائے گا اور چلتا بنے گا چلو آج میں بھی دیکھ لیتی ہوں۔ وہ خود سے باتیں کرتی بچوں کے جھوم کے پاس پہنچی تو ایک بچہ ہاتھ میں پتھر لئے نظر آیا۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہو.....؟“ وہ مزید آگے بڑھی تو ایک زخمی بلا دکھائی دیا۔ سفید رنگ کا پھوٹا سا بلا..... جس کی ٹانگ پر بہت گہرا اثر تھا زخم سے رستا ہوا خون اسے بے چین کر رہا تھا وہ جلدی سے آگے بڑھی تھی۔

”بابا جی رک جاؤ یہ تمہیں کاٹ لے گا۔“ جھوم میں

سے ایک بچے نے پکارا تھا۔ گل پری نے پلٹ کر بچوں کو گھورا۔

”یہ زخمی ہے..... اسے مدد کی ضرورت ہے..... یہ مجھے کچھ نہیں کہے گا..... چلو بھاگو..... بھاگو یہاں..... سے چلو..... وہ انہیں ڈانٹتے ہوئے نیم جال بے کو احتیاط سے اپنی آغوش میں لے لیا۔

”اوہو..... تم تو بہت زخمی ہو.....“ بچے ادھر ادھر کھسک گئے تھے گل پری بے لکھا کراہنے لگی۔

اس نے زخمی بے کو زمین پر لٹا کر احتیاط سے زخم کو صاف کر کے مرہم پٹی کی..... اور پھر دودھ سے بھرا ہوا پیالہ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا بے نے دودھ ختم کیا تو وہ اسے محسن میں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے ڈربے میں لا کر لٹائی..... ڈربہ کافی کھلا اور ہوا دار تھا اسے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی وہ مطمئن سی ہو کر چلی گئی یہ ڈربہ اس نے ختم کرنے کے لئے بنوایا تھا چوڑے نوادارہ بلی کی خوراک بن گئے تھے مگر اب یہ ڈربا زخمی بے کے کام آ رہا تھا شام کو منشی حیات گھر لوٹا تو ڈربے میں زخمی بے کو بخوشااحت پانچر مسکرایا بھینا یہ گل پری کا کارنامہ ہو گا وہ ایسی ہی تھی نرم خور اور محبت کرنے والی..... منشی حیات اللہ کو اپنی بیٹی کی یہ حادث بہت بھائی تھی۔

چمر کی نماز ادا کرنے کے بعد درودِ شریف کا وظیفہ مکمل کیا تو گل پری پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ معصی اٹھا کر دوبارہ بستر پر آن لٹتی تو کچھ ہی دیر میں نیند میں ڈوب گئی دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تو سورج چوری آ ب دتاب سے جھمگاہا تھا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

”ارے اتنا وقت ہو گیا..... اوہو..... اماں بے چاری کو اکیلے ہی سارا کام کرنا پڑا ہوگا..... اور بابا..... ارے بابا نے تو آج شہر جانا تھا..... اوہ خدایا.....“ وہ جلدی جلدی دوپٹہ اوڑھتی سلیمہ پاؤں میں اڑتی باہر بھاگی تھی..... سارا محسن صاف سٹھرا تھا..... کچن میں جھانکا تو وہ بھی چمک رہا تھا..... اماں..... اماں..... گل پری باہر کو پکارنی اس کے کمرے کی طرف بڑھی تھی اسی

انشاء میں ہاجرہ کرے سے آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکل آئی۔

”کیا بات ہے گل پری..... صبح ہوگئی کیا..... ارے یہ تو دن چڑھ آیا ہے..... جاؤ جلدی سے ناشتہ لے آؤ..... میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں..... آج تو تم نے گھر کو خوب چکار کھا ہے۔“ ہاجرہ تو صبی نگاہوں سے ارد گرد دیکھتی ہے حیران چھوڑ کر دوش روم میں چلی گئی۔

”یہ اماں کو کیا ہوا ہے..... میں نے..... یہ میں نے کب کیا بھلا..... میں تو خود سوری تھی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی مگر کچھ یاد آنے پر وہ ڈربے کی طرف چلی آئی جہاں زخمی بلا موجود تھا وہ آرام سے لیٹا ہوا تھا آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر گل پری کو دیکھا اور ”میاؤں میاؤں“ کی آواز نکال کر گویا اسے صبح بخیر کیا تھا۔ گل پری نے مسکرا کر اس کے سر کو تھکا تھا تب ہی اس کی نظر اس ٹانگ پر کی گئی پٹی پر پڑی تھی پاس ہی دودھ والا پیالہ بھرا پڑا تھا۔ پہلے تو حیران ہوئی پھر سر جھٹک دیا کیا پتہ بابا نے جاتے ہوئے اس کی پٹی تبدیل کر گئے ہوا اور دودھ بھی ڈال دیا ہو۔

رات کو جب منشی حیات اللہ شہر سے لوٹا تو گل پری نے بے چینی سے اس سے سوال کیا تھا۔

”بابا..... آپ آج صبح صبح ہی شہر چلے گئے.....“

”ہاں..... بیٹی تمہیں بتایا تو تھا پچھری جانا ہے زمینوں کے کام کے سلسلے میں۔“ منشی حیات اللہ نے روٹی کا ٹوٹا ڈرگمڑ میں رکھا۔

”اچھا..... بابا یہ بلے کی پٹی آپ نے تبدیل کی تھی کیا؟“

”میں نے..... نہیں تو..... میرے سامنے تو تم نے ہی تو بدلی تھی اور دودھ بھی ڈالا تھا۔“

”میں نے.....“ وہ چونک کر منشی حیات اللہ کو دیکھنے لگی جو کھانا کھانے میں مصروف تھا۔

”ہاں تم نے..... مجھے بیدار کرنے کے بعد تم ہی نے تو کیا تھا..... کیا بات ہے گل پری۔“ اب کے بار منشی حیات اللہ بھی چونکا تھا اس کے چہرے پر اچھن کے

آٹا مارا بھرے تھے۔

”کچھ نہیں بابا..... میں بھی ناں..... بھٹکوا ہی ہوتی جاری ہوں بھول گئی تھی۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئی بولی تو منشی حیات اللہ ہنس دیا۔

”بادام کھایا کر..... دماغ کو طاقت پہنچتی ہے۔“ گل پری کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی لیکن اسے بہت سے سوال پریشان کر گئے تھے۔

اب تو اکثر ہی ایسا ہونے لگا تھا کہ جب بھی وہ کئی کام کرنا چاہتی کوئی ناہیدہ ہستی اس سے پہلے وہ کام سرانجام دے دیتی۔ ابھی کل شام ہی کی تو بات تھی جب بابا نے اسے چائے طلب کی تھی لیکن جیسے ہی وہ کچن میں گئی چائے پہلے ہی سے تیار ملی..... گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے..... وہ حیرت سے کتنی ہی دیر تک پتلی کودیکھتی رہی تھی..... اس نے نوٹ کیا تھا جب وہ گھر پر تنہا ہوتی ہے کوئی اس کے آس پاس رہتا ہے..... ایک انجانی سی خوشبو اس کا حصار کئے رکھتی ہے کوئی ہے جو اس کو اپنی نگاہوں کے حصار میں قید رکھتا ہے پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا مگر آج جب وہ غسل کر کے آنے کے سامنے کھڑی اپنے دراز بالوں کو سلجھا رہی تھی تو اس کے کانوں کے قریب ایک سرگوشی ہوئی تھی۔

”بہت خوب صورت ہوگل پری..... بہت پیاری..... سچ.....“ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتی تھی لیکن کمرے میں کیسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا کمرے کی کھلی کھڑکی سے چند قدم دور وہ زخمی بلا اسے بہت غصہ سے دیکھ رہا تھا اس کی سبز آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور پراسراریت بھی..... جانے گل پری کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس نے ان آنکھوں کو پہلے ہی کہیں دیکھا ہے..... وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کھڑکی کے پاس آئی تو وہ میاؤں میاؤں کرتا بے چین ہونے لگا۔ گل پری نے بہت توجہ سے اس کو دیکھا تھا..... یہ آنکھیں وہ پروسچ انداز میں نظریں ادھر ادھر گھماتے لگی۔

”ارے ہاں..... یہ آنکھیں..... یہ تو..... پیر بچا

سرکار..... وہ تو جوان.....“ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔

”تو کیا.....؟ نہیں.....“ دوسرے ہی پل اس نے اپنے خیال کی خود ہی نفی کر دی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ممکن نہیں..... یہ جانور..... اور وہ انسان۔ صفوان کا عشق عشق مجازی تھا اور وہ بھی غیر فطری..... کیونکہ وہ ایک جن زادہ وہ ایک آدم زادی..... وہ جانتا تھا کہ ان دونوں کا ملاپ ممکن نہیں ہے وہ چاہتا تو ایک جن ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے زیر کر سکتا تھا مگر یہ اس کے عشق کو گوارا نہ تھا کہ وہ اس کو اذیت پہنچائے یا اس کی ذات کی وجہ سے اسے نقصان پہنچے وہ اپنے قبیلے اور اپنے بابا کے سکھائے اصولوں سے منحرف ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس کے بابا نے اسے ہمیشہ انسانوں کی عزت کرنے کا حکم دیا تھا انہوں نے اسے درس دیا تھا کہ وہ ہمیشہ آدم زادوں کی ہستی سے دور رہیں اگر بالفرض ان کی ہستی سے گزر بھی ہو تو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے نہ ہی ان کے مال و جان کے ورپے اور نہ ہی ان کے بیو، بیٹیوں کو اپنے زیر تسلط لا کر غلط کاریاں کریں۔ مسلمان کا خاص طور پر احترام کرے اور ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچائے۔ اس کے بابا فرطہوش تھے اس ان اصولوں پر کار بند رہے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے رہے۔ خاتون قبیلے نے ان اصولوں سے انحراف کیا اور اسلام سے ہی پھر گئے جن کی سرکوبی کے لئے صفوان کا انتخاب کیا گیا تھا اس کے والد فرطہوش اپنے قبیلے کے سردار اور شہنشاہ جنات کے خاص تھے شہنشاہ و جنات ان کے علم اور حکمت کی بہت قدر کرتے تھے خاتون قبیلے کو ختم کرنے کا فیصلہ شہنشاہ جنات سے مشورے کے بعد ہی کیا گیا تھا۔ اپنے قبیلے کی تمام زندگی صفوان کر رہا تھا علم و ذہانت، خوبصورت اور خوب سیرتی میں اپنی مثال آپ خاندان یا سام فرطہوش فرزند صفوان بن فرطہوش ایک آدم زادی پر دل ہار چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کو گھر میں آئے ایک ماہ ہونے کو تھا..... اس کا ذمہ بھی پہلے سے کافی منہل ہو چکا تھا پری نے محسوس کیا تھا جوں جوں اس کا ذمہ بھرتا جا رہا ہے وہ کافی بے چین اور اداس رہنے لگا تھا بھلا سادہ سکرانی ہوئے اس کے پاس نیچے زمین پر بیٹھ کر اور دھیرے دھیرے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”تم بہت اداس ہونا..... تمہارا یہاں سے جانے کو بھی نہیں چاہ رہا تو مت جاؤ رک جاؤ۔“ وہ پیار سے بولتی ہوئی گویا اس کے دل کا حال ظاہر کر رہی تھی بلے کی آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی رہی ہوئی تھی۔

”گل پری بیٹا.....“ ہاجرہ کی پکار پر اس نے سر گھما کر ماں کو دیکھا تھا۔

”جی اماں.....“ کہہ کر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں..... دروازہ اچھی طرح بند کر لو اندر سے..... مجھے کچھ دیر لگے گی آنے میں۔“ ہاجرہ چادر اوڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

ہاجرہ دروازے کی طرف بڑھی تو وہ اٹھ بیٹھی۔

”اچھا تم بھی کو..... میں ابھی آتی ہوں۔ تمہارے لئے دودھ بھی لینی آؤں گی۔“ وہ بلے کو مخاطب کرتے ہوئے چل دی۔

دروازہ بند کر کے باورچی خانے میں سے دودھ سے بھرا گلاس اٹھایا اور ڈربے کی طرف چلی آئی..... وہ دھک سے رہ گئی۔

”ارے..... یہ کہاں چلا گیا.....“ ڈربہ خالی تھا بلا وہاں موجود نہیں تھا اس نے سارا گھر دیکھ لیا۔

”لق دتی سی محن میں مجھے تخت پر بیٹھ گئی..... ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو یہاں موجود تھا۔ وہ تخت رنجیدہ اور اداس سی ہونے لگی خالی خالی نظروں سے اس نے ڈربے کی جانب دیکھا تھا تب ہی ایک تیز اور دلچسپ سی خوشبو اس کے نکتھوں سے نکلانی تھی جو بنی اس نے پلٹ کر دیکھا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... ایک حیران کن منظر اس کے سامنے تھا وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی

ہوئی..... ایک خوبصورت جوان اپنی خوب صورت مسکراہٹ سمیت اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ سفید روشن لباس میں ملیں..... سرخ و سپید رنگت خوبصورت سی کیسی ناک، بگلابی ہونٹ، سنہری بال جو نہایت نفاست سے تراشے ہوئے تھے سبز نیلکوں آنکھیں جن پر یہ دراز پلکیں لرز رہی تھی دراز سراپا اور چہرے پر کئی ہلکی سی مسکراہٹ اس کی شخصیت کو مزید پروقار بنا رہی تھی۔

”تم یہاں.....؟“ گل پری کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”جی..... میں..... یہاں..... آپ کا زخمی بلا۔“ وہ دھیمے مگر شوخ لہجے میں بولتا گل پری کو دیکھتا رہا تھا۔

”ز..... زخمی..... بلا.....“ وہ حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”جی.....“ وہ بدستور شوخی سے بولا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں میں شرارت تھی۔

”مذاق کر رہے ہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا..... وہ تو چھوٹا سا جانور..... اور آپ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”میں مذاق نہیں کر رہا گل پری..... میں ہی وہ زخمی بلا ہوں جسے آپ اٹھا کر گھر لے آئی تھی۔ اور میں وہی نو جوان ہوں جو پیر سچا سرکار کی چوکت پر اپنا دل ہار آیا تھا۔“

”میں آپ کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں..... آپ کو یقین نہیں..... یہ دیکھئے۔“ اس نے اپنی شلوار اوپر کی تو وہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی اس کی ٹانگ پر زخم کا دیباہی نشان تھا جو زخمی بلے کی ٹانگ پر تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں..... میں آپ کے سامنے کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو تو کہہ ڈالوں.....؟“ اس نے اجازت طلب لگا ہوں سے پری کو دیکھا تھا جو ہونٹوں کی طرح کبھی اسے دیکھ رہی تھی تو کبھی خالی دڑبے کو۔

”بولیں.....“ وہ کھوٹی کھوٹی سی بولی تھی اس کی

آواز اس کا مدغم لہجہ ایسا تھا جو گل پری کو مسرانا کر رہا تھا۔

”میرا نام صفدان بن فرطہوش ہے میرا تعلق جنات کے قبیلے سے ہے مجھے سیر و سیاحت اور مزاروں پر حاضری دینے کا بہت شوق تھا یہی شوق مجھے تمہارے خوب صورت علاقے میں کھینچ لایا اور پیر سچا سرکار کے مزار پر حاضر ہونے کا شرف بخشا ہو سکتا تھا کہ میں حاضری دے کر خاموشی سے واپس لوٹ جاتا مگر مزار کے اندر سے گونجنے والی آواز نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں انسانی روپ میں آ کر اس خوب صورت پری کا چہرہ دیکھوں میں بس یہی میری خطا تھی جو میں نے آپ کا حسن مجسم سراپا دیکھا۔ تب سے لے کر اب تک میں نے خود کو آپ کی محبت میں جکڑا پایا ہے میں دن رات پیر سچا سرکار کے مزار پر رہنے لگا کہ شاید آپ دوبارہ آؤ مگر انتظار، انتظار ہی رہا ایک روز میں یونہی اداس بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ساتھیوں نے مجھے بابا کا پیغام دیا کہ میں فوراً واپس آ جاؤں..... میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا مگر والد کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا آپ کی حسرت لئے واپس قبیلے لوٹ گیا وہاں چند شیطانی قوتوں نے شرانگیزی پھیلا رکھی تھی جن کی سرکوبی کے لئے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی میں نے زبردست قسم کی لڑائی کی جس کے نتیجے میں، میں زخمی ہو گیا اور وہ فرار ہو گئے مجھے چند دن دور چلے جانے کا کہا تو پھر ت یہاں آ گیا پہلے لوگوں کی نظروں سے بچ کر مزار پر دن گزارے مگر جب آپ نہ آئی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بلے کا روپ دھار کر آپ کے ہمراہ ادھر آ گیا آگے جو کچھ پیش آیا آپ اس سے بخوبی واقف ہیں آپ کے سارے کام میری چھوٹی بہن کیلئے کرتی تھیں وہ آپ کو بہت پسند کرنے لگی ہے اور اس کا سر بچرا بہ بھائی تو آپ کا دیوانہ ہے۔“ آخر میں وہ شوخی سے سر جھکا کر بولا تھا۔

”کچھ دیر پہلے مجھے بابا کی جانب سے پیغام ملا ہے کہ اب واپس آ جاؤں تاکہ شیطانی قوتوں کے

الف حتی جنگ لڑی جاسکے۔ میرا جی تو نہیں چاہتا کہ میں واپس چلا جاؤں مگر مجبوری ہے۔ گل پری۔“ اس نے دھڑکنے سے اسے پکارا تھا وہ ہنوز ہونٹوں کی طرح مسکراتے دیکھ رہی تھی صفدان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”سچے..... کیا تمہیں میری محبت..... میرا ساتھ.....“ وہ امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

گل پری ایک ٹرائس کی کیفیت میں گھری کھڑی تھی جسے وہ کوئی پسنا ہوا کچھ جھپکتے ہی اوجھل ہو جائے گا وہ بے یقینی سے صفدان کو دیکھ رہی تھی اس کی ہر بات تسلیم کر لینے کا حکم صادر کر رہا تھا۔

”صفدان اگر چاہے جن زادے ہو اور میں آدم لڑائی..... یہ عشق بھلا کہاں سے یہ کچھ دیکھتا ہے سچ..... میں بھی اپنا دل وہیں بھول آئی تھی لیکن بھی بھلا نہیں ہونے دیا لیکن آپ کی ان آنکھوں کی چمک نے مجھے جین کیا تو بس نہ چلنے پر ہمیشہ اپنے رب کے حضور سر کو جھکا دیا..... میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ آپ کون ہو..... کہاں سے آئے ہو۔ آپ کی یاد نے مجھے پھرے پاک پروردگار سے ملا دیا..... اس کے سامنے سر جھکانے کا شرف حاصل ہوا صفدان..... حقیقت تو یہ ہے کہ ہم چاہ کر بھی ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ ناری ہواور میں خاکی..... ہمارا خدا اس بات کو حرام ٹھہرا چکا ہے۔“ گل پری کے منہ سے نکلنے والی باتیں اسے حقیقت سے روشناس کروا رہی تھیں صفدان کے لئے یہ بات خوش آئند تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔

”میں اس بات سے واقف ہوں گل پری..... میں بھی نہیں چاہتا کہ میری پاک باز محبت ہوں پرستی کا نام دھرے..... میں نے تمہارے جسم سے نہیں روح سے محبت کی ہے یہ ضروری نہیں کہ ہم جس سے محبت کریں اسے پابندی لیں..... میں بھی اپنے مذہب کے خلاف نہیں میرے عالم دین باپ نے بہت سے سال اس انسانی بستیوں میں گزارے مگر ان کا جسم کسی بھی گناہ

سے آلودہ نہ ہوا آگے چل کر انہوں نے ایسی تربیت میری بھی کی کہ ہمارا قبیلہ انسانوں کو تکلیف دینے کا باعث نہیں بنا۔ گل پری..... ہم اپنی محبت کو ہوس سے برا بنائیں گے..... ہاں..... ہم وفا نبھائیں گے..... بولو میرا ساتھ دوگی۔ رہو گی ہمیشہ میری بہن کے۔“ صفدان اسے اپنی محبت کا پابند بنا رہا تھا جبکہ وہ سر ہلارہی تھی اقرار کر رہی تھی صفدان کا چہرہ اندرونی جذبات سے دھک رہا تھا۔

”اچھا گل پری..... مجھے جانا ہے اجازت دو.....“ وہ اداس اداس سے لہجے میں بولا تو وہ بولے سے مسکرا دی۔

”جاؤ صفدان خدا تمہیں ہر لمحہ اپنی امان میں رکھے اور ہر گھڑی کا میاب ٹھہرو۔“ آپ سے تم کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔

صفدان نے اس کی صراحتی وار گردن پر کچھ دیر کے لئے نظریں جمائی اور منہ میں کچھ بڑھا لگے ہی لہجے گل پری کی گردن میں نلیم پتھر کا نہایت قیمتی ہار آچکا تھا..... اس نے حیرت سے صفدان کو دیکھا۔

”یہ میری طرف سے چھوٹا سے تحفہ ہے..... یہ ہار کوئی معمولی ہار نہیں..... یہ تمہیں اس لئے دے رہا ہوں تاکہ تم ہر مصائب سے امان میں رہو اور جب میری یاد آئے یا مشکل پیش آ جائے تو اس پر ہاتھ پھیرنا اور آنکھیں بند کر کے تین بار میرا نام پکارتا میں جہاں بھی ہوا تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ صفدان خاموش ہوا تو گل پری کے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”ٹھیک ہے..... میں ایسا ہی کروں گی۔“

”اچھا گل پری میں چلتا ہوں..... فی امان اللہ۔“ صفدان اس کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا گل پری کو زور کا چکر سا آیا اور وہی تخت پر گر گئی۔

باجرہ گل پری کو یوں بے سدھ پڑے دیکھا تو گھبرا گئی..... اس نے دروازہ بجایا تو اندر سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے مسائے کے بچے کو اندر کوونے کو کہا اس بچے نے اندر کو دروازہ کھولا تھا۔

ہاجرہ جلدی جلدی پانی سے بھرا گلاس لے آئی تھوڑا سا پانی چہرے پر چھڑکا اور دھیرے سے اس کو ہلایا۔

”پری..... پری.....“ گل پری نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔
”کیا ہوا میری بچی..... کچھ تو بول۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

اس کے ذہن میں سارے واقعات روشن ہو گئے اور صفدان کے ساتھ کیا محبت کا اقرار بھی..... اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے فی میں سر ہلایا۔

”کچھ نہیں پتہ نہیں..... بس یونہی پکرسا آ گیا تھا۔“ وہ ہاجرہ کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی۔
”تمہارے بابا آجائیں تو پھر ڈاکٹر کے پاس جانا..... دوا لے لیتا۔“

”خدا جانے کون سا پکڑ..... وہ فکر مندی سے بولی۔
”ہاں اماں چلی جاؤں گی۔“ وہ آنکھیں موندتے ہوئے بولی۔

”تب ہی ہاجرہ کی نگاہ ڈرے کی طرف اٹھی۔“
”یہ بلا کہاں ہے؟“
”اماں..... مجھے نہیں پتہ..... چلا گیا ہوگا۔“ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بولی تھی مبادا اماں اس کی آنکھوں سے کچھ اندازہ نہ لگالیں۔

”چلو خبر ہے..... اک نہ ایک دن تو اس نے چلے جانا تھا۔“ ہاجرہ مطمئن سے انداز میں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی جبکہ گل پری کے سر میں درد سے اٹھا تھا..... اس کی چٹکیں نم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

صفدان کو واپس قہیلے میں لوٹے چاردن ہونے کو آئے تھے کوئی بھی لمحہ ایسا نہ گزرا تھا جس میں اسے گل پری کو یاد نہ کیا ہو..... اب بھی ضروری کام نہ ٹھانے کے بعد وہ یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے پرسکون گوشے کی طرف چلا آیا..... وہ گل پری کے تصور میں پوری

مستغرق تھا جب اس کا بازو کسی نے زور سے ہلایا تھا وہ چونک کر پلٹا۔

”ارے بابا جان آپ.....“ وہ حیران ہوا۔
”کیوں..... میں نہیں آ سکتا۔“ فرطہوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی صفدان گھبرا گیا۔
”نہیں بابا جان..... آ سکتے ہیں لیکن بہتر ہوتا کہ آپ مجھے بلوائیے۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

فرطہوش نے بیٹے کو نونور دیکھا تھا کس قدر پر مژدہ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا وہ کافی دنوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کافی الجھا ہوا رہنے لگا ہے پہلے تو وہ بھی سمجھے کہ طانوح قبیلے کے سرکشوں کی وجہ سے پریشان ہے مگر چند دن بعد ان کے سامنے سارا معاملہ آ گیا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی مسکراہٹ سے کیوں محروم ہیں فرطہوش نے ایک گھبراہٹ سے بیٹے کو خارج کیا تھا اور گرد کے سرسبز و شاداب مناظر پر نگاہ کر کے انہوں نے صفدان کو دیکھا تھا جو بدستور سر جھکائے جانے کہاں گم تھا۔

”کوئی پریشانی ہے تو کہہ کیوں نہیں دیتے صفدان بیٹا۔“ فرطہوش کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ یکدم جیسے ہوش میں آیا تھا۔
”ن..... نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں بابا.....“

”کچھ تو ہے بیٹا جی جو چھپا رہا ہے.....“ ان کے لہجے میں معنی خیزی در آئی تھی۔

”میں تمہارا بابا ہوں..... تمہاری رگ رگ سے واقف..... اور یہ بات بھی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتے تمہاری آنکھیں کیا ہے میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں..... فحشی حیات اللہ کی بیٹی گل پری۔“ آخر میں انہوں نے جو کہا تھا اسے صفدان ساکت رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

گل پری کے معمولات زندگی میں حیران کن تبدیلی دیکھی تھی جیسے فحشی حیات اللہ نے محسوس کیا تھا

اس کی شوخیاں اور شرارتیں ختم ہو گئیں تھیں اس کی ہمدردی و مہمانت میں اضافہ ہو رہا تھا نماز تو وہ پہلے بھی پڑھتا کرتی تھی لیکن اب راتوں کو بھی اٹھ کر خدا کی بارگاہ میں سر جھکانے لگی تھی اس کے اوراد و خائف بڑھ چکے تھے اس کے ہونٹوں پر ہر لمحہ ”درد پاک“ کا درد جاری رہتا۔ کبھی کبھی تو یوں بھی محسوس ہوتا جیسے اس کا پورا وجود ہی ذکر میں مشغول ہو۔ ایک روشنی کا سا ہالہ تھا جس میں اس کے وجود کے گرد گھبراؤ اٹھ رہا تھا ایک انجانی کبھی خوشبو جی جو پورے آنگن میں ٹھہری رہتی اکثر ہاجرہ کا جی چاہتا کہ وہ گل پری سے اس بارے میں کچھ پوچھے مگر ایک ان دیکھا خوف اسے اپنے سحر میں پکڑ لیتا کہ باوجود کوشش کے کچھ کہہ نہ پاتی خوب صورتی تو پہلے خدا نے اسے عطا کی تھی مگر اب اس کی شخصیت میں عجب وقار سا بھی امنڈ آیا تھا جو بھی دیکھتا خود بخود اس کا احترام بھالا تھا..... جو بھی تھا گل پری پر امداد دہی برس رہی تھیں جبکہ وہ خود اس بات سے بے خبر اس کے حضور دل و سر سرور میں مشغول وہ خود سے بے نیاز تھی وہ بے خبر تھی کہ آنے والا وقت اس کی ہولی میں کیا دے رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

”صفدان..... کیا تم ایک آدم زادی سے محبت کر کے قبیلے کے اصولوں کے منافی نہیں جا رہے؟ تم خدائی کے مرتکب نہیں ہو رہے۔“ فرطہوش بارعجب انداز اختیار کئے صفدان کو ڈانٹ رہا تھا۔

”بابا جان! محبت کرنا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں ہم دونوں کا ملاپ ممکن نہیں پر اس کے باوجود میں اسے چاہتا ہوں کہ میں نے اس کی روح سے محبت کی ہے جسم سے نہیں..... اس کی نیک سیرتی سے عشق کیا ہے خوب صورت سے نہیں..... آج بے فکر رہے میرا دامن ہوں جیسی گندگی سے آلودہ نہیں ہے گل پری کی محبت نے مجھے خدا کے قریب کیا ہے غافل نہیں..... رہی قبیلے سے خدائی کی بات..... تو میں ایسا کرنا تو درکنار سوچ بھی نہیں سکتا.....

میں فرطہوش کا بیٹا ہوں..... شیطان کا چیلہ ہرگز نہ بنوں گا۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا تھا۔
”صفدان..... اتم کھاؤ کہ ایک آدم زادی کی محبت تمہیں تمہارے فرائض سے غافل نہیں کرے گی۔“

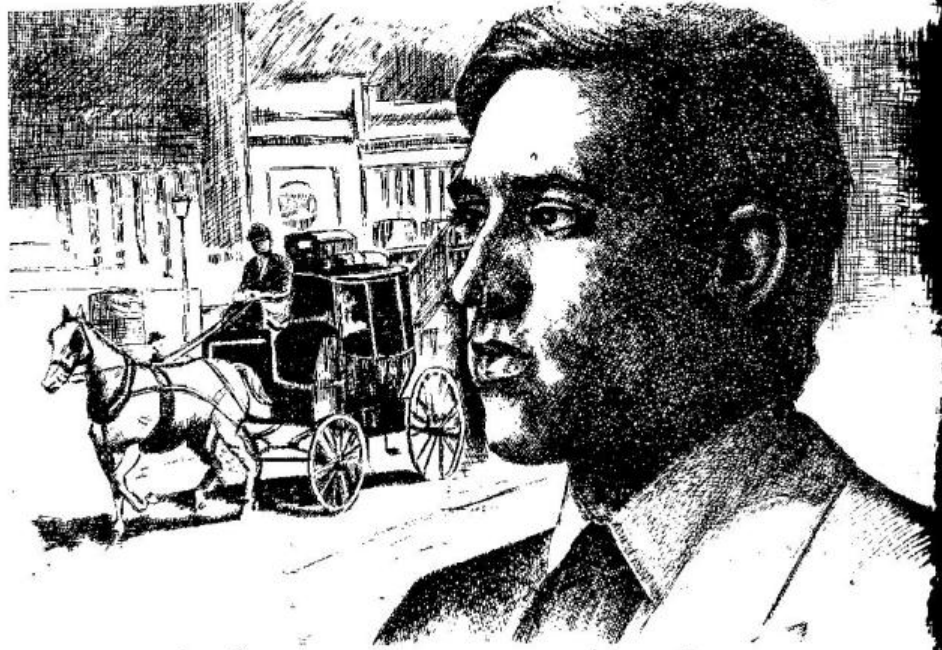
”بابا جان میرا وعدہ ہے آپ سے..... ایک آدم زادی کی محبت مجھے اپنے فرائض سے کبھی دور نہیں کر سکتی میں بے شک اس سے محبت کی ہے مگر سب سے پہلے میرے لئے میرا فرض اہم ہے اس کا ثبوت بہت جلد آپ کے سامنے آ جائے گا طانوح کی موت کے ذریعے۔“

”میں بہت خوش ہوں صفدان بہت زیادہ..... مجھے گل پری سے شکایت نہیں اور نہ ہی تمہاری محبت پر کوئی اعتراض..... بس حدود اللہ کا خیال رکھنا..... انہیں بھی توڑنا مت ورنہ نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے جیسے کہ تم سے پہلے لوگ حدود اللہ توڑنے کی وجہ سے عبرت کا نشان بنادے گئے۔“ فرطہوش اپنے بیٹے سے والہانہ محبت اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

”بابا جان..... انشاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔“ صفدان نے ایک عزم و حوصلے میں کیا تھا۔ جبکہ فرطہوش نے آگے بڑھ کر صفدان کی صحبت پیشانی پر بوسہ ثبت کیا تھا۔
”جیتے رہو خدا تمہارا نگہ دار ہو میرے بیٹے۔“

☆.....☆.....☆

آدھی رات کا وقت تھا..... ہر شے کو تاریکی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا بر سکوت فضا میں مختلف جنگلی جانوروں کی آوازیں گونج کر ماحول کو مزید براسرار بنا رہی تھیں چاند کی آخری تاریکیں تھیں جس کی وجہ سے اس تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے رہا تھا صفدان طانوح کی تلاش میں گھٹے اور سالوں پرانے تاریک جنگل میں گھوم رہا تھا اس کو پتہ چلا تھا کہ طانوح اور اس کے ساتھیوں نے فرار ہونے کے بعد اس جنگل میں موجود ایک سانپورہ مندر میں پناہ



اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ شہر یہ ادا کرنا چاہ رہی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نورین نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"ذیبت آخرا سی بھی کیا بات ہے آپ مجھے اس حویلی میں جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے ہیں جو دادا جان نے میرے نام کر دی تھی؟ ایسا کیا راز پوشیدہ ہے وہاں جو کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے؟ مجھ سے اب یہ خاموشی برداشت نہیں ہوتی ہے جو آپ حویلی کا نام سننے ہی اختیار کر لیتے ہیں۔"

اسد حقیقت جاننے کے لیے بھند تھا۔

"مجھ سے بحث مت کیا کرو۔ ایک بار کہہ دو یا ہے کہ نہیں جانا تو بس نہیں جانا ہے وہاں۔ دوبارہ میرے سامنے حویلی کا ذکر مت کرنا۔" دانش صاحب اتنا کہنے کے بعد اپنے کمرے کی جانب چلے گئے تھے۔

اسد اور فائق دو بھائی تھے۔ ان کی کوئی بہن نہ تھی۔ اسد کی پیدائش کے موقع پر والدہ آسیہ بیگم وفات پا گئی تھیں لیکن دانش صاحب نے دوسری شادی نہیں کی۔ گھر میں ملازموں کی فوج تھی۔ زمیندار دانش صاحب کے دونوں بیٹوں کے لیے چار ملازم ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈرائیور اور مالی بھی محل نما کوٹھی میں بڑی ایمانداری سے کام کر رہے تھے۔ دیہات سے شہر میں آنے کے بعد دانش صاحب کی ایک پریشانی تو دور ہو گئی تھی کہ اب بیٹے بہترین تعلیم حاصل کر لیں گے لیکن فائق نے فقط الف۔ اے کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ فائق کی مفتی بچپن میں ہی

مکراہت کھیلنے لگی۔

☆.....☆.....☆

مکمل پری محاسن تھی جب وہ ایکدم اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر کھٹکھٹ کے آثار تھے جیسے وہ کسی چیز پر غور کر رہی ہو۔ کئی دن سے اسے ایک خواب مسلسل پریشان کر رہا تھا اس نے دیکھا تھا کہ ایک بزرگ ان کا چہرہ نہایت نورانی اور شخصیت پر وقار و رعب دار ہے وہ اس سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"مکمل پری بیٹا..... فانی کی طلب مت کرو اپنی اصل کو دیکھو غیر کی محبت دل سے نکال کر اپنے رب کے حضور تہجد رہ کر ہو جاؤ پھر اپنے خدا کی طرف سے رحمت کی برسات دیکھو کیسے برکتی ہے..... اسے اپنا ڈیوڑھی کی چاہت ہے وہ تمہیں وہ عطا کر دے گا جو تمہاری چاہت ہے اگر تم روحانی منازل تیزی سے طے کرنا چاہتی ہو تو یہ وظیفہ دو روز تک مکمل کر لو انشاء اللہ ساری مشکلیں آسان ہوں گی۔"

وہ بزرگ اسے وظیفہ بتا کر غائب ہو گئے تھے ابھی بھی اس نے یہی خواب دیکھا تھا وظیفہ اسے یاد ہو چکا تھا..... دل ہی دل میں وہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور وضو کرنے کے لئے واش روم کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

دوسری طرف طانوح اور اس کے چیلوں سے صفدان کی مدد بھیڑ ہو گئی صفدان اس کے چیلوں کو ختم کر کے طانوح کی طرف آگے بڑھا مگر اس کی طرف پھونک ماری اور وہ وپیں پتھر کا ہو گیا مگر پھونک مارنے سے پہلے صفدان کے ہاتھ میں موجود خنجر اس نے طانوح کی طرف پھینک دیا جو سیدھا اس کے دل کے مقام پر جا لگا اور طانوح وہیں بنا پانی کے پھل کی طرح تڑپنے لگا صفدان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا مگر مرتے طانوح نے اس کو بھی پتھر کا بنا دیا تھا۔

☆☆

لے رکھی ہے اور اسے ہی اپنے ابلیسی کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں..... اسے پوری امید تھی کہ وہ طانوح اور اس کے چیلوں کو ختم کرے گا اس تک پہنچنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا وہ یہ بھی جانتا تھا اسے قدم قدم پر خطرات کا سامنا بھی کرنا ہوگا اس لئے اس نے اپنے گرد ایک مقدس حصار قائم کر دیا تھا تاکہ وہ شیطانی قوتوں سے محفوظ رہے وہ چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا پورے مندر میں ایک اعصاب شکن سناٹا پھیلا ہوا تھا وہ تیزی سے مندر کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا مندر میں جگہ جگہ بڑے بڑے جالے لگے رہے تھے مندر کی سرخ اینٹوں کا رنگ سیاہی میں تبدیل ہو چکا تھا برآمدے کے ٹوٹے پھوٹے اور شکستہ ستون مشکل سمجھتے کو سہارا دے کھڑے تھے۔ کمرے کے فرش پر گرد کی موٹی تہہ جم چکی تھی جس پر مختلف النوع کے حشرات الارض ادھر ادھر بھاگ رہے تھے چمکا ڈیزل اڑتی پھر رہی تھی یہ مندر کسی زمانے میں نہایت خوب صورت رہا ہوگا مگر اب بالکل ویران اور بد حال ہو چکا تھا صفدان نے مزید قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ مندر میں فلک شکاف پھیل گئی انھیں صفدان نے اپنے لباس میں چھپے ہوئے سنہری خنجر کو نکال لیا اور احتیاط سے قدم اٹھانے لگا یہ ایک خاص قسم کا جادوئی خنجر تھا جسے طانوح کے سینے میں اتارنا تھا اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یقیناً وہ موت سے دوچار ہو جاتا..... طانوح کی موت کے بعد دوسرے چیلوں پر با آسانی قابو پایا جاسکتا تھا طانوح اپنی طاقت و قوت پر نازاں تھا اس کا خیال تھا کہ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا ابلیسی طاقت اس کی حفاظت کرے گی وہ مندر کے تہہ خانے میں شباب و شراب کی محفل میں پر نشاط لمحے کشید کر رہا تھا جب اسے خبر ہوئی کہ صفدان اس کی موت بن کر اس کے سر پر آ پہنچا ہے..... وہ دہشت زدہ سا ہو گیا تھا مگر اگلے ہی لمحے اپنی شکلیاں اسے یاد آ گئیں تو اس کے بھدے ہونٹوں پر پراسرار سی

صائمہ سے کر دی گئی تھی جو کہ فائق کے چچا ارسلان کی بیٹی تھی۔ دانش صاحب کا بھی فقط ایک ہی بھائی تھا ارسلان جسے گھر والوں کی طرف سے بہت لاڈ پیار ملا تھا۔ بیس سال کی عمر میں فائق کی شادی کر دی گئی تھی تب صائمہ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ فائق کو اللہ نے دو بیٹیوں کی نعمت سے نوازا تھا۔ صائمہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے بس ٹڈل تک ہی تعلیم حاصل کر سکی تھی جبکہ دوسری طرف اسد نے یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنی کلاس فیلو زینہ سے پسند کی شادی کر لی جس میں گھر والوں کی رضا مندی شامل تھی۔

گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی لیکن اسد فارغ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسد نے شہر میں موجود خالی زمین پر فیکٹری تعمیر کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

☆.....☆.....☆

"ایک بات کہوں؟ وعدہ کریں کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ اس کے بعد میں کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔" زینہ کی آنکھوں میں آنسو ستاروں کی مانند چمک رہے تھے۔

"جی نہیں کیا چاہیے آپ کو؟ پلیز آنسو مت بہایا کریں محترمہ یہ میرے لیے تکلیف کی وجہ بنتے ہیں۔" اسد زینہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ دوسری شادی کر لیں۔ آپ کو تو بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور دو سال سے ہم اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ آپ کی خوشی سے بڑھ کر مجھے اور کوئی شے عزیز نہیں ہے۔" زینہ نے اپنا سر اسد کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ مسلسل بہنے والے آنسو اسد کی شرت تر کر رہے تھے۔

"کیا سانسوں کے بغیر زندگی کا تصور ممکن ہے؟ کیا چاند چاندنی کے بغیر فلک پر جھلکا سکتا ہے؟ کیا دل دھڑکن سے دوری برداشت کر سکتا ہے؟ کیا آنکھیں پیرانی سے محروم ہو کر حسین نظاروں کو خود میں سما سکتی ہیں؟ پھر تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے جدا ہو کر دوسری

شادی کر سکتا ہوں؟ تم تو جہ ہو میرے۔ جینے اور مکرانے کی۔" اسد نے بہت محبت سے زینہ کا حسین چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اسد کے لپس نے عرینہ کو مزید کچھ اور کہنے سے روک دیا تھا اور عرینہ لبوں پر مسکراہٹ سما کر رہ بات ماننے پر مجبور ہو گئی تھی اگر محبت سچی ہو تو کوئی بات بھی ازدواجی زندگی کی رونقوں کو متاثر نہیں کر سکتی ہے۔ قربت کے لحاظ سے عرینہ کے دل سے تمام دوسوں کو مٹا دیا تھا۔

"عرینہ میں فیکٹری کی تعمیر کے سلسلے میں چند روز کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ میری پیکنگ کر دو۔" اسد نے کھڑکی سے آئی ہوئی سورج کی روشنی سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اچانک پروگرام بنایا ہے کیا آپ نے؟" عرینہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

"اگر پہلے بتا دیتا تو تم نے میرے جانے سے پہلے تک اداس رہنا تھا۔ خوش رہا کرو پار۔" اسد نے اپنے ضروری کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا جو کہ ٹیبل پر بے ترتیب انداز میں رکھے ہوئے تھے۔

"آپ فریش ہو جائیں میں ابھی پیکنگ کر دیتی ہوں۔" عرینہ بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن غمزہ بھی تھی کیونکہ اسد کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔

"بھابھی میں فیکٹری کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اور واپسی پر اپنی حویلی میں بھی جاؤں گا۔ وہاں دیہات میں سکون نہ آنے کی وجہ سے میں عرینہ اور آپ سب سے روز بات نہ کر سکوں گا۔ آپ نے عرینہ کا بہت خیال رکھنا ہے۔ میں وہ راز جان کر ہی واپس آؤں گا جس کی وجہ سے ڈیڈ نے دیہات چھوڑ دیا تھا۔ آپ ڈیڈ کو بھی بتا دیجئے گا۔" اسد نے نیچے آتے ساتھ ہی اپنی بھابھی صائمہ سے بات کر لی تھی۔

"لیکن اسد تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟ یہ تو خود

کو مشکل میں ڈالنے والی بات ہے؟" صائمہ کے چہرے پر پریشانی کے سائے لہر رہے تھے۔

"بھابھی تجس بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ آپ دعا کیجئے گا۔ میں فائق کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ ڈیڈ آج اس میں سفر کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔" اسد نے سب سے بڑا دیا تھا۔

فائق سے ملنے کے بعد اسد ڈرائیور کے ہمراہ بہت سے خدشات دل میں سمیٹے سفر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ صحیح سلامت واپس آ بھی سکے گا یا نہیں۔ اسد نے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔

فیکٹری کی تعمیر کے متعلق کچھ لوگوں سے بات چیت کرنے کے لیے اسد نے آج اس دیہات میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا جو دانش صاحب نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا۔ کئی عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر ڈرائیور اسد کو دیہات کی حدود میں لے آیا تھا۔ گاڑی کے پیچھے اب بچے بھاگ رہے تھے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا جس کسی گاڑی پر نظر پڑنے کی دیر ہوتی تھی بچے گاڑی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔

تین منزلہ حویلی کے ارد گرد گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسد حویلی کے اندر داخل ہوتا قرب پیشے ہوئے ایک بوڑھے شخص کے قہقہے نے اسے رککنے پر مجبور کر دیا۔

"ہا ہا ہا..... شکار خود شکاری کے پاس آ جائے تب شکاری شکار تو کرے گا۔ تو خود قتل گاہ کی طرف کھچا چلا آیا ہے۔ جا اندر اور دیکھ موت تجھے خوش آمدید کہنے کے لیے بیقرار ہے۔ اسی حویلی میں تیری اور تیرے باپ کی قبر بنی چاہئے۔ تجھے قسطوں میں موت ملے گی۔ اتنی آسانی سے وہ تجھے نہیں چھوڑے گی۔" وہ عمر رسیدہ شخص ان الفاظ کی ادائیگی کے بعد اب خاموش ہو گیا تھا مگر آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

حویلی میں قدم رکھتے ساتھ ہی اسد کی طبیعت بڑی بوجھل ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اسی دیہات کا رہائشی

تھا۔ وہ گھر سے اپنی بیوی کو بلا کر لے آیا تھا۔ دونوں نے مل کر اسد کے رہنے کے لئے کمرہ صاف کر کے چمکا دیا تھا۔ مہمانوں کے لیے مختص بستر کو بھی وہ دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

"صاحب جی ناشتہ میرے گھر سے آیا کرے گا۔" ڈرائیور تاج دین نے کھانے کی ٹیبل صاف کرتے ہوئے کہا جو کہ پہلے سے ہی فرنیچر کے ہمراہ حویلی میں موجود تھی۔

"میں بیوی بریک فاسٹ نہیں کرتا ہوں۔ ایک رس ہیں میرے پاس جب ختم ہوں گے تو منگوا لوں گا۔ بہت شکریہ آپ نے بہت مدد کی ہے میری بس ایک بات کا شکوہ ہے مجھے اور وہ آپ جانتے ہیں۔" اسد نے کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا تھا۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے صاحب جی اور جہاں تک سچائی سے آگاہی کی بات ہے تو وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا ہوں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ مجھے بڑے صاحب نوکری سے نکال دیں گے۔ میرے چھوٹے بچے میری زندگی ہیں۔ بڑے صاحب نے کہا ہے اگر میں نے آپ کو راز سے آگاہ کر دیا تو پھر اچھا نہیں ہو گا۔" تاج دین نے اتنا کہنے کے بعد سر جھکا لیا تھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ بہت مجبور ہیں۔ خیر اب میں یہاں آ گیا ہوں تو معلوم کر کے ہی جاؤں گا کہ اصل معاملہ ہے کیا؟ اس سوال کا جواب اب میں نے خود ڈھونڈنا ہے۔"

اسد کی نگاہ اب تیسری منزل کی جانب تھی۔ ڈرائیور تاج دین اپنی بیوی سرین کے ہمراہ اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اسد کو ہر جانب سے تنہائی نے گھیر لیا تھا۔ شام کے سائے گھرے ہو گئے تھے۔ حویلی کا صحن ٹہنی کا تھا جبکہ کمرے کے کچے تھے۔ نیچے پانچ کمرے، ایک کچن اور دو واش روم تھے۔

اتنی بڑی حویلی میں اس طرح اکیسے رہنا بڑی ہمت کی بات تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں روح کا بھیرا تھا جس نے آج تک کسی کو ایسے نہیں دیا

تھا۔ پانچ بار یہ حویلی دانش صاحب نے اپنے جانے والوں کو رہائش کے لئے دی تھی لیکن ہر بار ایسا خوفناک واقعہ پیش آتا کہ لوگ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

☆.....☆.....☆

”بھابھی اسد سے پچھلے چار گھنٹوں سے بات نہیں ہو پائی ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ نرینہ بڑی بے بسی سے گویا ہوئی تھی۔

”راجھا دو روز کے لئے نہیں گیا ہے میری پیاری ہیرا اس نے واپسی پر حویلی جانا تھا۔ اسد کہہ کر گیا تھا کہ میں سب کو بتا دوں۔ ابھی پچا جان کو بھی بتانا ہے میں نے۔ اس بار حویلی کا راز فاش ہونے والا ہے۔ اب کچھ وقت تک تمہارا خیال رکھنا میرا کام ہے۔“

صائمہ نے ہمت بیکار کرتے ہوئے کہا۔

”بھابھی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری صبح سے طبیعت خراب ہے اسد کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

نرینہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر دانش روم کی طرف تیزی سے بھاگی تھی۔

”ارے کیا ہوا نرینہ تے آرہی ہے؟“ گلنا ہے کوئی خوشخبری ہے۔

”نہیں بھابھی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس ذرا چکر آ رہے تھے میں کچھ دیر تک خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ نرینہ نے ٹاول سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے وضاحت دی تھی۔

”نہیں ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔ اسے میرا حکم سمجھو تم سے بڑی ہوں تو بڑا بہت حکم تو چلا ہی سکتی ہوں۔“ صائمہ نے ڈرائیور کو ہسپتال چلنے کا کہا اور عرینہ کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

عرینہ کے چپک اپ کے بعد وہی ہوا جو صائمہ نے بتایا تھا۔ جب عرینہ کی سماعت میں ماں بننے کی خوشخبری کی آواز آئی تو بے اختیار آنکھیں چمک چمک پڑی تھیں۔ آج ان خوشی کے آنسوؤں میں اسد کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”کون ہے وہاں؟“ اسد کو ایک لڑکی کا عکس صحن میں کھڑا ہوا دکھائی دیا تھا۔ پازیب کی آواز پوری حویلی میں گونج رہی تھی۔ تب ہی اچانک اسد کے پاؤں کسی کی مضبوط گرفت میں آ گئے تھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی کا سڑا ہوا ہاتھ ہے۔ جب اسد نے اپنا سر نیچے جھکایا تو اسکا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ طے ہوئے ہاتھ پر باقاعدہ پھوڑے لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ سے نکلنے والے خون نے مزید وحشت پھیلا دی تھی۔

اسد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی نے چھری کی تیز دھارا لے لے اسکا پاؤں کاٹ دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

”چچی جان اسد پچا کب آئیں گے۔ وہ ہمیں بہت یاد آتے ہیں۔“ صائمہ کی بیٹی نازیہ معصومیت سے گویا ہوئی تھی۔

”میری گڑباد کا رودہ جلد آ جائیں۔ میں تو خود بہت پریشان ہوں۔“ عرینہ نے بچھے دل کے ساتھ جواب دیا۔

”چچی جان اسد چاچو مجھے بے حد پسند ہیں۔ وہ ہی تو ہمارے ساتھ کھینٹے تھے اب گھر میں یوریت محسوس ہوتی ہے۔“ نازیہ کے بھائی حسن نے سامنے صحن میں پڑے ہوئے فلہال کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ان شاء اللہ اسد جلد واپس آ جائیں گے۔“ بچوں کو حوصلہ دینے والی عرینہ کا اپنا دل کرچیوں کی مانند ٹوٹ گیا تھا۔ کان اسد کی آواز سننے کے لیے ترس گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

اسد کے پاؤں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ درد کی لہر پورے جسم میں سوئی کی مانند چھ رہی تھی۔ وہ ہاتھ جس نے اسد کے پاؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ضروری اشیاء میں اسد اپنے ساتھ ادویات بھی لے کر آیا تھا۔ ڈبیول لگانے سے

جلن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تبھی اسد کی نظر ایک دوپٹے پر پڑی۔ وہ پکڑا دیکھنے میں صاف لگ رہا تھا۔ کونے سے کچھ حصہ پھاڑ کر اسد نے اپنے پاؤں پر باندھ لیا تھا۔ درد کی شدت میں جیسے ہی کچھ کی آئی اسد پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا تھا۔

صبح اسد جب نیند سے بیدار ہوا تو اسے سب سے پہلے اپنے پاؤں کی جانب دیکھا لیکن وہاں تو کسی بھی چوٹ کا نشان نہیں تھا اور نہ ہی وہ پکڑا دکھائی دے رہا تھا جسے اسد نے خود اپنے ہاتھوں سے زخم کے ارد گرد گرد باندھ رکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

”نرینہ بیٹی اسد کی کوئی خبر ملی ہے یا نہیں؟ شاید سگنل کا اینٹھوے کا ل نہیں ملتی ہے۔ آیا کیوں نہیں ہے ابھی تک؟“ دانش صاحب نے بنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ اسد حویلی گئے ہیں۔ میں تو خود اضطراب کے سبب رات سے جاگ رہی ہوں۔“

نرینہ نے بڑے ادب سے جواب دیا تھا اور آنسوؤں کو بہنے سے روک لیا جو بار بار پلکوں کی جھار سے باہر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”بہت ہی لا پرواہ لگا ہے۔ ایسی حالت میں تو تمہارے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ میرے لاکھ روکنے کے باوجود پانی من مانی کر رہا ہے۔“ دانش صاحب نے مختصر بات کی کمی حالانکہ وہ یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ اسد خود ہی اپنی جان کا دشمن بن گیا ہے لیکن عرینہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس کے سامنے کوئی ایسی بات کی جائے جو اس کی صحت کے لیے مضرت ثابت ہو کیونکہ کافی سالوں بعد وہ ماں کے مقام پر فائز ہونے جا رہی تھی۔ بس یہ ہی وجہ تھی کہ اسد صاحب اپنے غصے پر ضبط کر گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

نیچے صحن میں کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی اس لئے اسد آج پیکلی باریتیری منزل کی جانب آیا تھا۔ یہاں ایک چار پائی پہلے سے ہی موجود تھی جسے بچھا کر اسد نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ابھی مشکل سے

شوہر نے بیوی کو بچا لیا

چین میں ایک بیوی نے اپنے شوہر سے لڑائی کے بعد عمارت کی ساتویں منزل سے چھلانگ لگا دی لیکن شوہر نے ایسا کام کر دیا کہ حیران کن طور پر اس کی خودکشی کی کوشش ناکام بنا کر اس کی جان بچائی۔ میل آن لائن کی رپورٹ کے مطابق یہ واقعہ چین کے صوبے شانزی کے علاقے شی کوان میں پیش آیا جہاں کانگ نامی بیوی نے اپنے شوہر لیو سے جھگڑے کے بعد عمارت کی چھت سے کودنے کی کوشش کی۔ اس کا شوہر اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے چھلانگ لگا دی، لیکن اتفاق سے شوہر کے تیزی سے آگے بڑھائے گئے ہاتھ میں خاتون کی چوٹی (سر کے بال) آ گئے۔ رپورٹ کے مطابق شوہر نے بیوی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ نیچے لٹک رہی تھی اور اب بھی اپنے بال چھڑوا کر نیچے گرنے کی کوشش کر رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ مجھے چھوڑ دو، مجھے گرنے دو۔ یہ ماجرا دیکھ کر نیچے موجود لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی اور فوری طور پر 16 ہلکار وہاں پہنچ گئے جو کانگ کو واپس چھت پر لانے میں بہ بمشکل کامیاب ہوئے کیونکہ وہ اب تک شدید مزاحمت کر رہی تھی۔ پولیس کا کہنا ہے کہ وہاں نیچے ایک پانی کا بڑا پائپ موجود تھا، جس کے سہارے وہ بچ پائی۔ اگر یہ پائپ نہ ہوتا تو اس کا شوہر محض اس کے بالوں کے سہارے اتنی دیر تک اسے پکڑ کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

(العام ملٹی-راولپنڈی)

باغ منٹ ہی گزرے تھے کہ اسکو ایسا لگا کہ فرش پر کوئی کسی کو گھسیٹ رہا ہے۔ اس ڈر کو ہم کا نام دے کر اسد نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر وہ ہی آواز اسد کی سماعت سے نکلانی تھی سب کی بار اسکو یقین ہو گیا تھا کہ واقعی حقیقت میں ایسا ہو رہا ہے کچھ ثانیوں بعد وہ سڑی ہوئی لڑکی اسد کے سامنے آگئی تھی اور جس کو گھسیٹا جا رہا تھا وہ اسد کا چچا ارسلان تھا۔

”چھوڑ دو یہ کیا کر رہی ہو؟ میرے چچا تو کب کے وفات پا گئے ہیں۔“ اسد نے آج پہلی بار اس چڑیل سے بات کی تھی۔

”اسے سو بار مارو گی پھر بھی سکون نہیں ملے گا۔“ اس چڑیل نے اتنا کہنے کے بعد اسد کے چچا ارسلان کے چہرے کو اپنے لمبے ناخنوں سے لہو لہان کر دیا تھا۔ اسد نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور چند لمحوں بعد جیسے ہی آنکھیں کھولیں سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ اسکو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔

عرینہ نے سبیل فون ہاتھ میں تھام کر اسد کے نمبر پر کال کی تو اتفاق سے بیل جا رہی تھی۔

”آج سگنل کی بندش مہربان ہوئی مئی ہے ہم۔ اب میں کچھ اور دن یہاں سکون سے رہ لوں گا۔“ گیمبی ہو حسین لڑکی؟“ اسد نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”بہت بری ہوں۔“ عرینہ نے روتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

”ارے یار تم نے اگر رونا بند نہیں کیا تو پھر میں تمہیں بھی اسی بھوت جنگلے میں لے آؤں گا۔“ اسد نے عرینہ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مذاق کیا تھا۔

”آپ باپ بننے والے ہیں۔“ عرینہ نے اسکو بہت بڑی خوشخبری سنائی تھی۔

”شکر اللہ میں بہت زیادہ خوش ہوں مائی بیوٹی فل وانگ۔ اپنا خاص خیال رکھو۔“ اسد نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ سبیل فون اچانک بند ہو گیا

تھا۔ اسد نے پھر سے سبیل فون آن کر کے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اب پھر سے سگنل پر اہم شروع ہو گئی تھی۔ اسی دوران اسکو حویلی کے قریب موجود قبرستان سے رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ آواز میں اتنا درد تھا کہ اسے سنتے ساتھ ہی اسکو اپنے سر میں درد کی لہر محسوس ہوئی تھی۔

اسد حویلی کے مین گیٹ سے باہر نکل کر اب قبرستان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ آواز اب بھی قبرستان میں سے سنائی دے رہی تھی۔ اسد کچھ قبروں کے بیچ میں سے گزرنے کے بعد اب قبرستان کے وسط میں کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ قبروں کے قریب وہ جلی ہوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جسے اسد حویلی میں دیکھتا تھا۔ ایک قبر پر سیکنے بی بی اور دوسری قبر پر چاچا کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ لڑکی جو سر سے پاؤں تک جلی ہوئی تھی اپنا سر گھٹھوں پر رکھ کر اب تک رورہی تھی۔ اسکو احساس ہو گیا تھا کہ یہاں آکر اس نے بہت بڑی غلطی کر لی ہے۔ ابھی اسکو واپس جانے کے لیے تھوڑا آگے بڑھا ہی تھا کہ اس چڑیل نے اسد کی گردن کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ اسد نے اس چڑیل کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت کو اپنی گردن سے بنانا چاہا لیکن ناکام ہو گیا۔ وہ جلی ہوئی چڑیل اسد کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”تمہارا چچا لاوارثوں کی موت مرا تھا۔ قبر نصیب نہیں ہوئی تھی اسے۔ تمہارے باپ کا ان جام بھی اچھا نہیں ہوگا میں تم سب کو مار ڈالوں گی۔“ وہ جلی ہوئی چڑیل یہ کہتے ہی غائب ہو گئی تھی۔

اسد پیچھے مڑے بغیر حویلی میں آگیا اور سوچتا ہی رہ گیا کہ ارسلان چچا نے اس کا کیا گناہ ڈالا تھا۔

اگلی صبح ڈرائیور تاجدین گھر کا بنا ہوا ناشتہ لے کر حویلی میں آگیا تھا۔

”صاحب جی آپ تو بہت کمزور لگ رہے ہیں۔ اب روز کھانا میرے گھر سے آیا کرے گا اور آپ کی گردن پر یہ سرخ لکیریں کیسے پڑ گئی ہیں۔ کیا ہوا صاحب جی؟“ تاجدین نے گفتیش کا اظہار کرتے

ہوئے کہا۔

”یہ پانچ ہزار روپے اور دیکھو انکار مت کرنا نہیں تو میں باہر سے ہی کھالیا کروں گا اور جہاں تک بات اس نشان کی ہے تو میں بس اپنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیکینہ بی بی اور چاچا دید یہ دونوں لوگ کون تھے؟ اس نشان کا تعلق اسے سے ہے اسد نے تاجدین کے ہاتھ پر پیسے رکھتے ہوئے ایسا سوال واقفا تھا جسے سنتے ساتھ ہی تاجدین حیران و پریشان ہو گیا تھا۔

”صاحب جی یہ دونوں میاں بیوی تو بہت سالوں پہلے ہی وفات پا چکے ہیں۔ کیا آپ قبرستان گئے تھے؟“ تاجدین نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ بری طرح جھٹک گیا ہے۔

”ٹھیک ہے تاجدین تم اب جا سکتے ہو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ اسد نے تاجدین کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے جانے کی اجازت دیدی تھی۔

☆.....☆.....☆

کیسے بھائی ہو تم چھوٹا بھائی موت کو گلے لگانے چلا گیا ہے اور تم یہاں سکون سے بیٹھے ہوئے ہو۔“ دانش صاحب فائق سے وضاحت طلب کرنا چاہ رہے تھے۔

”ڈیڈ اسد کہہ کر گیا تھا کہ اسکے پیچھے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔ اسد نے ہمیش ہی غریبوں کی مدد کی ہے۔ ضرور تمہندوں کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسد صحیح سلامت واپس آجائے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

فائق کی بات سے دانش صاحب کو حوصلہ ملا تھا لیکن یہ انسوں ستار ہا تھا کہ وہ دیہات میں نہیں جا سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

جوں ہی رات کا دوسرا پہر شروع ہوا اسکو پھر سے پازیب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”کون ہو تم؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔ یوں بھگنا چھوڑ دو۔ کسی طریقے سے اپنی کہانی مجھ تک

پہنچاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“ اسد نے یہ سب تیسری منزل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اصل گڑبڑ وہیں ہے۔ پازیب کی آواز آنا بند ہو گئی تھی لیکن ہوا میں مسلسل سرگوشی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی لڑکی سسکیوں کے ساتھ رورہی تھی۔

اگلی صبح اسد حویلی کے باہر ایک اجنبی عورت نظر آئی جس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ اسد نے آنے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا وہ دونوں اسد سے ہی ملنے آئے ہیں۔ اسد دونوں کو حویلی کے اندر لے آیا تھا۔

”میں نورین کی دوست ملائکہ ہوں اور یہ میرے شوہر کا مران ہیں۔“ اس عورت نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

”کون نورین؟“ اسد نے الفاظ پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”نورین وہ لڑکی ہے جسے آپ کے چچا ارسلان نے اپنے دوستوں کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اسی حویلی میں زندہ جلا دیا تھا۔ نورین دیہات کی سب سے حسین لڑکی تھی۔

ارسلان کی بری نظریں نے محسوس کی تھی اور مجھے بھی بتا دیا تھا کہ اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم لڑکیاں اپنی ایک کنبلی کی شادی سے واپس آرہی تھیں بھی ارسلان اپنے بدمعاش دوستوں کے ہمراہ جیب پر آیا اور نورین کو اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے تمہارے گھر کے گیٹ پر بہت بار دستک دی لیکن تمہارا ابا جانتا تھا کہ میں کیوں آئی ہوں۔ میری کسی نے ایک نہیں سنی۔

میں نے ہر شخص کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جو مدد کر سکتا تھا لیکن اس دن تو جیسے سب کو سانپ سوگھ گیا تھا۔ حویلی کی پچھلی طرف میری پھولوں جیسی خوبصورت دوست کی جلی ہوئی لاش ملی تھی۔ محض ایک سال بعد تمہارا چچا ارسلان جب انہی دوستوں کے ہمراہ پہاڑی مقام تک سیر کرنے گیا تو وہ ہی جیب کھائی



ایک طویل عرصہ تک میں اس انتظار میں رہا کہ ہو سکتا ہے کہ رخسار کو میرا بچوں کا کچھ خیال آجائے اور وہ میرے پاس آجائے مگر ایسا نہیں ہوا۔

یہ کہانی جو میں آپ کو سنارہی ہوں حقیقت پر مبنی ہے یہ واقعہ میرے خالو کے دوست کے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ جوان تھے اور تنہا زندگی کے سفر پر رواں دواں تھے۔ رب کائنات کے بہت سارے راز انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں جس میں ماورائی مخلوق بھی شامل ہے کبھی کبھار انسان کا واسطہ ان ماورائی مخلوق سے پڑ جاتا ہے جسے سن کر اور دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان ناقابل یقین کے کھنور میں غوطہ زن رہتا ہے۔

اس کہانی کی ابتداء ساٹھ سال پہلے ہوئی۔ آئیے کہانی کی روداد خالو کے دوست کی زبانی سنئے

میں نے ایک کرائے کے مکان کی ضرورت تھی۔ ماں باپ ایکسٹرنٹ میں ہلاک ہو چکے تھے۔ اس وقت میری عمر بیس سال تھی۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے یکدم بے سہارا ہو گیا۔ پھر میرے ماموں جان میرے پاس گھر آ کر رہنے لگے۔ انہوں نے مجھے اتنا پیار و محبت دیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں، میں اپنے والدین کو بھول گیا اور ماموں کو میں نے اپنا مضبوط سہارا سمجھ لیا، ان کی ذات میرے لئے بڑی مقدم تھی۔ مگر ان کی پس پشت کی چال بازیوں سے ناواقف رہا، ہوش اس وقت آیا جب انہوں نے مجھ سے کورٹ کے ایک کاغذ

میں گر گئی جس پر سوار ہو کر وہ نورین کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ تینوں کی لاش نہیں ملی بس جیب کے کچھ حصے ملے تھے جس سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ تینوں ابدی نیند سو چکے ہیں۔ ہو سکے تو اپنے والد کو سمجھا کہ سب کے سامنے لے آئیں۔

انہوں نے ہی یہ خبر مہرور کی تھی کہ نورین نے خودکشی کی ہے حالانکہ یہ نکل تھا لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا گیا تھا۔

نورین کی والدہ چند دنوں بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں والد بھی زیادہ عرصہ جی نہیں سکے۔ نورین اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی یوں ایک خوشحال گھرانہ موت کی چادر اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ ملائکہ کی بات سننے کے بعد اس کو بے حد افسوس ہوا۔ آج اسے وہ گہرا راز معلوم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے نورین کی روح اس حویلی میں بندھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم واپس آ گئے ہو۔ میرے پیارے بیٹے یوں اس عمر میں مجھے تنہا کیوں چھوڑ گئے تھے؟ تمہیں تو معلوم ہے تمہارے بغیر مجھے یہ گھر بہت دیران لگتا ہے۔ دوبارہ ایسا مت کرنا۔“ دانش صاحب اسد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے گویا ہوئے تھے۔

”اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی تب آپ کو معلوم ہوتا کہ اگر بیٹی کی عزت کا جنازہ نکل جائے تب کتنی اذیت ملتی ہے۔ زندہ انسانوں کا شمار مردوں میں ہوتا ہے۔ اگر میری بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے پھر جلا دے تو کیا آپ ایسے شخص کو معاف کر دیں گے؟ اسد کا موڑ بے حد خراب تھا۔

”میرے بیٹے مجھے معاف کر دو اللہ نہ کرے تم پر کبھی اتنی کٹھن آزمائش آئے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں کل ہی تمہارے ساتھ دیہات جا کر سب کو جمع کر کے معافی مانگوں گا۔ بتا دوں گا کہ اس رات جو ہوا اس میں نورین بے قصور تھی۔“ دانش صاحب

☆☆

گھر کا دروازہ راتوں رات دیوار سے بند کر دیا گیا

دیوار بنانا اور وہ بھی کسی ایسی جگہ جہاں سے کوئی روزانہ ہی نہیں بلکہ دن میں کئی بار گزرتا ہو آسان کام نہیں ہوتا مگر جرمی میں ایک شخص کے گھر کے دروازے کے سامنے راتوں رات دیوار چن دی گئی بتایا گیا ہے کہ جرمی کے علاقے آف ٹینج کے رہائشی ایک شخص نے صبح اپنے گھر کا داخلی دروازہ کھولا، لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران و پریشان رہ گیا کہ اس کے گھر کے مرکزی دروازے کے آگے ایک نئی ٹوبلی اینٹوں کی دیوار کھڑی تھی۔ پولیس کے حوالے سے بتایا گیا کہ وسطی جرمی کے ضلع آف ٹینج کے علاقے میں ہاؤس میں ایک شخص کے گھر کے مرکزی دروازے کے باہر دیوار بنانے والے شخص کی شناخت نہیں ہو سکی۔ رپورٹ کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس دیوار کو رات کے اندھیرے میں منٹوں میں تعمیر کیا گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کیوں تعمیر کیا گیا، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار کسی ناول سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہو۔ پولیس ترجمان نے جرمی کی مقامی نیوز ویب سائٹ مسینشو کو بتایا کہ دیوار کھڑی کرنے کے باعث جانیداکو تقریباً 500 پوروز کا نقصان پہنچا اور پولیس یہ کام کرنے والے شخص کو تلاش کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ان کا کہنا تھا کہ یہ شخص دیوار برلن کی یاد دلاتی ہے، جسے بہت جلد تعمیر کیا گیا تھا۔ پولیس کا مزید کہنا تھا کہ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ جرم ہے۔

(چوہدری عبدالجبار: ساہیوال)

معمول تھا کہ میرے لئے صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا لے کر آتا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن میں اندرونی طور پر بڑا ہی شرمندہ تھا کہ روزانہ احتشام میرے لئے تکلیف اٹھاتا ہے اور میرے کہنے پر وہ جواب دیتا۔

”ارے اس میں تکلیف اور تکلف کی کیا بات ہے میرا گھر تو بالکل سامنے ہے اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دیتا.....“

”پھر بھی یار روز روز تکلیف کرنا اچھا نہیں لگتا بہر حال اس کے لئے شکریہ“ اور پھر احتشام نے لان میں کئی میریخت کو سراہا اور بہت خوش ہوا۔

شب وروز کے معمولات چلتے گئے اور اس درمیان کوئی قابل توجہ بات سامنے نہ آئی مگر ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ کہ میں جب بھی کام کر رہا ہوتا تو یکدم ہی ایک عجیب سی دلکش مسحور کن بھینسی بھینی خوشبو مجھے محسوس ہوتی جیسے کوئی پرفوم لگا کر میرے پاس سے گزرا ہو۔ یہ واقعہ میری سمجھ سے باہر تھا کچھ دن تو میں جان بوجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔

ایک روز رات 2 بجے جب میں کام کر رہا تھا کیونکہ یہ آرڈر کا کام مجھے دینا تھا ایک میٹھ کے دامن، گلے اور بازو پر کڑھائی کرنا تھی جو کہ صبح تک مکمل کر کے دینی تھی جب میں میٹھ کے دامن پر موتی ٹانگ رہا تھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اپنا دوپٹا ہوا میں لہرایا ہو۔ دوپٹے کا لمس میں نے روشنی میں واضح طور پر میٹھ کے دامن پر پڑتے دیکھا جیسے کسی نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر اپنا دوپٹہ ہوا میں لہرایا ہو اس کے ساتھ ہی وہی مسحور کن خوشبو میرے چاروں طرف پھیل گئی، میں نے یکدم ہی پیچھے مڑ کر دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہ آیا اور میں نے اسے اپنا دوپٹہ سمجھ کر جھٹک دیا اور پھر دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا مگر دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اب میں اسے اپنا دوپٹہ خیال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کل شاید تنھن کی وجہ سے یہ بات وہم سمجھ کر بھلا دی تھی مگر اب میں ہوش و حواس میں تھا رات میں

بھگتن بغل میں جھاڑو دبا کر چلی آئی اور شرواب شرواب کر کے اس نے خاک اڑائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جھاڑو سے تمام سوکھے پتے نیکجا کر لئے اور ادھر ادھر پھیلا ہوا بے کار سامان ایک کونے سے لگایا۔ ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی بائلی اور کھجی کے دو خالی ڈبوں کو اچھا کر کے برآمدے کی چھت پر پھینک دیا۔

میں چچا جان کی اس مہربانی پر مشکور ہوا مگر پھر بھی دل مطمئن نہ ہو سکا۔ بہر حال مرنا کیا نہ کرتا مصداق کے صبر شکر کر کے اس جگہ کو اپنا مقصد سمجھ کر رہنا شروع کر دیا۔ میں نے بڑی محنت سے اس دم توڑتی دلدل بنی کیاری کو درست کیا۔ پانی کی موٹر سے مسلسل رستے پانی کی روک تھام کے بعد اب دوبارہ اس داستان عبرت بنی کیاری کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جس کی منڈیر تباہ حال ہو رہی تھی میں نے از سر نو کیاری کو کھود کر اس میں تازہ کھاد ڈالی، نئے بیج ڈال کر نئے پودوں کی آبیاری کا بندوبست کیا۔ سرخ پتھروں کی منڈیر سے کیاری کو خوبصورت ہو گئی اب کچھ ہی دنوں میں یہاں گلاب، موتیا، گل داؤدی اور گل مہر کے پودے لہلہا رہے ہوں گے یہ تصویر ہی میرے لئے خوش گن تھا اس کے بعد میں نے کمروں کی طرف توجہ دی کمرے دو ہی تھے جو کہ کافی کچلے اور کساد تھے لمبڈ ہاتھ کی بھی سہولت تھی ایک کمرے کو میں نے بیڈ روم بنالیا اور دوسرے کو دیکھ کر کام کے بارے میں سوچنے لگا۔

دراصل زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا اس لئے خواتین کے کپڑوں پر گونا گوی اور ستارہ کا کام کرتا تھا کام کے لئے مجھے دوسرا کمرہ موزوں تھا اور پھر میں نے روزمرہ کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا روزانہ کا ایک معمول بنالیا یعنی صبح سے شام تک کام کا وقت مقرر کر لیا صبح سے شام تک ایک ہی جگہ بیٹھ کر متواتر کام کرنا بڑا تنھن ہوتا ہے اور پھر اگر ایک سے دو یا پھر کئی ہوتے ہیں تو کام کے ساتھ ساتھ کپ شپ بھی ہوتی ہے جس سے وقت کٹنے کا احساس نہیں ہوتا ورنہ ہی کام کی زیادہ تنھن محسوس ہوتی ہے احتشام کا یہ روز کا

پر دستخط کروا کے مکان اپنے نام کروالیا اور پھر چند ماہ کے بعد مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔

میں بے یار و مددگار مصیبتوں کے پہاڑ تلے آ گیا۔ کیا کرتا کہاں جاتا، آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس پریشانی کے عالم میں، میں اپنے بچپن کے دوست احتشام کے پاس چلا آیا اور اسے ساری کہانی سنا ڈالی اور اپنی مفلوک الحالی اس کے سامنے رکھی وہ بڑا دھی ہوا اور پھر میری مدد کے لئے تسلی دی۔ میں نے کہا۔

”مجھے کرانے کا مکان چاہئے جس کا کرایہ مناسب ہوتا کہ میں آسانی سے ادا کر سکوں۔“

احتشام اور میں دو تین اسٹیٹ ایجنسیز کے دفتر پہنچ گئے مگر ان کی دانست میں کوئی مکان نہیں تھا۔ پھر احتشام نے مجھ سے کہا۔

”میرے چچا کا ایک مکان ہے جو کہ کافی عرصے سے بند پڑا ہے اب وہ اسے کرانے پر دینا چاہتے ہیں مگر کافی مدت سے بند رہنے کی وجہ سے لوگ اس کو کرانے پر لینے سے ڈرتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ زیادہ عرصہ مکان بند رہنے کی صورت میں بدرومیں، چڑیلیں وغیرہ گھر میں بھرا کر لیتی ہیں اس لئے کوئی اس گھر میں رہنے کو تیار نہیں، ہاں اگر تم کہو تو میں چچا جان سے بات کروں۔“

میں ویسے بھی جن بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا اس لئے میں نے کہا ”پلیز تم کسی بھی طرح یہ مکان دلاؤ۔“

اگلے دن احتشام نے مکان کی چابی لا کر مجھے دے دی۔ مکان باہر سے جتنا خستہ حال تھا اندرونی طور پر اتنا ہی بہترین تھا مگر لان اور برآمدہ پکار پکار اپنی ناقدری کی شکایت کر رہا تھا۔ لان میں صرف چند ایک سوکھے مرجھائے ہوئے پودے خزاں رسیدہ حالت میں نظر آ رہے تھے۔ روش پر پھر سے سوکھے پتے میرے قدموں تلے چرامر کر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ میں اس وقت بہت خاموش سا پچھلے آگن میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک طرف سے ایک تومندی

دو پہنہ لہرانے کے علاوہ میں نے پائل کی آواز بھی واضح طور پر سنی تھی پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا ہر مرتبہ مجھے محسوس ہوتا کہ میرے پیچھے کوئی ہے مگر مرکز دیکھنے پر کوئی نظر نہ آتا اب تو میں بھی پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہ ماجرا کیا ہے پھر میں نے سوچا کہ احتشام سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

ایک دن احتشام کو میں نے ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور پھر ہم دونوں اس مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے۔ ”اچھا مسلمان کل اس مسئلے کا حل تلاش کریں گے دراصل مجھے ایو جی کی دوائیاں لینے جانا ہے“ اور احتشام کے چل جانے کے بعد میں بھی گھر واپس آ گیا۔ اگلے دن احتشام میرے پاس آیا اور لان کو تو صوفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے باغیچے کو نئی زندگی دینے میں سارے اخراجات اپنی جیب سے برداشت کئے تھے اور اب لان بہت خوبصورت لگ رہا تھا ہر قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے کافی دیر تک تو احتشام نے ان کی تعریف کی۔ میں چائے بنا کر باہر ہی لے کر آ گیا چائے پینے کے دوران ہم باتیں کرنے لگے۔

احتشام نے کہا ”ہر مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر تمہیں کوئی نظر نہیں آتا حالانکہ دوپٹے کا عکس تمہیں واضح طور پر نظر آ رہا ہے جیسے کوئی نا دیدہ ہستی دوپٹے کو ہوا میں لہرا رہی ہو اب اگر تمہیں دوبارہ دوپٹے کا عکس نظر آئے تو تم پیچھے مڑ کر مت دیکھنا بلکہ عکس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کو پیچھے کی سمت کر کے دوپٹے پکڑنے کی کوشش کرنا کیونکہ تمہارے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے جو کوئی بھی ہے وہ غائب ہو جاتی ہے۔“ اتنا تو طے تھا کہ دو پہنہ لہرانے والی ہستی لڑکی ہے میں اس بات کے لئے رضامند ہو گیا کیونکہ میں شروع سے ہی نڈر اور بہادر واقع ہوا تھا۔

دن گزرا اور رات کا تسلا ہر طرف ہو گیا۔ میں نظاہر کام میں مصروف رہا لیکن دل و دماغ میں ان دیکھی ہستی میں الجھا رہا جیسے ہی گھڑی نے رات کے

بارہ بجائے تو مجھے وہی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی میں فوراً الارٹ ہو گیا درجسے ہی میں نے لہراتے دوپٹے کا عکس دیکھا تو اچانک ہی پیچھے ہاتھ کر کے دوپٹے کی تلاش کیا اور یہ کیا میرے ہاتھ میں دوپٹہ آئے ہی بلکی سی سترنم وکٹس نسوانی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا میں نے آج تک اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ انسان ہرگز نہیں ہے مگر کیا کیا جائے اس دل کا جو پکلی ہی نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

”مجھے میرا دوپٹہ واپس کر دو۔“ اس کی لرزتی ہوئی آواز میں کی گئی التجا مجھے واپس ہوش میں لے آئی۔ ایسا لگا کہ جیسے کہیں دور گھنٹیاں بج اٹھی ہوں یا جیسے کسی نے سر کے تار پھیر دیئے ہوں۔ ”میرا دوپٹہ واپس کر دو۔“ اس نے دوبارہ التجا کی میں نے اس کی التجا کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اس سے برجستہ کہا ”تم مجھ سے شادی کرلو“ وہ ہکا بکا رہ گئی، میں نے دوپٹہ اپنی بغل میں دبا رکھا تھا اس پر وہ کچھ نہ بولی اور عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے غائب ہو گئی۔

وہ مسلسل چھ روز تک میرے پاس آئی ”مجھے میرا دوپٹہ واپس کر دو“ مگر میں نے ہر روز اسے شادی کا کہا۔ بالآخر ساتویں دن وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی ”میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں“ میں نے اسے کہا ”تم کل آنا۔“ میں نے احتشام کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ مگر وہ مجھے الٹا سمجھانے لگا ”مسلمان تم جانتے ہو کہ وہ انسان نہیں ہے“ مگر میں نے کہا ”ہاں مجھے پتہ ہے کہ وہ انسان نہیں ہے“ مگر میں بھی اس سے ہی شادی کروا کر تم نے میرا ساتھ دینا ہے تو دو درنہ مجھے نصیحت نہ کرو“ میں یکدم ہی غصے میں آ گیا۔ بہر حال جیسے تیسے کر کے میں نے احتشام کو اپنا ساتھ دینے پر رضامند کر لیا اور اسی رات وہ مولوی کو لے کر آ گیا مولوی صاحب لڑکی کو دیکھ کر چونک سے گئے کہا تو کچھ نہیں مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے

ہوئے نکاح پڑھا کر رخصت ہو گئے۔

بہر حال وقت گزرتا گیا اور میں یہ بھی بھول گیا کہ میری بیوی کی حقیقت کیا ہے اس راز سے صرف احتشام واقف تھا۔ اس نے میری محبت میں پھر کبھی اور کے سامنے اس بات کو اپنی زبان پر نہیں لایا۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنی مسرت بھری دنیا میں مگن رہنے لگے میں اسے پیار سے رخسار کہتا تھا رخسار بھی مجھ سے پیار کرتی اور کسی بھی لمحہ کسی شکایت کا موقع نہ دیتی ایک سکھڑ اور وفا شعار بیوی نظر آتی مگر یہ کہ رخسار روزانہ رات کو مجھ سے اپنا دوپٹہ منگتی مگر میں اسے ٹال جاتا ایسے ہی وقت گزرتا گیا اور اس دوران میں دو بچوں کا باپ بن گیا مگر رخسار اب بھی اپنا دوپٹہ نہیں بھولی وہ ہر روز رات کے وقت مجھ سے اپنے دوپٹے کا مطالبہ کرتی مگر میں باتوں باتوں میں اس کے مطالبے کو ٹال جاتا اور وہ مسکرا کر اپنی والہانہ محبت و چاہت کا انداز اپنا کر مجھ پر فریضہ ہو جاتی اور اس طرح ہر آنے والی رات میں اس کی چاہت میں گرجو جی بڑھتی رہی۔

میں بھی اس سے بے انتہا چاہنے لگا تھا اور اس کے بغیر جینے کا تصور ہی میرے لئے سوہان روح تھا وقت گزرتا رہا اور میں تین بچوں کا باپ بن گیا میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو پا کر بہت خوش تھا مجھ پر بڑھانے کا سایہ بڑھتا جا رہا تھا شکل سے بھی زیادہ عمر جھلکنے لگی تھی اور پھر سر کے سفید بال پکار پکار کر زیادہ عمر کی گواہی دینے لگے تھے۔ رخسار پر حالانکہ عمر کا زیادہ اثر نہ ہوا تھا مگر پھر بھی گزرتے ماہ و سال اس پر زیادہ نہیں تو کم اثرات ضرور چھوڑ گئے اب میں اپنی بیوی بچوں میں بہت خوش تھا اب بھی رخسار ہر روز رات کو دوپٹے کا مطالبہ کرتی اور میں اسے ٹال جاتا۔ ایک روز آئینہ دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اب آدھی سے زیادہ زندگی گزر گئی ہے اور پھر میرے دل میں رخسار کی خواہش کا خیال آیا کہ وہ روز رات کے وقت دوپٹہ کا مطالبہ کرتی ہے اور میں کتنا سکھور ہوں کہ اس کی ادنیٰ سی خواہش کا احترام نہیں کرتا۔ اب رخسار دوپٹہ لے کر

کیا کرے گی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب اس کے مانگنے پر دوپٹہ اسے دے دوں گا۔ ہم اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور خوش و غرم زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک رات اچانک رخسار نے انداز دلبرائی سے اپنے دوپٹے کا مطالبہ کیا، وہ مجھ سے اپنا دوپٹہ مانگ رہی تھی اور پھر اسی رات میں نے اسے اپنا پرانا صندوق کھول کر دوپٹہ تمنا دیا یہ سوچ کر کہ اب رخسار بھی عمر کا طویل عرصہ گزار چکی ہے بھلا وہ میرے اور بچوں کے بغیر کیسے رہ سکے گی۔

مگر یہ کیا دوپٹہ دینے کی دہمچی کہ رخسار اور بچے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور میں حیران و پریشان کھڑا رہ گیا کہ یہ کیا ہو گیا اور پھر اچانک رخسار کی آواز آئی.....

”مسلمان جتنے عرصہ میں تمہارے ساتھ رہی تمہارے لیے شائد کچھ اہم بات ہو مگر میرے لئے یہ صرف 5-6 لمحے تھے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے اب میں واپس جا رہی ہوں“ اور اس کے ساتھ ہی آواز آئی بند ہو گئی۔ میں چپٹا چلاتا رہا بچوں کو آوازیں دینے لگا اور رخسار کو پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک میں اس انتظار میں رہا کہ ہو سکتا ہے کہ رخسار کو میرا بچوں کا کچھ خیال آ جائے اور وہ میرے پاس آ جائے اور نئے عہد و پیمان کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرے مگر ایسا نہیں ہوا نہ بچوں کی کوئی جھلک اور نہ ہی رخسار کی کوئی جھلک کبھی نظر آئی۔

اب میں عمر کے اس موڑ پر آ گیا ہوں کہ سوائے زندگی کے دن پورے کرنے کے کبھی کیا سکتا ہوں اور اس غم کو لئے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر جاؤں، اب میرا اگر کوئی دنیا میں سہارا ہے تو وہ میرا دوست احتشام ہے جو کہ اپنی دوستی کو نبھار رہا ہے اور آخری دم تک ساتھ دے گا۔

☆☆

جل پری

سائل دعا بخاری

چوتھی قسط

اس کا بے جان ہاتھ سختی سے جکڑ لیا ہوا میں گویا ہزاروں پاگل بدروجن شامل ہو گئی تھیں جو بلا کی اٹھانچ چائے جاتی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا گویا زلزلہ آ رہا ہو۔

وہ تقدیر تھی جو ہجر کو نوشتہ دیوار کر گئی تھی، وہ موت تھی، وہ وصل کا ہر خواب چھین کر نوح کر لے گئی تھی..... باقی اگر کچھ بچا تھا تو دیرانی..... خالی پن..... سو گاری.....

”سنو! تم کیا چاہتے ہو.....؟“ وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی تھی تو سو جھل بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”میں کیا چاہتا ہوں میرے چاہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے؟“ وہ لا جواب سی ہو گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔

”مم میرا مطلب ہے کہ پری زاد کو..... مطلب اس کی آخری آرام گاہ کہاں ہے.....“ وہ چونکا تھا وہ بری طرح چونکا تھا اسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ پری کو اس سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوتا ہے۔

ایک بار پھر پری کا چہرہ دھندلا گیا وہ آنسوؤں کی دھند تھی جو سو جھل کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔

”دور..... اس ظالم دنیا سے دور کی صحرائیں..... کسی ویرانے میں..... جہاں کوئی نہ ہو.....“ اس نے کہا تھا۔

تاحد نگاہ پھیلے صحرائیں روائے سو جھل کی خواہش پر اسے پہنچا دیا تھا رواجاتی تھی کہ کن لوگوں نے پری کی قبر تیار کی تھی۔ اور جنازہ بھی انہوں نے پڑھا یا تھا البتہ قبر میں خود سو جھل نے اپنی محبت کو اپنی زندگی کو دفنایا تھا کیا کوئی اپنے ہاتھوں سے ایسا کر سکتا ہے؟ لیکن اس

نے کیا تھا کیونکہ وہ بے حد مجبور تھا کیونکہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں اپنے پیاروں کو، جن کے بنا وہ زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کو خود اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دبا دیتے ہیں کیونکہ وہ مجبور ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا..... اور بات جہاں مجبوری کی آتی ہے تو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا سوائے بے بسی کے جولا چارگی سے ہاتھ ملتی دکھائی دیتی ہے۔

جوں جوں پری کے وجود کو مٹی اپنے اندر ڈھانچتی جا رہی تھی سو جھل کو لگ رہا تھا کہ خود اس کا اپنا وجود بھی منوں مٹی تلے دبنا جا رہا ہے۔ اس کا دل پاتال میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اسے سانس حلق میں پھنستی معلوم ہوتی تھی۔ پری کا چہرہ اوجھل ہو گیا..... اس کی بصارتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا تو وہ شدت غم سے خشک ریت پر گر گیا۔ محبت دفن ہو گئی تھی۔ اور محبت کے ساتھ ہی ہر آس بھی مر گئی تھی زندگی مر گئی تھی وہ خالی آنکھوں سے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اس کے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا کچھ بھی نہیں۔“

”کھانا کھا لو سو جھل۔“ ردا نے کھانا اس کے آگے رکھا۔

”بھوک نہیں ہے۔“ سو جھل نے ریت کے ٹیلوں سے نگاہ ہٹائے بنا جواب دیا تھا وہ ہر وقت ریت

کو خالی نظروں سے دیکھے جاتا تھا۔
”تم نے پوچھا نہیں سوچا! کہ میں کون ہوں اور.....“ روانے بات ادھوری چھوڑ دی۔
”بتا دو.....“ سوچل کا لہجہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔

ردا وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی میرے باپا میرے بچپن میں ہی لا پتہ ہو گئے تھے۔ ماں نے ہمیشہ مجھے ماں باپ دونوں کا پیار دیا۔ ہم اکثر انسانوں کے بھیس میں انسانی دنیا میں رہتے رہے یہ سردیوں کی بات ہے میں ایک دن بلی کے روپ میں پھر رہی تھی جب مجھے کچھ لوگوں نے پکڑ لیا اور فٹ بال کی طرح اچھالنے لگے پھر انہوں نے مجھے پختہ اینٹوں پر اچھال دیا جس سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی تب ایک الگ تھلک کھڑے لڑکے نے ان لوگوں کو سرزنش کی اور مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ لکڑی کے ایک ٹکڑے سے میری ٹانگ باندھ کر اس نے ایک پیالہ میں نیم گرم دودھ مجھے دیا تین دن میں اسی کے گھر رہی اور وہ مسلسل میری دیکھ بھال کرتا رہا جب میں بالکل ٹھیک ہوئی تو وہاں سے نکل گئی مگر میں اپنے بچپن کو بھول نہ سکتی تھی۔ میں اکثر غیبی حالت میں اس کے گھر چلی جاتی اور پھر وہاں سے دیکھتی رہتی بلال نام تھا اس کا۔“

”پھر ایک دن میں اس کے سامنے ظاہر ہو گئی اور اسے سب کچھ بتا دیا کہ میرا تعلق جنات سے ہے اور میں وہی بلی ہوں مختصر یہ کہ ہم اکثر ملنے لگے۔ یہ بات میرے قبیلے سے چھپی نہ رہ سکی اور میرے چچا نے مجھے سختی سے منع کر دیا جب میں نے بلال کو بتا دیا تو اس نے اپنے گھر والوں کو میرے خواب کے متعلق آگاہ کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کے گھر والوں نے فوراً انکار کر دیا۔“

”بہر حال ہم دونوں بہت دور چلے گئے لیکن..... اس بختے میرے چچا نے ایک عمل کے زور پر مجھے قید کر دیا اور بلال کو.....“ اس کی آواز بھرا گئی تھی وہ قدرے تو قف سے گویا ہوئی۔

”پھر میں اپنے قبیلے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی..... اس کے بعد جب بھی کوئی محبت کرنے والے کسی مشکل میں ہوں میں ان کی مدد ضرور کرتی ہوں..... تم سے غلطی یہ ہوئی سوچل کہ تم نے لگاتار کو آ ز اور دیا اسے میں نے بہت مشکل سے سے قید کیا تھا وہ میری پرانی دشمن ہے خیر جب وہ آزاد ہوئی تو حصار ٹوٹ گیا اور وہ گھر اور شیر کے لوگوں کی نظروں میں آ گیا میں اپنی طاقت بڑھانے کے لئے ایک چلہ کر رہی تھی جو مجھے سمندر میں رہ کر کرنا تھا۔ وہ درخت، جس پر پھول لگے تھے اس کے سرخ پھول یعنی محبت کے پھول گرنے کا مطلب تھا کہ تم دونوں سے کسی ایک کی موت..... جب وہ پھول گرے تو مجھے یہ چل گیا اور میں چلے تو ڈر آ گئی مجھے کچھ دیر اس لئے ہوئی تھی کہ میں چلے کے بیروں کے جال میں پھنس گئی تھی میں نے اپنی ساری طاقتیں جو میں نے مختلف چلوں سے حاصل کی تھیں ان سب میں تقسیم کر دیں اور آگئی تب تک پری مرچکی تھی اور شیر مرچکا تھا اور اس کے لوگ تمہیں مارنے والے تھے..... میں نے ان سب کے ہتھیار ناکارہ بنا دیئے اور انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔“ وہ چپ ہو گئی وہ جیسے تھک گئی تھی بولتے بولتے سوچل خاموش ہی رہا۔ اس کے پاس گویا اب بولنے کو بھی کچھ نہیں بچا تھا۔

اس نے رات کی تاریکی میں پھلے صحرا کے اندھے پن سے نگاہ ہٹا کر اپنی بے چراغ، پھیلی کوکھور تھا۔ کیا تھا اس کے پاس؟ کیا رہا تھا اس کے دامن میں؟ کیا بچا تھا اس کی زندگی میں؟ سوائے خالی پن کے..... جب اس کے پاس سب کچھ تھا اور جب ارد شیر سے اس کی لڑائی ہوئی تھی تب اس نے خدا سے سب کچھ ٹھیک رہنے کی کتنی دعائیں مانگی تھیں اور..... اور پھر جب اس کا گھر، اس کا شفیق باپ، اس کی محبت کرنے والی ماں، اس کے لاڈلے بہن بھائی، جب وہ سب جل رہے تھے تو اس نے اللہ سے کتنی مدد مانگی تھی اللہ جانتا تھا کہ اس کے سوا کوئی، کوئی بھی سوچل کی مدد نہیں کرے گا اس کے سوا سوچل کی مدد کوئی کر ہی نہیں سکتا پھر اس نے.....

پھر کیوں اس نے اس کی مدد نہ کی تھی؟ سوچل نے پھر بھی اس سے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔
پھر کھڑکی میں قید لگاتاری نے اسے اللہ کا واسطہ دیا تو اس نے اسے آزاد کر دیا۔ یہ سوچ کر اس کی مدد کی اللہ کو دوسروں کی مدد کرنا پسند ہے..... اور اس کا صلہ اسے کیا ملا.....؟ پری کی موت؟ اس نے اللہ سے مسلسل پری کی زندگی مانگی تھی۔

اللہ جو کہتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا جس کا فرمان ہے کہ جب کوئی بندہ مجھے پکارتا ہے تو میں کہتا ہوں ”بلک یا عبدی“ (میں حاضر ہوں میرے بندے) پھر؟ پھر اس کی ساری دعائیں کیوں خالی ہاتھ لوٹا دی گئی تھیں؟ اس کی پکار کا اللہ نے جواب کیوں نہ دیا تھا؟ اسے تو پتہ تھا نا کہ اسے پری کی کتنی ضرورت ہے۔ پھر اس نے کیوں.....؟ اسے اللہ سے بہت سی شکایتیں پیدا ہو چکی تھیں اور یہ محض سوچل کی حد تک ہی نہیں ہے، ہم سب کا رویہ تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے مگر۔

☆.....☆.....☆

وہ لوگ ناریل اور دیگر درختوں کے تنوں، چوں اور بیلوں کی مدد سے ایک جھونپڑی تیار کر چکے تھے، خوراک کا مسئلہ ناریل کے درختوں نے حل کر دیا تھا۔ اس جزیرے پر سوائے ان کے، کوئی ذی نفس تھا، نہ ذی روح..... انہیں یہاں آئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا مگر لگتا تھا کہ سالوں بیت گئے ہیں بھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وقت لگتا ہے، گویا خیم گیا ہے مگر حقیقت وقت گزر جاتا ہے زندگی رک جاتی ہے..... ایسا ان کے ساتھ بھی ہو رہا تھا..... وہ اکثر جزیرے پر بولائے بولائے پھرتے رہتے تھے سب کچھ رک رک کر سامحوس ہوتا تھا جزیرے پر چھوٹے بڑے گڑھے موجود تھے جن میں کچھ کو انہوں نے مزید گہرا کر لیا تھا ہر چند دن بعد ہونے والی بارش ان گڑھوں کو پانی سے بھر دیتی تھی جسے وہ پینے اور نہانے کے لئے استعمال کرتے تھے ڈیزی اکثر سمندر سے مچھلیاں اور سیپ وغیرہ پکڑ لاتا تھا

جن کو آگ پر بھون کر منہ کا ڈاکٹھ بدل لیا جاتا..... رومان اور سارہ چونکہ سیپ وغیرہ نہیں کھاتے تھے اس لئے وہ ان کے لئے مچھلیاں پکڑ لاتا جزیرے پر خاموشی کا راج تھا اور ویرانی کوان لوگوں کی آمد بھی نہ بھگا پانی تھی وہ شام کا وقت تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا سارہ پہاڑی پر ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی جوانی تاریکی کرکوں سمیت بحر اوقیانوس میں اترتا چلا جا رہا تھا اور درونک پانی کی تہوں میں ڈوبتے سورج کی تاریکی کرکوں سطح پر بکھری..... چل رہی تھیں..... مل کھا رہی تھیں.....

”کیا سوچ رہی ہو.....؟“ رومان اچانک آیا تھا۔

”ہم..... شران کو لینے آئے تھے اور خود.....“ اس کے حلق میں ٹھک سا بھر گیا نہیں، ہم یہاں سے نکل بھی پائیں گے یا یہیں مرجائیں گے۔“ اس نے اپنی نم آنکھوں کو رگڑا۔

”ایسا نہیں سوچتے، پتہ ہے ایک بار جب حضرت موسیٰ کی موت قریب تھی تب انہوں نے کوہ طور پر اللہ سے اپنی امت بنی اسرائیل کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے عصا کو پتھر پر مارو۔“

ایسا کرنے سے حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ تاحد نگاہ سمندر ہے مجھے یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت تو یاد نہیں مگر بہر حال..... اس سمندر میں شاید چھوٹی سی کوئی چٹان تھی اللہ نے اس پر عصا مارنے کا حکم دیا اور حضرت موسیٰ نے ایسا ہی کیا پتھر میں شکاف پڑا اور اس میں سے ایک کیڑا نکلا جس کے منہ میں سبز پتہ دبا ہوا تھا جسے وہ کھا رہا تھا۔

تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔ اے موسیٰ جب میں پتھر میں موجود اس کیڑے کو رزق پہنچا رہا ہوں..... تو۔“

”ارے سا رہ ایکیا ہوا تم رونے کیوں

لگیں.....؟“ اسے روتا دیکھ کر وہ بات ادھوری چھوڑ گیا۔

”ہم..... ہم انسان کس قدر ناشکرے ہیں نا اذرا مشکل پڑی اور فوراً اللہ کی رحمت سے مایوس ہو گئے۔“
 ”واقعی! جو رب پتھر میں کیڑوں تک کو رزق پہنچانا نہیں بھولتا وہ بھلا ہم کو کسی مشکل میں کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہے؟ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ اس کے ہم لہجے میں پختہ یقین بول رہا تھا..... اللہ کے مہربان، مددگار ہونے پر پختہ یقین کامل حدود کو چھوٹا ایمان۔“ انشاء اللہ رومان کا لہجہ بھی مستحکم تھا اور بڑی جوارو کچھ لیتا تھا ان کے لہجے میں بولنے استحکام اور یقین و ایمان کی پختگی پر دم بخود کھڑا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھول دیں ماہ شب کا ہاتھ ابھی بھی اس کی گرفت میں تھا۔ اس نے بڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھ کر اونٹناتے میں رہ گیا۔ وہ سمندر کی تہوں میں تھا ہاں بلاشبہ وہ سمندر کی تہ ہی تھی نیلگوں مائل سمندری گھاس، دیگر آبی پودے، پھلیاں اور دیگر آبی مخلوق..... اسے سنا کر دینے کو کافی تھیں پانی پر سکون تھا ماہ شب نیلگوں مائل گھاس جس پر سفید پھول جا بجا لگے تھے ایک پھلی جس کا اوپر نصف دھڑا انسانی تھا تیری ہوئی ان کے پاس آئی اس کے بے انتہا لہجے سنہری بال پانی میں بری طرح مل کھاتے تھے۔
 وہ دم بخود سادیکھے گیا۔

”کون ہو تم.....؟“ اس کی آواز پہ وہ گویا کرنٹ کھا کر کسی خواب کی سی کیفیت سے بیدار ہوا تھا۔
 اور اسی لمحے اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا وہ سمندر میں تھا مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ آزاد فضا میں ہولا زوم تھا کہ پانی اس کے پیچھے پیچوں میں داخل ہو کر اسے ہلاک کر ڈالتا۔ مگر وہ بالکل ٹھیک تھا، جب وہ بولا تو پانی میں بلبلے سے بننے لگے۔ اس نے اس کے سوال کو تسکین نظر انداز کر کے ماہ شب کو پکارا تھا۔ مگر اس کے سنا کہ وجود میں جنش تک نہ ہوئی تھی۔

”یہ میری پہلی عارضی طور پر۔“

وہ چمکی ملل لڑکی بن چکی تھی تاہم اس کے ناکافی لباس نے شمران کو نظریں چرانے پر مجبور کر دیا۔
 ”لگتا ہے آپ ان کو کافی.....“ لڑکی نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ شمران محسوس ہی نہ کر پایا اس کی دھڑکنیں تو ماہ شب کی موت کا سن کر ہی ٹھنک گئی تھیں اس کی بغض جیسے ساکت ہو گئیں۔
 ”یہ مر گئی؟ میرے اللہ.....“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور پانی کے چھوٹے چھوٹے سے بلبلے اسے ادھر اٹھتے چلے گئے۔
 ”انہوں نے تم کو بتایا نہیں کہ یہ ٹھیک کیسے ہوں گی؟“ لڑکی نے دریافت کیا۔ تب اس کے حواس سمٹ کر دماغ میں سا گئے اور اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”اگر ایک ماہ کے اندر تم نے مجھ پر آب حیات نہ ڈکایا تو میری عارضی موت، دائمی ثابت ہوگی۔“ اس نے بے قراری سے ہاتھ مسلے۔
 پھر لڑکی کو بتایا۔ ”وہ مجھے شیا گ قبیلے کے بارے میں کچھ بتانے والی تھی مگر.....“ اس نے حد درجہ تاسف سے بات ادھوری چھوڑ دی۔
 ”شیا گ قبیلہ.....“ لڑکی کا انداز پر سوچ تھا۔
 ”ہاں..... ایہ قبیلہ یا گ لائی کا مشہور ترین قبیلہ ہے اور کہتے ہیں کہ آب حیات ایک پھل کی شکل میں ان کے ہاں پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ جوان رہتے ہیں لیکن وہ لوگ مرکز بھی کسی اور کو اس کے بارے میں نہیں بتاتے۔“

”میں ہر حال میں آب حیات حاصل کروں گا۔“ اس کا لہجہ چٹانوں کا ساخت تھا جس میں اپنی عزم جھلکتا تھا۔
 ”تم کون ہو.....؟“ اس نے دریافت کیا۔

”میرا نام اجڑل ہے اور ماہ شب اور شاہ لبریز ہمارے پیشوا ہیں تم یوں سمجھ لو کہ جیسے تم مسلمان کسی مرید ہوتے ہو اسی طرح.....“ وہ غائب دماغی سے

بلا گیا۔

”م..... میں واپس کیسے جاؤں.....“ اس کا دل بے کیفیت میں دھڑک رہا تھا۔
 ”یہ تمہارے ہاتھ میں انگوٹھی ماہ شب ہی کی ہے“ شمران نے چونک کر اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی دیکھا جہاں تقریباً انگوٹھی میں نیلگوں مائل سبز پتھر لگا رہا تھا۔ یہ اسے یا گ لائی پر ماہ شب نے دی تھی۔
 ”ہاں.....“ اسے اپنی آواز کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”پھر کم از کم سمندر میں تو تم کو کوئی خطرہ نہیں۔ آؤ میں یا گ لائی تک چھوڑ آتی ہوں۔“
 وہ ابھی..... ”لیکن ماہ.....“ اس نے سنا کہ اس کی ماہ شب کو دیکھا۔

”یہ جب تک یہیں رہیں گی ان کی حفاظت ہم کر لیں گے۔ اے اللہ ماہ شب تیرے سپرد۔“ اس نے کہا اور اسے بیک احساس ہوا کہ اس انجمنی دنیا میں اس کیسے انجمنی دنیا میں کوئی ہے جو اس کے ساتھ ہے اس کا ”اپنا“ ہے جو ایک ایسا ”اپنا“ ہے جو اسے کسی بی حال میں کسی بھی صورت اسے تنہا نہیں چھوڑے گا اسے لگا کہ چاہے پوری دنیا اس کے خلاف ہو جائے اللہ اس کے ساتھ ہے اور جب ”وہ“ ساتھ ہے تو پھر کچھ ہے؟ اسے لگا کہ اب کوئی مشکل اس کے لئے ”مشکل“ نہیں رہی..... اس کا سینہ اللہ کی محبت اور ایمان کامل سے بھر گیا۔ نور سے بھر گیا.....
 ”میں ان سے بھر گیا..... اس سے قبل اسے ایسا یقین ایسا یقین بھی نصیب نہ ہوا تھا جب سب ساتھ چھوڑ دیتے اسے جب اللہ یاد آتا ہے اور جب اللہ یاد آتا ہے تو ہم بے اختیار اس کو پکارتے ہیں اسی کو جو واقعی مددگار ہے اور جب ہم اسے پکارتے ہیں تو یہ تو کسی صورت کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ ”اللہ“ ہماری پکار نہ سنے اور ہماری مدد نہ کرے۔ ہاں ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کو وہ آزمائش کے لئے چن لیتا ہے سو اگر ہم اللہ کے ہاتھ کا یقین رکھیں تو اس آزمائش میں پورا اثر سکتے ہیں

اس کے برعکس اگر ہم بے خبری کو اپنا شعار بنالیں واویلا کریں مشکلات کا رونا روئیں شکوے کریں تو ہمیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا ہمیں صرف ”اللہ“ سے مدد مانگنی چاہئے جو ہماری مدد کرنے پر قادر ہے اگر وہ نہ چاہے تو کوئی بھی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔
 ”یا اللہ حضرت محمدؐ کے صدے میری مدد فرما۔“ اس نے دعا کی وہ دعا جس کی قبولیت پر اسے ایمان کی حد تک پختہ یقین تھا۔
 ”آؤ.....“ اجڑل نے ہاتھ بڑھایا۔

”یا اللہ.....“ اس نے اللہ کو پکارا اجڑل کا سر د ہاتھ تھا ماہ ایک آخری نگاہ ماہ شب کے سناکت وجود پر ڈالی اور اجڑل کے ہمراہ کسی پھلی کی مانند اوپر تیرتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

میرے گناہ کیا تیری رحمت سے بڑھ گئے؟
 پھر کیوں میری دعاؤں سے تاثیر پہنچتی؟
 اس نے سلام پھیر کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے۔ ”یا اللہ! مجھے معاف کر دے، میں تیری ذات سے غافل تھا۔ میرے پاس فضول کاموں کے لئے تو وقت ہوتا تھا مگر نماز کے لئے نہیں، میں بس اتنا جانتا ہوں میرے اللہ کہ میرے گناہ ریت کے ذروں سے زیادہ سبکی پانی کے قطرہوں سے زیادہ سبکی، درختوں کے پتوں سے زیادہ سبکی، مگر تیری رحمت کے ایک بھی قطرہ سے زیادہ نہیں، تیری رحمت کا..... صرف ایک قطرہ میرے تمام گناہوں کی سیاہی دھو سکتا ہے یا اللہ آج اس دور میں ہم تیرے وجود کو تیری ذات کو فراموش کئے ہوئے ہیں مگر وہ ہونچکے ہیں میرے مالک! ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما! میں والدین کی اجازت کے بغیر آیا ہوں، مجھے اس کے لئے معاف کر دے اور..... اور میری مدد فرما..... مجھے یہاں سے جلد فارغ کر دے تاکہ میں جا کر امی اور بابا سے معافی مانگ سکوں۔“ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو آنسو اس کے رخساروں پر پھیل گئے ہم اللہ کی ذات سے غافل ہونچکے ہیں

تواناں ہمیں دکھ کی، درد کی، آزمائش کی، مصیبت کی
ٹھوکریں لگاتا ہے تاکہ ہم اپنے آپ کو، اپنی ذات کو اپنی
اوقات کو پیچھا میں غلط راستے پر چلتے ہوئے ہم سیدھے
راستے کو فراموش کئے ہوئے ہیں وہ شکر لگاتا ہے کہ ہم
سنجھل جائیں غلط راہ چھوڑ کر صراطِ مستقیم پر چلیں ان
لوگوں کا راستہ جو جھکے ہوئے نہیں تھے اور ہم وقتی طور پر
سنجھل جاتے ہیں اللہ کے قریب ہو جاتے ہیں اور جب
وہ مشکل دور گزر جاتا ہے تب ہم پھر گمراہیوں کی دلدل
میں دھتے چلے جاتے ہیں پھر مشکل پڑتی ہے ہم پھر خدا
سے رجوع کرتے ہیں وہ ہمیں مشکل سے نکالتا ہے ہم
پھر اس کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ پھر پریشانی پیش
آئے تو ہم ہر باریک طرح اللہ سے رجوع کرتے ہیں
پھر گناہوں سے توبہ اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد.....
مگر پھر بھول جاتے ہیں۔

حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ ”ایک شخص گناہ کرتا ہے اور گناہ کرنے کے بعد اس کے اندر پشیمانی پیدا ہوتی ہے وہ اللہ سے رجوع کر کے توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے مقررین ملائکہ سے پوچھتا ہے کہ یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! یہ شخص فلاں بن فلاں ہے اس سے گناہ سرزد ہو گیا ہے اب یہ تجھ سے معافی کا طلب گار ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ”اے فرشتو! گواہ رہنا، میں نے اس شخص کی خطا معاف کر دی، اس کی توبہ قبول کی، اسے بخش دیا اور اس کے درجات میں بلندی کر دی۔“ وہی شخص دوسرے دن پھر گناہ کرتا ہے احساس ہونے پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور توبہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر مقررین ملائکہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس نے پھر گناہ کیا ہے اور پھر تجھ سے معافی مانگ کر توبہ کا طالب ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرماتا ہے کہ فرشتو! گواہ رہنا میں نے آج بھی اس کی توبہ قبول کی اس کے گناہ معاف کئے اور اس کے درجات میں بلندی کر دی۔“ تیسرے دن پھر اس شخص سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور پھر احساس

اضطرابی تھی۔ چیتا مشتعل ہو کر شکار کے بیچ مداخلت کرنے والے کی جانب پلٹا اس کے کھلے جڑے سے جھانکتے خون آلود دانت لٹخ بھر کو شران کو ٹھٹھا کائے۔ چیتا غرایا اور اگلے پاؤں اٹھا کر اس پر چھپا..... اسی لمحے..... عین اسی لمحے ایک تیز سنسناتا ہوا آواز یاوردن چیتے کی گردن میں پیوست ہو گیا شران چند قدم پیچھے ہٹا تھا چیتے کی گردن سے خون ابل رہا تھا اور حلق سے نکلنے والی غرائشیں بڑی بھانک تھیں۔

بھی نہ لگوا سکا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے حلق سے زبان کے ہمراہ بری کا پتہ بھی کھینچ لے مگر ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس نے حواس سے بے گانہ پلوٹے کے وجود کو ٹھوکر ماری اور اسے زندان میں پھینکنے کا حکم دے کر چلا گیا جلد ہی اسے علم ہو گیا کہ سوجھل اور پر زناد جنگل کی سمت گئے ہیں اور پھر..... پر زناد مر گئی..... ارد شیر کی میت بھی گھر آ گئی اسے دفنانا بھی دیا گیا دوسروں کو زندگیاں سے محروم کرنے والا خود اپنی زندگی سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ زمین پر تکبر سے چلنے والا، زمین کے نیچے پڑا تھا۔ بلاول چاندیو مسمم ہو کر رہ گیا..... سارا انتظام صغیب چاندیو نے سنبھال لیا لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ صغیب اور ارد شیر میں کوئی خاص فرق نہ تھا یقیناً وہ کچھ عرصے تک ارد شیر کا خلا پر کردیتا ارب شہر میں ہاسٹل میں تھا پڑھ رہا تھا پلوٹے کو بھی بھول چکے تھے زینے ماں اور اینٹیں ماں بھی..... بلاول چاندیو بھی..... اور صغیب چاندیو بھی۔ صرف اربشے اور پری چہرہ تھیں جو کبھی بکھار اس کی خبر گیری کر لیتیں صدوری اسے کھانا وغیرہ دینے پر مامور بھی صرف پلوٹے تھی اور زنداں کی تنہائی اور تاریکی بھی اور کچھ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

چیتے کے دم توڑتے ہی ایک درخت سے کوئی نیچے کودا تھا۔ دھب کی آواز ابھری اور معدوم ہوئی۔ وہ ایک عورت تھی اس کی عمر کوئی بیس چونتیس برس رہی ہوئی چہرے کے نقوش قبول صورت سے اور گرلی آنکھوں میں شکر کی لہریں..... اس نے عجیب سے آواز میں کچھ کہا۔ ثمران اس کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ اس کا شکر یہ ادا کر رہی ہے۔ وہ جھاڑی کی جانب بڑھی اور جب واپس پلٹی تو اس کے شانے پر ایک گیارہ بارہ سالہ بچہ جھول رہا تھا اس کا دایاں کندھا خون آلود تھا اور بچہ بے ہوش تھا عورت نے ثمران کو اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا اس نے چند ٹاپے کو سوچا اور پھر قدم عورت کی تقلید میں بڑھادیے درختوں

پر پرندوں نے شور مچا رکھا تھا مگر اس کے باوجود ویرانی سی ویرانی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ چپ ہوا تو سارہ دم بخود ہی بیٹھی رہی..... جمو پڑی کی جامد فضا میں ان کے مابین خاموشی آن ٹھہری..... باہر سورج ڈوب رہا تھا..... اور جمو پڑی کی درندوں سے کرئیں جھانک رہی تھیں..... سوجھل کی آنکھوں میں سارے جہاں کی ویرانی سمٹ آئی تھی کچھ دیر قبل جہاں تاحہ نگاہ دھنک رنگ محبت کا بھیرا تھا وہاں اب خالی پن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے سوجھل کی آنکھوں میں کرئیں لیتے کرب سے گھبرا کر سر جھکا لیا۔ سوجھل نے تھک کر سر جمو پڑی کی پشت سے ٹکالیا۔ اس کے پرکشش چہرے پر صدیوں کی تھکن رقم تھی۔ آبا پاسافت کی اذیت اس نے اس کے چہرے پر پڑا گاڑ رکھے تھے۔ سورج اب غالباً ڈوب چکا تھا یا درندوں سے جھانکتی کرئیں راست بھول گئی تھیں۔

”تمہیں بھوک لگی ہوگی۔“ سوجھل نے کیا آنکھیں کھول دیں اور اس کی بات سے بنا باہر نکل آیا محض دو ڈھائی منٹ بعد وہ واپس پلٹ آیا کوئی اور ایلے چاولوں پر مشتمل کھانا اس نے سارہ کے آگے رکھ دیا اور خود پر زناد کی قبر پر جا بیٹھا اس کی خالی آنکھیں محبت کی قبر پر لڑی تھیں محبت مر گئی تھی مگر محبت زندہ تھی..... اور محبت کی یہ ”زندگی“ ہی تو اذیت دیتی ہے۔ یہی اچھا ہو جو محبت کرنے والوں کے ساتھ ہی محبت ہی مر جائے..... تاکہ مزید لوگ تو اس کے ہاتھوں نہ مرے۔ مگر۔

☆.....☆.....☆

وہ گھنے درختوں سے گزر رہے تھے جب اچانک ایک سرخ رنگ کا ناگ اچھل کر عورت کی جانب بھاگا اگر ثمران کو اس کا چھن کھیلنے میں لمحہ بھر کی بھی تاخیر ہو جائے تو عورت اس کا شکار بن چکی ہوتی سارکٹ کھڑی عورت تشکر اور ممنون انداز میں اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ چلے آئی اور اس بار اس کی چال میں ذرا ڈرا لڑکھراہٹ تھی اس

نے دیکھا کہ سامنے ٹکوں سے بنی ایک جمو پڑی تھی عورت اسی جمو پڑی میں داخل ہو گئی۔ اور نیچے پچھی گھاس پر بیٹے کو لٹا دیا اسے بچے کے پاس رکھنے کا اشارہ کر کے وہ باہر نکل گئی اس دوران وہ جمو پڑی کا جائزہ لیتا رہا جہاں چند منٹ کے برتنوں کے سوا کچھ خاص نہ تھا آہٹ پر اس نے سر گھما کر دیکھا عورت واپس آ گئی تھی اور اب وہ کوئی ٹکوں مائل مرہم بچے کے بازو پر لگا رہی تھی بے ہوش بچہ کسمایا..... اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا عورت پھر اسے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کے چلی گئی بچہ اس دوران سویا رہا اس باوجود عورت کی واپسی کا کافی دیر بعد ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے پتوں پر بھنا ہوا گوشت رکھا تھا جو وہ بڑی چاہ سے اسے کھانے پر معر تھی مگر اس کے پیش نظر حلال حرام کا مسئلہ تھا وہ بڑی مشکل سے اسے اپنی بات سمجھایا عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور جا کر ایک جنگلی بکری کو پکڑ لائی پھر اس نے ایک ڈول میں دودھ نکالا اور ثمران کو پیش کیا اس نے دودھ پی لیا اگرچہ اس کا ذائقہ کچھ مختلف تھا عورت اسے اپنے بارے میں بتانے لگی کہ اس کا شوہر پکا ہے اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اکیلی رہتی ہے پھر اس نے اشاروں ہی سے ثمران سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کس لئے آیا ہے؟ وہ اک طویل سانس لے کر رہ گیا اشاروں میں اپنی بات سمجھانا بہت مشکل تھا مگر اسے یہ کرنا ہی تھا کہ شاید وہ عورت سے شیانگ قبیلے تک اس کی رہنمائی کر سکتی۔..... وہ اسے بتانے لگا تب عورت نے اشارے سے کہا کہ وہ بات کرے، وہ اس کی زبان سمجھ سکتی ہے۔ کہ اکثر لوگ یہاں آتے رہتے ہیں تب وہ اسے مختصر بتانے لگا۔

ماہ شب اور شاہ لبریز کے ذکر پر عورت کے چہرے پر ہجرت انداز لیکن جب شیانگ قبیلے کی بات آئی تو اس کا چہرہ ہراس کی آماجگاہ بن گیا۔ اور آنکھوں میں دہشت نے ڈیرے ڈال لئے۔ اور اس کی بات کے جواب میں عورت نے جو کہا اس نے ثمران کو تنجب کر دیا وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ تم نے میرے بچے

کو اور مجھ کو بچا کر جو احسان کیا ہے، وہ بہت بڑا ہے مگر اس کے بدلے تم میری جان مانگو تو میں دے سکتی ہوں مگر شیانگ قبیلے کا کا پتہ نہیں بتا سکتی۔ ثمران اشاروں کی زبان بس اتنی ہی سمجھ سکا غالباً وہ کہہ رہی تھی کہ شیانگ قبیلے کا پتہ بتانے کی سزا موت سے بھی بھیا تک ہے وہ ساتھ ساتھ اس عجیب و غریب زبان میں کچھ بول بھی رہی تھی اسے اضطراب میں یا ذہنیں رہا تھا کہ ثمران اس کی زبان سے ناواقف ہے اس نے عورت کو چپ کر لیا اور کہا کہ وہ اسے مجبور نہیں کرے گا عورت پھر مگھورانہ انداز سے اسے دیکھنے لگی اس بار اس کی گہری آنکھوں میں ثمران کے لئے تشکر کے ساتھ ساتھ عقیدت بھی تھی پرندوں کی آوازوں کے علاوہ خاموشی کا عالم تھا۔

☆.....☆.....☆

موسم کے تیور جارحانہ تھے بجلی رہ رہ کر چمکتی تھی اور بادل گاہے بگاہے اسے دھمکانے کو غراتے تھے بجلی شرارت سے بادلوں کو آنکھیں دکھاتی پھر چمک کر نکل جاتی اور بادل پھر غرا کر اسے دبوچ لیتے۔ سرسراہٹ ہوا میں بین کرتی محسوس ہوتی تھیں احمر کھڑکی میں کھڑا باہر جھانک رہا تھا سارہ کی وہ آخری ویران نگاہ اسے نکوار کی مانند کاٹتی تھی اور اس کی داصف سے منگنی کے بعد خود اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ خود بھی سارہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ ہاں! اسی عام سی سارہ ارشد سے جس سے وہ ہمیشہ چڑتا تھا لیکن اس کے چڑنے کی وجہ ایک بہت خاص لڑکی زویا تھی اس کی کانچ فیلو دیا فہد..... جس کے فیشن جس کی ڈریسنگ اور جس کی پرکشش شخصیت کے چہرے پورے کانچ میں تھے لڑکے جس سے بات کرنے کے خواہاں تھے اور جو احمر ضیاء کی محبت کا دم بھرتی تھی ان کی محبت کے چہرے بھی جلد ہی ہونے لگے..... ہونٹنگ، روٹھنا منانا اور بھی کچھ..... وہ سبھی کچھ جو دو محبت کرنے والوں کے بیچ ہوتا ہے لیکن ایک شام..... بارہ جنوری کی اس شام کیا ہوا تھا؟ کیا اسے کچھ یاد کرنے کی ضرورت تھی..... نہیں؟ اسے سب

مستند ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین طب، ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت -/100 روپے

پیپٹائٹس اور علاج

(کالاریکان)

پڑھئے پیپٹائٹس کیوں اور کیسے ہوتا ہے، جگر کی ساخت، جگر کا اہم کام، یوریا بننے کا عمل، ناکارہ خون کے ذرات، مفید عضو، پیپٹائٹس اور کینسر، جنسی علامات، مرض کی وجوہات، قدرتی نظام، گردوں کا عمل، پیپٹائٹس اے، اور پیپٹائٹس بی، ایلو پیٹیتی اور ہومیو پیٹیتی علاج، پیپٹائٹس کا طبی علاج، دافع درد جگر، نسخہ دافع یرقان، نسخہ آلمہ، شربت انار، عرق کاسنی، نسخہ آب آہن، تاب، خشک انجیر سے علاج، گردے کا درد، گردے کا ورم، جگر پر ورم، جگر میں گرمی، یرقان (پیلیا)، زیادہ پیشاب آنا، گردوں کے نقص، جگر میں ورم کے لئے، تلی کا رائے سے علاج، تلی بڑھنا، تلی کا ورم، آک سے یرقان کا علاج، امراض گردہ مثانہ کے چند نسخے، دن میں صرف دو بار کھائیے، دن میں آٹھ گلاس پانی پینا ضروری ہے، روزانہ پندرہ منٹ ورزش کریں، حفظان صحت کے 39 اصول، اور دیگر معلومات اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ بک ایجنسی نوید اسکوائر گڑھی

اردو بازار Ph:32773302

یاد تھا اور یہی تو سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ اسے سب "یاد" تھا..... بارہ جنوری کی وہ دھند آلود شام آج بھی زندہ تھی اور ابھی بھی تازہ تھی۔ اس شام ہر منظر کو دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اور ہر زویا فہید کا ہاتھ تھامے پارک میں ٹہل رہا تھا پارک میں اکا دکا لوگ تھے وہ اس سے باتیں کرتے تھے پر آن بیٹھا تھا زویا نے اپنا سر اس کی آغوش میں رکھتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور احمر نے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا تھا اس کی نظروں میں صاف بے یقینی تھی مگر..... زویا کے چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہ تھا صرف سنجیدگی تھی اور خمار تھا۔

"کیا کہا تم نے.....؟" اس نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔ تب زویا نے اپنی بات دہرائی اور اگلے ہی لمحے وہ اسے پرے جھٹکتا ہوں دور ہوا گویا ہزاروں چھوڑوں نے اسے ایک ساتھ ڈنک مار دیا ہو۔

"کیا ہوا احمر.....؟" زویا نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں زویا.....؟" وہ آم کے تناور پیر پر لوٹے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو دھند کے مہین پر دسے میں ملخوف تھے۔

"تو اس لئے تو میں نے کہا ہے۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

"زویا! شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی محبت کو آلودہ نہیں کر سکتا۔" اس نے نرمی سے بولتے زویا کے حسین چہرے کو دیکھا تھا۔

"مگر..... ہماری شادی ممکن نہیں احمر، میرے پاپا کبھی اس کے لئے نہیں مائیں گے اور ویسے بھی میرا رشتہ تو میرے کزن زہیر کے ساتھ طے ہو چکا ہے۔" اس نے بڑے آرام سے ہم بھوڑا۔

"م..... مگر زویا! تم تو مجھ سے محبت کرتی ہونا!" وہ بمشکل بول پاتا تھا۔

"ہاں..... اسی لئے تو تمہیں پانا چاہتی ہوں یونو احمر مجھے جتنے لوگوں سے محبت ہوئی اور جتنے بھی لوگ

خبر باد کہہ دیا تھا وہ اکلوتا تھا اس کے والد ضیاء الدین کافی عرصہ قبل عدم آباد سدھارے تھے اس نے واپس آ کر ان کی چھوڑی ہوئی زمین سنبھال لی حالانکہ پہلے وہ اس کام سے چڑتا تھا سارہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر جو چارہ جل اٹھے تھے وہ ان سے چڑتا تھا اسے ہلڑکی مویا جیسی لکٹی تھی اور اسے محبت سے نفرت ہو گئی تھی مگر..... اب..... اب وہ خود اسیر محبت ہو چلا تھا اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ زویا تو اسے پسند تھی جو شخص آپ کی محبت کا دم بھرتا ہونہ چاہتے ہوئے بھی وہ آپ کو اچھا لگنے لگتا ہے اور چونکہ زویا اسے بے حد اہمیت دیتی سو اس لئے وہ بھی اسے پسند کرنے لگا تھا اور پھر..... اس کی سوچوں کے تسلسل کو کلی میں سے گزرتے ارشد نے توڑا اس کے کمرے کی کھڑکی میں مکی تھی۔

”اگر ایسے سارہ نہیں آئی تمہاری طرف؟“ ان کا لہجہ خفیف تھا اور وہ دیوار پر ہاتھ رکھے ہانپ رہے تھے۔

”سارہ.....؟“ نہیں تو..... کیوں خیریت.....؟“ اس نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ ڈاکٹر کا پتہ کرنے لگی تھی، میں نے کہا تھا کہ احریا واصف کو بلا لاؤ وہ کہہ گئی تھی کہ ڈاکٹر کا پتہ کر کے واصف کو بلا لاتی ہوں تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا ہے..... تم..... تم اس کا پتہ تو کرو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“ ان کی آواز بھرائی احمر کا گھر چونکہ قریب تھا اسی لئے وہ سیدھے اسی کے پاس چلے آئے تھے۔

”آ..... آپ اندر آئیں میں ابھی پتہ کرتا ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ انہیں اندر آئی کے پاس بیٹھا اس نے ڈاکٹر کے گھر کا رخ کیا الماس نے اسے بتایا کہ سارہ قریباً گھنٹہ بھر قبل آئی تھی اور شفقت کا پوچھ کر فوراً ہی چلی گئی تھی وہ فوراً ہی پلٹا تھا واصف کے دروازے پر وہ تب تک ہاتھ بجاتا رہا جب تک دروازہ نہ کھلا۔ بارش ابھی بھی جاری تھی مگر اس کی شدت میں میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی۔ دروازہ کھولنے والا واصف ہی تھا۔ وہ بارش سے بچنے کے لئے

چھتری لے آیا تھا۔

اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ چپکتی بجلی میں اسے نے واصف کے چہرے کا بدلتا رنگ بغور دیکھا تھا۔

”مجھے کیا پتہ.....؟“ اگلے ہی لمحے وہ خواہ کو سنبھال چکا تھا۔ اس کے شانے اچکانے پر احمر کوٹیش کی لہر چھو گئی۔

”وہ تمہارے گھر ہمیں بلانے آئی تھی، کہاں ہے وہ.....؟“ اس نے بمشکل خود کو کپڑو کیا تھا۔

”میں کافی دیر سے سو رہا تھا وہ نہیں آئی..... اسی اور اصر بھائی تو ایک شادی میں گئے ہوئے ہیں میں آ گیا تھا اس لئے سو گیا اور.....“ اس کی روانی سے چلتی زبان کو بریک لگایا۔

”سارہ بیٹی کو تم خود اندر لے جا رہے تھے۔ میں اپنے بیٹے کی ضد پر اس کے لئے سیب توڑنے جا رہا تھا۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا جہاں سیبوں کے چند درخت تھے۔

”تب میں نے سارہ کو تمہارا دروازہ کھٹکھٹاتے دیکھا تو رک گیا کہ خیریت ہوا اس موسم میں وہ اکیلی پھر چھوڑی دیر بعد تم آئے تو وہ تمہارے ساتھ اندر چلی گئی آواز تو مجھے نہیں آئی مگر میں نے سوچا کہ کوئی کام ہوگا۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

ابھی پھر وہ اپنے کاشی کے لئے مزید سیب توڑنے کے لئے جا رہا تھا کہ کاشی کو بخار تھا اور وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔

”ہاں..... وہ.....“ واصف کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”وہ آئی تو تھی مگر فوراً ہی چلی گئی تھی۔“ احمر کے ضبط کی حد بس یہیں تک تھی اس کا دایاں ہاتھ واصف کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا واصف لڑکھڑا گیا احمر سختی سے اس کا کریاں جکڑے پھینکا۔

”کہاں ہے وہ.....؟“ مجھے نہیں پتہ چھوڑو مجھے۔“ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”واصف! سیدی طرح بتا دو سارہ کہاں ہے۔“

ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا کہاں ہے وہ..... کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟“ اس نے واصف کا گلا دو بچ لیا۔ اس پر دیوانگی کا عالم طاری تھا واصف سانس لینے کی کوشش میں تڑپ رہا تھا لطیف نے اس کے ہاتھوں سے واصف کی گردن چھڑائی تھی۔

”کہاں ہے وہ.....؟“ وہ آگ آگتی نگاہوں سے بری طرح ہانپتے واصف کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ..... وہ..... اس جنگل..... کی طرف گئی تھی۔“ واصف نے اشارے سے بتایا تو وہ ایک بھر پور گھونسا اسے مار کر جنگل کی جانب لپکا اس لئے بادلوں کا سینہ شق ہوا اور ایک کوندا سا لپکا بادل پھر شدت سے برس رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

خاموشی نے تاحد نگاہ پر پھیلا رکھے تھے۔ سناٹا گونم بدھ کے سے انداز میں آگتی پانی مارے چپ کی بگل مارے بیٹھا تھا سکوت و شست زدہ سانسیں سانسیں کرتا پھرتا تھا اس سانسیں میں قدموں کی چاپ ابھری جو خاموشی اور سکوت کو بے حد ناگوار گزری گونم بدھ کے سے انداز میں ”خاموشی“ بیٹھا سناٹا دھیرے سے سر جھکا گیا۔ تاہم اس کی گدلی آنکھوں میں بیزاری کی لہر کر نہیں لینی گئی۔ شران غنی کے قدم سکوت کے وجود کو روندتے جا رہے تھے دفعتاً وہ ٹھنک کر رکا۔ ایک شخص اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا گویا زمین سے پھوٹ پڑا ہو۔ اس کے بال شانوں سے نیچے لٹک رہے تھے اور ان کی رنگت براؤن تھی۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں کس قدر سرخ تھیں کھڑی ناک سختی سے نیچے ہونٹ، چوڑا چنکا سینہ اور کمرنی گھٹا ہوا جسم..... وہ محض لنگوٹ میں ملبوس تھا شران نے کٹر اگر گزرتا چاہا مگر وہ بول اٹھا۔

”میری بات سنئے۔“ شران رک کر اس کو سوالیہ لگا ہوں سے دیکھنے لگا۔

”آگے مت جاؤ.....“

”کیوں.....؟“ شران نے ہمنویں اچکانیں۔

”کیونکہ اگر تم آگے مجھے تو مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔“ اس کا لہجہ کھر درا تھا۔

”مجبوری ہے دوست! مجھے شیانگ قبیلہ کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔“ شران پھیکے انداز میں مسکرایا۔

”شیانگ قبیلہ.....؟“ اس شخص نے حیرت سے ہمنویں سیکڑیں، پھر تو تم بہت جلد ہی منزل تک پہنچ جاؤ گے مسٹر۔ سیدھے چلے جاؤ جلد ہی منزل تک پہنچ جاؤ گے۔“ وہ طنزیہ لب و لہجے میں بولتا آگے بڑھ گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ چلتا رہا پھر ایک درخت سے ٹیک لگا کر سستانے لگا اس نے بیٹھ کر ہاتھ میں موجود بوتل میں سے پانی پیا اور پھر سرسٹے سے ٹاکرا آکھیں موند گیا۔ اس کی آنکھوں میں ماضی گردش کرنے لگا۔

ماضی..... جہاں خوشیاں تھیں..... ماضی..... جہاں بے فکری تھی..... ماضی..... جہاں اس کے اپنے تھے امی بابا کالا ڈاؤر پیار تھا۔ رومیہ کی محبت اور ہارومان کی دوستی اور خلوص..... وقت کس قدر بدل گیا تھا اس کے لئے اس کی آنکھوں میں ماہ شب کا ساکت وجود لہرایا تو دل میں نیزے سے کھب گئی اس نے صدق دل سے اللہ سے مدد مانگی..... صرف اور صرف وہی ہے جو وہاں بھی ہماری مدد کرتا ہے جہاں آکر سب کے اختیارات ختم ہو جاتے ہیں صرف اللہ ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ”کن“ کہے تو..... ”فیكون“ ہو جاتا ہے ارد گرد ابھرنے والی بے شکم سی آوازوں پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اس کی نظروں نے جو دیکھا بے حد حیرت انگیز منظر تھا اس منظر نے شران غنی کو چونکا دیا تھا اور بڑی بری طرح چونکا پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

شدت سے برسی بارش نے ہر طرف پانی کی چادر سی تان رکھی تھی، موٹی موٹی بوندیں تابڑ توڑ برس رہی تھیں گاہے بجلی چمک جاتی تھی اور جب بجلی چمکتی تھی تو اس کی روشنی میں برسی بوندیں گویا ستاروں کا روپ دھار جاتیں مگر احمر کو ان چمکتے ستاروں سے قطعاً

سے بیگانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے ارد گرد چند لوگ ہاتھوں میں تلوار نما ہتھیار لئے کھڑے تھے انہوں نے اسی گھومے میں لے رکھا تھا ان کے جسم سخت گھٹے ہوئے تھے اور وہ چوڑے چوڑے پتوں کا مختصر سالباست پہنے ہوئے تھے۔ لیکن شران کے چونکنے کی وجہ بہر حال ان کی موجودگی یا ان کے ہتھیار نہیں رہے تھے اس کے چونکنے کی وجہ ان کے چہرے تھے ان کی رنگت جھلکی ہوئی اور نقوش کرخت تھے۔ اور چہروں پر لکیروں کا جال سا بچھا تھا۔ عین اسی طرح جیسے ہاتھوں کی تھیلیوں پر لکیریں ہوتی ہیں۔ ان کے چہروں پر بھی ٹھیک ویسی لکیریں تھیں۔ میزمری میزمری..... کچھ لمبی اور کچھ مختصر..... وہ لکیریں ان کے چہروں پر کسی کٹڑی کے جالے کی طرح پھیلی تھیں۔ ناک پر آنکھوں پر، گالوں پر..... غرض ایک کان سے لے کر دوسرے کان تک اور پیشانی سے لے کر گھوڑی تک..... ”شیانگ قبیلے کے کسی بھی فرد کا دیکھنا تمہیں چونکا دے گا۔“ اس کی سماعت میں اجول کی آواز گونجی اور ذہن میں بجلی کا کوند سا لپک گیا۔

”ہمارے ساتھ چلو.....“ ان میں سے ایک غرایا۔ اس عورت نے اسے شیانگ قبیلے کا یہ تو نہیں بتایا تھا مگر اسے وہ زبان کسی حد تک سکھادی تھی جو اس جزیرے پر بولی جاتی تھی اگرچہ دونوں کے قلیل عرصے میں وہ چند جملے ہی بولنا سیکھ پایا تھا البتہ کچھ ضرور سیکھتا تھا۔ ”اٹھو“ اس شخص نے اپنے ہتھیار کی نوک اس کے بازو میں چھوئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے زرعے میں لئے گئے درختوں اور بانسوں سے گزرتے دائیں جانب بڑھنے لگے اچانک چند بھیڑیے لپک کر ان کی جانب آئے اور شران پر چھپنے کی کوشش کی۔

”دفع ہو جاؤ۔ پہلے یہاں مرے ہوئے تھے.....“ ان میں سے ایک شخص نے بھیڑیوں کو آنکھیں دکھائیں تو وہ مست قدموں سے پلٹ گئے

کوئی دلچسپی نہ تھی اس کی توجہ ان پر مبنی تھی اور جب جان پر مبنی ہو تو دلچسپ سے دلچسپ منظر بھی اٹریکٹ نہیں کرتا کیونکہ اس وقت ”کچھ اور“ خود کو ”اٹریکٹ“ کر رہا ہوتا ہے۔ بلکہ ”کچھ اور“ خود کو ”اٹریکٹ“ کر رہا ہوتا ہے۔ اس قدر اٹریکٹ، کہ کچھ بھر بھی دھیان اس سے ہٹ نہیں پاتا۔ بلکہ دھیان کسی اور سمت ”جہنش“ تک نہیں کر پاتا۔ اس کے ساتھ بھی اس وقت یہی معاملہ درپیش تھا۔ اس کے ”دھیان“ کی ”جان“ بھی سارہ میں انگی تھی۔ اس کی سوچ کا ارتکا ز بھی صرف اسی پہ آ کے ٹوٹتا تھا جب وہ جنگل میں داخل ہوا تو تب بھی بارش زور و شور سے جاری تھی۔ لیکن گھٹے درخت کسی حد تک زمین کا بچاؤ کر رہے تھے۔ اس کے پاس سوائے سیل فون کے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے سیل فون کا خیال تک نہ تھا کہ وہ روشنی ہی کر سکتا کبھی کبھی بجلی چلاتی ہوئی زمین کی سمت لپکتی تھی اور کچھ بھڑکرتے دجوار روشن ہو جاتے تھے اور پھر اگلے لمحے پھر وہی گھٹنا نوپ..... اندھی تاریکی چھا جاتی..... وہ آگے بڑھتا رہا۔ بتا رہی اور پھر اس سے اچھے والی جھاڑیوں کی پرواہ کئے..... درختوں کے پتوں پر تازا پانی برس رہا تھا۔

”سارہ..... سارہ۔“ وہ وقفے وقفے سے آوازیں بھی دے رہا تھا۔ مگر کوئی جواب نہ مل رہا تھا اور پھر اس کی آواز بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں دب سی بھی جاتی تھی ایک بار اسے لگا کہ کوئی بولا ہے جواب اس نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا لیکن اسی لمحے وہ پھسلتا چلا گیا اس جگہ اصل میں گھاس کی بجائے زمین بخری اور اس کا پاؤں کچھڑ میں جا پڑا تھا وہ سنبھلنے کی کوشش بھی نہ کر سکا اس کا سر درخت کے موٹے تنے سے ٹکرایا تھا۔

”دھپ“ کی آواز کے ساتھ کرہنک اذیت اس کی کھوپڑی میں کوندگی اس نے اٹھنا چاہا مگر..... اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور دردناک تکلیف اس کے سر میں تیزی سے گھوم رہی تھی۔ اس نے آخری آواز بجلی کے چلانے کی سی تھی اور پھر..... وہ ہوش و خرد

شران چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ بھیڑیے رخصت ہوئے وہ لوگ پھر چل پڑے۔ ظاہر ہے کہ اسے ان لوگوں کی تقلید کرنا تھی ان کا سفر قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اختتام پذیر ہوا تھا اس دوران وہ قدرے تھکاوٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ سامنے ایک بڑا پہاڑ تھا اور اس کے آس پاس بھی اس سے کچھ بہت پہاڑ تھے سلسلہ کوہ کا فی دور تک چلا گیا تھا۔ سامنے والے پہاڑ میں یکا یک شکاف سا بڑا اور غار کا دہانہ کھل گیا۔ ہتھیار بدست اسے اندر لے گئے غار اندر سے کافی کشادہ تھا کافی آگے جا کر اسے کمرے دکھائی پڑے وہ اسے لئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے وہ دنگ رہ گیا کہ کمرے کی آرائش جدید انداز میں کی گئی تھی جہاز کی سائز بیڈ، جس پر سرخ جمل کی بیڈ شیٹ بھی تھی دیوار کے ساتھ قد آور ڈریسنگ ڈیسل تھی سائڈ ٹیبل پر فریڈم وغیرہ دھرے تھے ایک جانب نو سپر صوفہ بڑا تھا جس کے آگے رکھی گلاس ٹیبل پر پتھر کا ترشا ہوا لمبی گردن والا شتر مرغ رکھا تھا۔ اس کے سر میں سورج تھا اور اس میں خوبصورت جنگلی پھول مہک رہے تھے۔ واز کے پردوں پر ننھے ننھے ہیرے دمک رہے تھے۔

”کون ہو تم.....؟“ ایک آواز نے اسے چونکا دیا وہ ایک نوجوان تھا اس کا قدر دراز تھا رنگت اس کی بھی جھلکی ہوئی تھی اور چہرے پر لکیروں کا جال اس نے بھی چہروں سے ستر پوشی کر رکھی تھی قد کم لباس اور جدید بیڈ روم.....

”اے کون ہو تم.....؟“ اب کے انگریزی میں اس کے عقب سے آواز ابھری تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بھی نوجوان ہی تھا چہرے پر لکیریں..... تاہم اس کی رنگت ہلکی سانولی تھی اور نقوش پرکشش تھے۔

”آتم شران غمی فرام پاکستان۔“ نوجوان نے مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔

”کیا یہاں آنے سے تمہیں کسی نے روکا نہیں؟“ پہلا جوتہ منہ اٹھا کر موت کے منہ میں داخل ہو گئے؟“ پہلا شخص قیمتی صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ بولا تو اس کی بات

سانولی رنگت والے نے انگریزی میں دہرای۔
”روکا تھا مگر..... مجھے اب حیات چاہئے.....
ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟ تو تم بھی دائمی زندگی کی تلاش میں آئے ہو؟ لیکن مشر! یہاں آنے والے پر آب حیات کے متلاشی کو دائمی زندگی کے بجائے موت ملتی ہے۔ صرف اور صرف موت..... ایسی ہیما تک موت جو کہ اس کی روح کو بھی ہمیشہ تڑپاتی رہتی ہے.....“ ان سب کی آنکھیں لہو لہو ہو گئیں اور ان خون چھلکانی نگاہوں میں سفاک تاثر ابھرا آیا تھا۔

”میں اپنے لئے نہیں آیا..... اگر مجھے اب حیات نہ ملتا تو میں..... ماہ شب.....“ وہ بے ربطی سے بولا تھا۔

”اپنی بات کی وضاحت کر لو جوان۔“ جواب اس نے مختصر الفاظ میں سب کو سنایا۔ مترجم نے بھی اس کی داستان دہرا ڈالی اور سب کے چہرے حیرت کی آماجگاہ بن گئے ان میں سے وہ شخص جسے اس نے کمرے میں دیکھا تھا اور ان سب کے اطوار بتا رہے تھے کہ وہ ان لوگوں کے لئے اہم حیثیت کا حامل ہے اس شخص نے گلاس ٹیبل پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چند آدمی ترجمہ لکیریں کھینچیں اور نظر میں ٹیبل کے گلاس پر جمادیں سب کے سب دم سادھے کھڑے تھے شران کو چھینک آئی تو سب کو اس نے خشکیوں نگاہوں سے دیکھا وہ شخص ایک ہی پوز میں بیٹھا ٹیبل پر نگاہ جمائے رہا کچھ سے بعد وہ اٹھا اور ان کی سمت پلٹا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس نے اثنائی انداز میں سر جھنجھٹا دی۔

”میں اس قبیلے کا سردار ہوں اور اس قبیلے کے متعلق ہر فیصلہ مجھے ہی کرنا ہوتا ہے سینڈ والا سے بتاؤ کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس نے مترجم کو اشارہ کیا تھا۔

لیکن شران نے سینڈو کے بولنے سے قبل ہی اسے بتا دیا کہ وہ ان کی زبان سمجھ رہا ہے سینڈو نے سردار کو بتایا تو وہ بھی اسی انداز میں سر ہلا کر مزید گویا ہوا۔

”جیسا کہ میں بتا رہا ہوں کہ اس قبیلہ کا ہر فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ایک چوونٹی سے لے کر انسانی زندگی تک کے متعلق..... اور تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ہم لوگ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ جوان رہتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں آب حیات پایا جاتا ہے لیکن ہم یہ راز کسی اور کو ہرگز نہیں بتاتے۔ آج تک یہاں جو بھی آیا وہ زندہ واپس نہیں گیا لیکن تم..... تم نہ صرف زندہ واپس جاسکتے ہو، بلکہ آب حیات بھی لے جاسکتے ہو۔ لیکن..... اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔ مجھے سفید سانپ کے گلے کا موتی چاہئے۔“ اس نے چپ کر کے ثمران کے گھمبیر تاثرات کو بغور جانچا اور پھر قدرے توقف سے گویا ہوا۔

”لیکن میں یہ بتا دوں کہ سفید سانپ کو حاصل کرنا نہایت ہی کٹھن ہے۔ سانپوں کے پاس سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں آیا بلکہ واپس آنا تو دور کی بات ہے وہاں کوئی پہنچ ہی نہیں پایا تم اچھی طرح سوچ لو۔ ہمارے پاس پراسرار طاقتیں ہیں لیکن کسی میں ہمت نہیں ہے وہاں جانے کی۔“ اس کی سوالیہ نگاہیں ثمران کے چہرے پر جم گئیں۔

”میں تمہاری شرط پوری کروں گا لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پہلے مجھے آب حیات دے دو اور اپنے کسی شخص کو میرے ساتھ بھیج دو.....“ میں بعد میں آکر تمہاری شرط پوری کر دوں۔“ مینڈو نے اس کی خواہش و دہرائی تو سردار کے تاثرات پھر پلے ہو گئے اور آنکھوں میں عجیب سفاکی در آئی۔

”اس صورت میں تم آب حیات تو کیا، اپنی زندگی بھی نہیں پاسکو گے۔“

”زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی مرضی کے بغیر کوئی سانس بھی نہیں لے سکتا بہر حال میں تمہاری شرط ماننے کے لئے تیار ہوں تم مجھے بتا دو کہ مجھے سفید سانپ کہاں ملیں گے؟“

”مینڈو! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اسے سانپوں کی وادی کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ کر دو

اور کھانے کے علاوہ بھی یہ جو چاہے دے دینا۔“ اس نے اشارے سے انہیں جانے کا کہا تو سب ہی فوراً پاہرنگل گئے۔ مینڈو اسے ساتھ لئے ایک کمرے میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کی سماعت میں چڑیوں کی چھچھاہٹ نے راستہ بنایا تھا اس نے کسمسا کرا کھینس کھول دیں درختوں کے پتوں سے چھن کر آتی دھوپ کی سنہری لکیریں اکا دکا بھری تھیں وہ جس جگہ لیٹا تھا وہاں ابھی بھی مٹی مٹی گیلی تھی اور گرد البتہ گھاس کے سرے خشک ہو چکے تھے جبکہ ان کی جڑیں ابھی نم تھیں وہ کچھ دیر غائب و ماضی کی کیفیت میں لیٹا رہا پھر سارہ کا خیال آتے ہی اٹھ گیا۔ اس نے اپنے سیاہ ٹراؤزر پر جمی کچھ جو خشک ہو چلی تھی، دائیں ہاتھ سے جھاڑی اور گھنے درختوں کو چرتا آگے بڑھنے لگا۔ وہ وقفہ بہ وقفہ سارہ کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ مگر جواباً خاموشی تھی گھمبیر خاموشی..... وہ کافی دیر تک جنگل میں بھٹکتا رہا..... پھر اس کی نگاہ نے ایک خشک سی چارو پواری کو چھوا پختہ اینٹوں کی دیوار پر جگی مٹی البتہ اس کی ٹانگیں ابھی بھی زمین میں گڑی تھیں۔ وسیع احاطے خالی پڑا تھا مگر ایک جانب ایک کٹھری موجود تھی اس کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی تھیں جبکہ دروازے نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہ تھی اس کے قدم بلا ارادہ ہی کٹھری کی سمت اٹھنے لگی اندر چند ایک لکڑیاں پڑی تھیں لکڑیوں کو کھن لگا تھا اور ان کا وجود مٹی مٹی ہو رہا تھا وہ پلٹ کر جانے لگا۔ مگر اس کے قدم ختم گئے کٹھری کی دیوار کے ساتھ کوئی چیز چپکی تھی اس نے پلٹ کر وہ چیز اٹھالی گولڈ کے اس جگر جگر کرتے بریسلٹ کو دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آ گیا وہ بریسلٹ سارہ کا تھا وہ واحد زبیر رجوہ بھی کھار پختہ تھی اس کی بے قران نظریں کٹھری کی چھت اور دیواروں کو ٹٹولنے لگیں۔

”سارہ.....؟“ وہ طلق کے بل چلا یا وہ تیزی سے باہر نکلا اور گرد و پیش چھاننے لگا۔ لیکن سارہ ہونی تو ملتی دفعتاً ایک خرگوش اس کے سامنے آ گیا اس کے گلے میں

کی زنجیر سے منسلک سرخ پٹہ بندھا تھا اس خرگوش کا دل کان خون میں بھیگا ہوا تھا وہ آگے بڑھا اور جھک کر دیکھنے لگا خرگوش کے کان کی لوزخمی تھی خرگوش اچانک پر جھپٹ کر حملہ آور ہوا حملہ چونکہ غیر متوقع تھا اس امر کو کھڑا کر پیچھے گرا آخری احساس گردن میں لپٹ اترنے کا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے چلتے چلتے ’خہ بھر کو رک کر آسمان کی بلب لگا ڈالی اللہ سے مدد مانگی اور پھر چلتے لگا۔ مینڈو کے ساتھ تھا۔

”تمہیں ڈرنیں لگ رہا.....؟“ وہ متعجب تھا ان کے چہرے پر چھائے اطمینان کو دیکھ کر۔

”نہیں..... لیکن یار ایک بات تو بتاؤ۔“ ثمران چلتے چلتے ایک درخت کا پتہ توڑا تھا۔

”کیا.....؟“ مینڈو نے اس کی آنکھوں میں لگا۔

”تم لوگ تو کبھی مرنے نہیں، پھر خود کیوں نہیں وہ حاصل کر لیتے.....؟“

ہم لوگ طبعی موت نہیں مرنے حادثاتی موت مرنے ہیں یہی وجہ ہے ہمارے سردار انکا کو جن لوگوں پر غاش ہوتی ہے اسے ختم کر دیتا ہے اسی سانپوالی پر ہی وہ سینکڑوں لوگوں کو کھینچ چکا ہے جن میں سے بھی شخص واپس نہیں آیا اور اب مجھے بھی اس نے لئے تمہارے ساتھ بھیجا ہے۔“ مینڈو کے لہجے میں کی چاشنی تھی ثمران ٹھنک کر رکا۔

”تو تم لوگ انکار کیوں نہیں کرتے.....؟“

”کوئی سردار کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے قبیلے سے ہٹ کر کے سولی چڑھا دیا جاتا ہے اور سولی سے پہلے سوزا دیں دی جاتی ہیں وہ اس قدر اذیت ناک ہوتی کہ انسان موت کو ترجیح دیتا ہے۔“ مینڈو کی بھوری ہوں میں کرب کی پرچھائیاں ابھرائیں۔

”تو تم لوگ یہ قبیلہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے.....؟“

”نہیں چھوڑ سکتے۔“ مینڈو نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں چھوڑ سکتے تمہیں اگر تمہارا مذہب چھوڑنے کا کہا جائے تو چھوڑ دو گے؟“

”کسی بھی قیمت پر نہیں۔“ ثمران کا لہجہ اٹل تھا اور جواب بے ساختہ

”ایسا ہی ہمارے لئے بھی سمجھ لو۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر ان کا انجام..... بہت بہت بھیناک تھا ان لوگوں میں میرا ایک دوست کا تھا اور اس کی محبوبہ کا راجھی تھی۔“ مینڈو نے کرب سے پلکیں میچیں اور جب کھولیں تو ان کی دہلیزوں پر مٹی تھی۔

”کانٹھا نے کیوں بغاوت کی تھی۔“ ثمران درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مینڈو بھی گھاس پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور غلا میں کھودتے ہوئے گویا ہوا۔

”یہ ڈیڑھ سو برس قبل کی بات ہے کانٹھا اور میں بہت اچھے دوست تھے وہ بہت بہادر تھا دوسرے قبیلوں سے ہر مقابلہ وہی جیتتا تھا۔“ مینڈو کھوئے کھوئے سے انداز میں ماضی کا ورق ورق پلٹنے لگا۔

”کانٹھا ایک بہترین لڑاکا تھا۔ اس کے باپ شیمی کو دیوتا پر قربان کر دیا گیا تھا اور ماں کو سردار انکا نے اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ ان کے دیوتا کو قربانی دینے کی یہ رسم صدیوں سے رائج چلی آ رہی ہے مہا پجاری جس شخص کے نام لے کر دیوتا نے اس کی قربانی طلب کی ہے اسے بلا توقف قربان کر دیا جاتا ہے بہر حال کچھ عرصے بعد جب انکا کا دل کانٹھا کی ماں سے بھر گیا تو اسے آزاد کر دیا گیا۔ کارا کانٹھا کی مگھیر تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے ایک دن جب موسم ابراؤ لود تھا وہ دونوں چھل قدمی کر رہے تھے انکا شکار سے واپس آ رہا تھا کہ اس کی ناپاک نگاہ کارا پر پڑ گئی اس کا ملکوتی حسن اس کی آنکھیں خیرہ کر گیا۔ وہ بلاشبہ اس کے قبیلے کی خوب صورت ترین لڑکی تھی اور انکا کو حیرت تھی کہ وہ اب تک کہاں چھپی رہی تھی؟ اس کی

نظروں سے بچتی ہوں نے کارا کے اندر بھی خطرے کی گھنٹی بجادی تھی ان کے ہاں روایت تھی وہ لڑکی جو سردار کو پسند آ جاتی تھی وہ پہلے سردار کے تصرف میں آتی تھی اور بعد میں جب اس کا دل بھر جاتا تب اسے چھوڑ دیا جاتا کارا نے کوکہ انگا کی ہوس بھانپ لی تھی تاہم وہ زیادہ پریشان نہیں ہوئی بلاشبہ انگا کو اس کی فطرت کو جانتی تھی مگر وہ ”خود“ کو اپنی فطرت کو اور کاٹھا سے اپنی محبت کو بھی بخوبی جانتی تھی۔ اس سے اگلے دن انگا کے حکم پر قبیلے کے چند ایک گھروں کو چھوڑ کر باقی سب کے شیر خوار بچوں کو ہلاک کر دیا گیا ایسا انہیں اس لئے کرنا پڑا تھا کہ آبادی زیادہ نہ ہو جائے آبادی بڑھنے کی صورت میں ضروریات بھی بڑھیں اور یوں وہ دنیا کی نظروں میں آجائے۔ جو کہ ان کی روایت اور فطرت کے متضاد ہوتا۔ یوں انہیں آبادی کم کرنے کے لئے اس قسم کے اقدامات کرنا پڑتے تھے۔ کبھی شیر خوار بچوں کو قتل کر دیا جاتا، کبھی لوگوں کو قربانی کے نام پر دیوتا کی بھیبت چڑھا دیا جاتا تو کبھی سرسکی کے نام پر اذیتیں دے دے کر مار دیا جاتا قتل ہونے والے بچوں میں کارا کاٹھا بھائی بھی شامل تھا۔ اس کے اس اقدام سے کارا کے دل میں انگا کی نفرت گہری ہوئی تھی۔

”انگا کے ایما پر مہا بھاری نے کاٹھا کا نام قربانی کے لئے پیش کر دیا تھا کارا کو علم ہوا تو وہ مضطرب ہو گئی۔“

”کاٹھا اتم بھاگ جاؤ۔“ نہیں، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن یہ لوگ تمہیں مار دیں گے۔“

”تم جانتی ہو میرے جانے کے بعد یہ لوگ تمہارا کیا حشر کریں گے۔“ اس نے نفی سے سر جھٹکا۔

”تب؟“ کارا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دونوں چلتے ہیں بچ گئے تو ٹھیک ورنہ۔۔۔۔۔“

کاٹھا نے بات ادھوری چھوڑ کر شانے اچکا۔

کارا متفق ہو گئی ان دونوں کے لئے ویسے بھی یہاں موت تھی وہ زندگی بچانے کی کم از کم ایک کوشش

تو کر ہی سکتے تھے اس سے زیادہ ان کے بس میں کھ تھا بھی نہیں۔

دو دن بعد ہی انہیں پکڑ لیا گیا اور۔۔۔۔۔ انہیں دیکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چلا دیا گیا انگاروں کی ایک لمبی قطار بھادی گئی تھی جو چوڑائی میں ایک گز کے قریب رہی ہوگی چند لوگ دکتی سلاخیں لئے ان کے دائیں بائیں چل رہے تھے جب کاٹھا اور کارا لڑکھڑا کر گر جاتے یا پیچھے زمین پر اتر جاتے تو وہ لوگ دکتی سلاخیں انہیں چھو کر آگے بڑھنے پر مجبور کرتے بلاخر وہ دونوں بے ہوش ہو گئے اس کے بعد انہیں طرح طرح کی اذیتیں دے کر مار دیا گیا ان کے گرد آگ کا لالہ جا کر انہیں محو کر دیا گیا اس آگ کی تپش ان نیم جان جسموں کو لہجہ جلا رہی تھی وہ بے حد حال انداز میں غنیمت کر کے موت مانگ رہے تھے مگر موت بھی کد آنے کا نام نہیں لے رہی تھی دو دن تک وہ موت کے لئے لہجہ مرتے رہے، تب جا کر موت آئی تھی۔ اور پھر ان کے بے جان جسموں کو جن سے زندگی کی آخری رفق تک نہ چھڑ لی گئی تھی انگاروں پر بھونچا جانے لگا ان سفاک لوگوں نے انہیں زندگی میں بھی جلایا تھا اور مرنے کے بعد بھی جلا رہے تھے شاید قبیلے کے افراد انگا کے حکم پر ان کے مردہ بننے ہوئے جسموں پر بھوکے درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

”اور تم چپ چاپ انہیں مرتے ہوئے دیکھتے رہے؟ تمہیں ان کی مدد تو کرنی چاہئے تھی۔“ شران نے بے یقینی سے اسے گھورا۔

”میرے باپ نے مجھے قید کر دیا تھا۔ اسے رقتا کہ میں نے ایسی کوئی کوشش کی تو خود بھی مارا جاؤں گا میں نے بہت کوشش کی تھی مگر۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہونٹ پکٹے۔

”انگا تمہیں کیوں مارنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”اسے پتہ ہے کہ میرے دل میں اس کے۔۔۔۔۔ بے حد نفرت ہے، اس لئے اگر میں یہاں سے زندہ واپس چلا گیا تو وہ کوئی اور بہانہ بنا کر مجھے مرواد

گا۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا ان کے سچ خاموشی آن ٹھہری۔

ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی چند لمحے یونہی خاموشی سے سرک گئے پھر اس خاموشی کو سنندو نے توڑا تھا۔

وہ اٹھا تو شران نے اس کی تقلید کی تھی۔

☆.....☆.....☆

سورج نے اپنا لہولہا چہرہ دھیرے دھیرے بلند کیا جو تار کی سہم کر بھاگ نکلی خاموشی ایسی گہری تھی کہ دل کی دھڑکن تک واضح سنائی دیتی تھی اگرچہ اس سے پہلے بھی جنگل میں خاموشی ہی ہوتی تھی مگر تب کم از کم پرندوں کی آوازیں گاہے بگاہے آتی رہتی تھیں مگر اس صبح میں کسی پرندے تو کیا کسی کٹی کا بھی نام و نشان تک نہ تھا۔ زمین بھر تھی تاحدنگہ چٹیل میدان تھا۔ بس اکا دکا درخت تھے وہ بھی کچھ ایسے کہ انہیں دیکھ کر ویرانی کا مزہ احساس ہوتا تھا۔ ان کے تنے اور ٹیڑھی میڑھی شاخیں سیاہ ہو چکی تھیں ان کا وجود پتوں سے نیکسار عاری تھیں اور شاید پتوں کا ”بھڑ“ ہی درختوں کو سوگ کا رنگ دیتی سیاح رنگ۔۔۔۔۔ موت کا رنگ۔۔۔۔۔ یعنی سیاہ رنگ دے گیا تھا۔ درخت گویا اپنے اجڑنے پر، اپنی بربادی پر، اپنی موت پر ماتم کناں تھے۔۔۔۔۔ بازو پھیلائے ”بین“ کر رہے تھے۔ زمین کے نیم جان وجود پر پڑی درازیں اس غمگینی کی گواہ تھیں ہر چہ یہ موت کا گمان ہوتا تھا ہر شے مردہ محسوس ہوتی تھی زمین، درخت اور سانسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں۔۔۔۔۔ سب مردہ تھیں گویا۔۔۔۔۔ دفن شدہ منظر میں جان پڑ گئی۔

وہ پہاڑیوں سے اتر کر نیچے آتے لے لے کا تعداد ساپ تھے وہ تیزی سے اپنے جسم کو بل دیتے بہرکتے ہوئے ان کی ہی جانب آ رہے تھے۔ ان کی رفتار جرت انگیز تھی وہ ان کی دو شاخہ پتلی زانیاں باہر لپکی پڑی تھیں اور جب وہ پھینک کر مارے تھے تو نیلے رنگ کی پھوار دور تک اڑتی تھی وہ ان کے سینے مقابل آگئے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ کرتے، اچانک بین کی حرا گیز آواز ابھرنے لگی۔

سانپ بے چین دکھائی دینے لگے شران اور سینندو نے بے اختیار آواز کے ماخذ کو دیکھا وہ ایک نوجوان لڑکا تھا لباس نے بھی پتوں کا ہی پنہن رکھا تھا لہجے بے ترتیب بال شانوں سے نیچے بکھرے تھے اور اس کی دائیں کلائی سے عجیب و غریب موتیوں کا کڑا لپٹا تھا پتھر کے ان موتیوں سے شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ گولائی کی شکل میں بین کے دہانے سے نکلے تھے اور گالوں میں ہوا بھری تھی اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ خود بھی گویا مسکور ہو کر ایک ٹرانس کے عالم میں بین بجا رہا تھا۔

سانپ تیزی سے بل کھاتے اس کی جانب بھینچے چلے گئے جیسے لوہا منٹا ٹیس کی جانب بے اختیار نہ کھینچا جاتا ہے جیسے ”زندگی“ موت کی جانب سرسکی چلی جاتی ہے کچھ ہی دیر میں میدان سانپوں سے بھر گیا وہاں ہر نسل اور ہر رنگ کے سانپ تھے۔ سیاہ، سرخ، سنہرے، سرسکی، بھورے، دھاری دار، چتکیرے، وہ سب کے سب بین کی لے پہ جھوم رہے تھے رقصاں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر گرتے تھے لیکن کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا بلکہ کسی کو ”اپنا“ ہوش نہ تھا ان کے رقص میں اب اضطراب شامل ہو رہا تھا ان کی رگوں میں انگارے دھک رہے تھے گویا۔۔۔۔۔ وہ اب ”ناچ“ رہے تھے ”تڑپ“ رہے تھے۔

آگ پر لوٹ رہے تھے لڑکے کی سنہری پیشانی چہرے اور گردن پر پسینے کے موتی ابھرائے تھے پرسکون وہ بھی نہ تھا اگر سانپ تڑپ رہے تھے تو وہ بھی ہانپ رہا تھا سانپوں میں موت کا رقص اب فقط عروج کو پہنچ چکا تھا اب اگر وہ چاہتے بھی تو رک نہ سکتے تھے اور رک تو وہ ابتدا میں بھی نہ سکے تھے بین کی سحر انگیز آواز دور دور تک بکھر رہی تھی۔ نفا سحر زدہ سن رہی تھی شران اور سینندو آواز کے ظلم میں جکڑے سانس تک لینا بھول گئے تھے گویا۔۔۔۔۔ کائنات کی نبض تھم گئی تھی ہوا ساکت رہ گئی تھی سپرے کے جنوں میں بتدریج۔۔۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوا جاتا تھا۔ گردن اور پیشانی کی رگیں نمایاں ہو چکی

تھیں یکلخت وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا بین اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئی ماحول پر طاری سحر بل بھر میں ترخ کر کے ٹوٹا تھا سپیرے کا پورا وجود پسینے میں شرابور تھا اور وہ بے جان انداز میں زمین پر گر پڑا تھا اس کا سانس دھونکی کی مانند جل رہا تھا اسے سانس لینے میں بھی بے حد دشواری کا سامنا تھا۔ اسے بے حد وقت ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سانس کی ڈور ٹوٹنے والی ہے اس کی ساری توانائیاں نچوڑ کر رہ گئی تھیں اور سانپوں کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی اب بے دم ہو کر پھنکار رہے تھے۔ ان کی دم اور جسم دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے ثمران دھیرے دھیرے چلا وہاں جا رہا۔ سپیرا آنکھیں موندے نیم جان حالت میں پڑا تھا۔

”کون ہوتا؟“ سپیرے نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ اس کی گہری سبز آنکھوں میں ہلا کی چمک تھی ایک سفاک چمک ثمران کی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت در آئی۔

”کون ہوتا؟“ سپیرے نے اپنا سوال دہرایا اور جھپٹی نظروں سے پھر اسے دیکھا۔

”میں کیا بتاؤں میری حیثیت تو خاک کے اک زرے سے بھی کمتر ہے بہر حال میں اب ذوالجلال کا ایک حقیر بندہ ہوں اور اللہ برتر کے محبوب کا امتی..... یہی میرا تعارف ہے یہی میری حقیقت ہے، یہی میرا اگلا شے ہے اور اسی پر مجھے فخر ہے۔“ ثمران کے لہجے سے جھلکتی نجابت وہ کون سی کیفیت تھی جو سپیرے کے ساتھ ساتھ سینڈ و کو بھی متاثر کر گئی۔ نو جوان سپیرے کی گہری سبز کھونٹی کھونٹی سی آنکھیں ثمران کو گھورتی رہیں پھر وہ گویا ہوا۔

”یہاں کیوں آئے ہو.....؟ اگر میں انہیں اپنے پاس نہ بلاتا تو اس وقت یہاں تمہاری ہڈیاں بھی نہ ہوتیں۔“ سپیرے نے سانپوں کی جانب اشارہ کیا جو مرے مرے انداز میں پڑے تھے ان کی ہانپتی پھنکاریں مدہم سانس میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

”ہم نے آنے سے قبل ایک خاص درخت کے پتے کھائے تھے جن سے زہر اثر نہیں ہوتا۔“ سینڈو نے بتایا۔

”چلوں کی کیا بات..... زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو ہم کو کوئی ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اگر وہ چاہے تو ہم اگلا سانس بھی نہ لے سکیں۔ یہ اسی کی قدرت اور اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمارے لئے مختلف چیزوں میں شفا بھی ہے۔ خیر..... تم مجھے سفید سانپ کے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے سپیرے کو دیکھا جس کی سبز آنکھیں اس کا سوال سن کر حیرت سے پیلا ہو گئی تھیں۔

”تم سفید سانپ کا کیا کرو گے؟“ اس کے لہجے میں سرسراہٹ تھی۔ حیرت کی سرسراہٹ۔

”مجھے اس کے حلق کا موتی چاہئے۔“ اب کے دست حیرت نے سپیرے کے پورے وجود کو اپنے گنجلے میں جکڑ لیا۔ اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے سے خوف آمیز تعجب مترشح تھا۔

”تم اس کے حلق کا موتی لو گے؟“ اگلے ہی لمحے وہ ہلکھلا کر اس دیا۔

”لوگ مجھے سانپوں کا شہزادہ کہتے ہیں میرا بچپن انہی میں گزرا ہے میرے دادا جوگی تھے۔ لیکن میرے باپ کو دشمنی کی بنا پر ان کے ایک دوست نے قتل کر دیا۔ تب میں چار سال کا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تب دادا دل برداشتہ ہو کر مجھے انسانی ہستی سے دور یہاں لے آئے یہ سانپ میرے دوست ہی نہیں سیوک بھی ہیں لیکن اس کے باوجود میں سفید ناگ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ اس کی دہشت ہی ایسی ہے اور تم.....؟“ ہوا ہلکی دھوپ میں چکرار ہی تھی۔

”مجھے ہر حال میں وہ موتی چاہئے۔“ ثمران نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”تم اس لئے اسے عام لے رہے ہو کہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے جان کنی کی اذیت کو کھیلنے والا ہی

جان سکتا ہے جس کی روح نے یہ عذاب بھجلا ہوا۔ اسے دیکھنے والا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔“

سپیرے کا لہجہ خاصا سرد تھا ثمران بے تاثر لگا ہوں سے اسے دیکھ گیا۔

”میں مانتا ہوں کہ اس موتی میں بے انتہا پراسرار باتیں ہیں، اس کا مالک دولت میں کھیلتا ہے لیکن اس کے باوجود..... اس کے باوجود زندگی کا کوئی بدل نہیں۔“ وہ رسائیت سے گویا ہوا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ جیسے زندگی..... اور جیسے اس کے لئے ماہ شب تھی۔ محبت کا بھی کوئی نعم البدل نہیں..... اور اس کے لئے محبت زندگی، اپنی زندگی سے بڑھ کر تھی۔

اس..... تھا وہ لالچی..... لیکن اگر دیکھا جائے تو ہر انسان کی لالچی ہے حتیٰ کہ اللہ کی عبادت بھی جنت کے حصول یا جہنم سے بچنے کے لئے کرتا ہے۔ اسے بھی ماہ شب کی زندگی کا لالچ موت کے منہ میں لے آیا تھا لیکن ایک بات تھی کہ اسے اب موت سے ذرہ بھر بھی خوف نہ رہا تھا

اب سے اس کا رشتہ اللہ سے مضبوط ہوا تھا تب سے اسے یقین نصیب ہوا تھا کہ حد نہیں..... کوئی حساب نہیں..... اسے یقین تھا کہ ”اللہ“ سے بڑھ کر اس کا کوئی اور خواہش اور روی جو ہر چیز پر قادر ہے وہ پر یقین تھا کہ اگر اللہ نہ چاہے تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی ہم کو بھولے ہوئے ہیں اس کا نام تک لینا ہمیں یاد نہیں رہتا۔ لیکن کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ ہمیں بھول گیا ہو؟ وہ ہمیں رزق دینا بھول گیا ہو؟ وہ ہمیں زندگی دینا بھول گیا ہو؟ نہیں، ایسا نہیں ہے..... ہمارے گز بھی نہیں ہے اگر ”وہ“ ہمیں بھول جائے، تو ہم سانس لینا ہی بھول جائیں..... یہ اور بات کہ ماہ شب اب بھی اس کے دل کی کین تھی۔

”میری مائتو واپس چلے جاؤ۔“ سپیرے کا لہجہ پھانسی تھا لیکن وہ واپس جانے کے لئے نہیں آیا تھا۔

”تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟“ اس کا لہجہ

رے کو بار بار کر گیا کہ اسے کچھ بھی سمجھنا بیکار ہے۔

”ٹھیک ہے اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو.....“ سپیرے نے کندھے اچکائے اور قدرے توقف سے گویا ہوا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے جذبہ ترحم سے لبریز نگاہ ثمران پر ڈالی، ویسی ہی نگاہ جیسی پھانسی گھاٹ میں جانے والے کسی شخص پر کوئی بھی نرم دل انسان ڈال سکتا ہے اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ ثمران اور پھر سینڈو نے بھی اس کی تقلید کی تھی، سانپ اب کلبلا رہے تھے ان میں سے چند ایک تیزی سے بل کھاتے ثمران اور سینڈو کی سمت لپکے سپیرے نے منہ سے ایک پھنکار نکالی سانپ لحد بھر میں بت بن گئے وہ پھر پھنکارا اور انہیں لئے آگے بڑھ گیا سانپ بے حس و حرکت انہیں جاتا دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

پہلا احساس جھپٹ کا تھا..... شدید ترین جھپٹ کا اسے اپنے بازو میں سونیاں اترتی محسوس ہو رہی تھیں اس نے بے ساختہ دائیں ہاتھ سے بائیں بازو پر دھکتی اس شے کو نوچ ڈالا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھا اور دھندلائی نظروں سے اس شے کو دیکھا وہ ایک مکڑی تھی۔ سنہری مٹلی مکڑی، اس کی نٹھی نٹھی چمکتی آنکھیں احمر کے چہرے پر ہی مرکوز تھیں اس نے مکڑی کو دھیرے سے زمین پر رکھ دیا۔ وہ رنگت ہوئی غائب ہو گئی وہ اٹھ گیا اور آگے بڑھنے لگا اس کا حلق بری طرح خشک ہو رہا تھا وہ گرد و پیش کو متلاشی نگاہوں سے کھال رہا تھا دفعتاً ایک دھماکا ہوا اس کے قدموں تلے زمین بری طرح لڑکتھرائی تھی ڈنگائی تھی لڑی تھی اور قدموں تلے زمین لرزنے کے سبب وہ بھی لڑکتھرایا تھا اس نے بے ساختہ ساتھ موجود درخت کو سہارے کے لئے تھامنا چاہا اس کی یہ حرکت قطعاً غیر ارادی تھی ٹھیک اسی طرح جس طرح اس کا لڑکتھرایا غیر ارادی تھا اس کا ہاتھ درخت سے مس ہونے کی دیر تھی کہ درخت گرتا چلا گیا گویا شخص اس کے لمس کے انتظار میں ہو قریب تھا کہ وہ بھی درخت کے ساتھ ہی زمین پوس ہوتا کسی نے اسے فضا میں معلق کر دیا اس نے

آنکھیں پھاڑ کر ارد گرد کو ٹٹول ڈالا مگر اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ لیکن نرم، خوشبودار پھولوں کا سلسلہ اس کے وجود پر برقرار تھا وہ زمین سے بلکہ درختوں سے بھی کافی اوپر خلا میں معلق تھا درختوں کے سرے گھاس کی مانند اس کے نیچے بچھے تھے۔

”کک..... کون ہو تم.....؟“ وہ ہڑبڑا گیا۔
”آ نکھیں بند کرو.....“ ایک نقری آواز گونگی۔
اگرچہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو گھاس کے ایک قطع میں پایا اس قطع کے اطراف رنگ رنگ کے پھول کھتے تھے فضا خوشبوؤں سے بھری تھی اس کے سامنے ایک نسوانی پیکر تھا وہ سفید موی پیکر نیلے فرائی نما لباس میں ملفوف تھا اخرونی بال چہرے کے اطراف چھل رہے تھے۔
”کون ہو تم؟“ اصرار پوچھا۔

”سلیمنہ..... تم مجھے بہت اچھے لگے ہو اس لئے تم کچھ دن میرے ساتھ میرے گھر میں میرے مہمان رہو گے۔“
”وہ کیوں.....؟“ نہیں مجھے سارہ کو تلاش کرنا ہے۔ نہ جانے کہاں ہوگی وہ۔“ وہ مضطرب سے اٹھا۔

”اگر میں تمہیں نہ جانے دوں تو.....؟“
”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ آگے بڑھا لیکن اگلے ہی قدم پر اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیر زمین سے جکڑے گئے ہیں جس طرح کوئی لکڑی میں کیلیں گاڑ دے اس نے استعجاب سے لڑکی کو دیکھا وہ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے اس کو دیکھ رہی تھی۔
”تم میری مرضی کے بغیر ایک انچ نہیں بل سکتے۔“

”لیکن..... تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ وہ جھنجھٹایا۔
”کیونکہ..... میری مرضی.....“ سلیمنہ نے شانے اچکائے۔

”دیکھو، سارہ مشکل میں ہوگی مجھے اسے ڈھونڈنا ہے پلیز مجھے جانے دو۔“ اب کے اس کے منت ریز لہجے میں بے بسی کی آمیزش بھی تھی۔
”کون ہے یہ سارہ.....؟“
”میری..... کزن.....“

”اوکے۔ اگر میں اسے ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کروں تو مجھے کیا دو گے؟“ سلیمنہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”اگر میری جان مانگو تو وہ بھی۔“ اس کے لہجے میں سچائی مترشح تھی سلیمنہ کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو تیر لہرایا اور پھر..... وہ بولی۔

”اوکے۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے اصرار کا ہاتھ تمام لیا اصرار آگے بڑھا تو اسے چلنے میں ذرہ بھر بھی دقت نہ ہوئی وہ آگے بڑھنے لگا۔
☆.....☆.....☆

سامنے سفید چٹانیں تھیں، گدلی، سفید چٹانیں نیچے سفید چمکدار ریت، بکری بھی تاحہ نگاہ ریت ہی ریت تھی یا پھر اکا دکا چٹانیں..... ہاں کہیں کہیں صحرائی بو دے اپنی کھٹکی کی شکایت کرتے دکھائی دیتے تھے وہ لوگ پیاس سے بے حال تھے۔ لیکن آگے بڑھ رہے تھے۔

”رک جاؤ۔“ سپیرے نے کہا۔ اور ان کے قدم ٹھک گئے۔

”وہ آ رہا ہے سفید ناگ۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ شران اور سینڈو نے اس جانب دیکھا وہ بہت بڑا اڑدھا تھا کسی درخت کے تنے جتنا موٹا اور طویل تر..... اس کے سفید چمکدار جسم پر سنہری نقطے سے بے تھے لمبی سرخ و دشاخہ زبان سے نیلے قطرے گر کے ریت میں جذب ہو رہے تھے اس کی گول سیاہ آنکھوں میں گویا ہزاروں واٹ کے بلب روشن تھے۔ سینڈو سانس روکے اسے دیکھنے لگا شران بھی ساکت تھا ان کے قریب آ کر ناگ رک گیا اس نے سپیرے کو دیکھا۔ سپیرا ہاتھ باندھ کر جھکا گویا ناگ کو تعظیم دی وہ

خٹنے پھلا کر پھنکارا سپیرے نے یہ عمل دو تین مرتبہ دہرایا ناگ نے ایک غضب ناک نگاہ شران پر ڈالی وہ آخر میں نگاہ اس کے جسم میں پھر پڑی سی دوڑا مٹی سفید ناگ پھنکارا اس کے منہ سے نیلا سیال سا پھوار کی صورت اڑا پھر وہ سپیرے کی جانب متوجہ ہو گیا کچھ دیر دونوں پھنکارتے رہے شران کی نظریں ناگ کے ہمایاں چہرے پر جمی تھیں سپیرے نے اسے پکارا اس نے چونک کر سپیرے کو دیکھا تھا۔

”یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا اب بھی تم وہ موتی حاصل کرنا چاہتے ہو۔“
”ظاہر ہے.....“ اس نے سر جھٹکا ناگ پھر پھنکارا۔

سپیرا کہنے لگا۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ تم کو اس سے لڑنا ہوگا کیا تمہیں قبول ہے؟ جیتنے والے کو منہ مانگا انعام ملے گا۔“ سینڈو کی آنکھوں میں حیرت دوڑ آئی۔ شران بلا توقف اثبات میں سر ہلا گیا سپیرے اور سینڈو نے از حد تعجب اسے دیکھا تھا۔

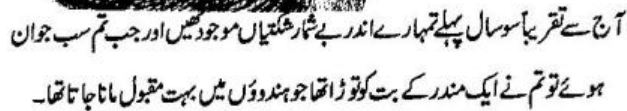
”تو ٹھیک ہے چلو پھر.....“ سپیرے نے کہا اور ناگ کی تھلید میں انہیں لئے چل دیا۔

اس جگہ دھوپ کی شدت اتنی زیادہ نہ تھی سفید چمکدار ریت البتہ گرم تھی۔ ”لڑائی ایک گھنٹہ جاری رہے گی آخری وقت میں جس کا پلڑا بھاری ہو اس کی جیت بھی جائے گی۔“ سپیرے نے آخری ہدایات دیں پلڑے دار سپیرا ایک چھوٹے سے نیلے نما پتھر پر بیٹھے تھے۔ ان کے دونوں طرف اور پیچھے سانپ ہی سانپ تھے کول وسیع دائرے کی جگہ چھوڑ کر ارد گرد سانپ ہی سانپ تھے۔ ہر رنگ..... ہر نسل کے سانپ..... وہ ایک انسان اور ایک ہیبت ناک سانپ کا مقابلہ دیکھنے بیٹھ ہوئے تھے آپ سانپ کولاکھ دودھ پلا لیں موقع ملنے پر وہ ڈسنے سے باز نہیں آئے گا اور اس وقت وہی سانپ اپنی تمام تربیت ناک، کمینگی سمیت ایک انسان کے مقابل تھا۔ سفید ناگ، دیگر سانپوں پر نگاہ ڈال کر پھنکارا۔

سپیرے نے سینڈو کے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ لڑائی کا نتیجہ جو بھی ہو تم لوگ ہرگز بھی مداخلت نہیں کرو گے۔“ ناگ نے اپنا رخ شران کی جانب کر لیا اور دھیرے دھیرے سرکتا ہوا شران کی جانب بڑھنے لگا اس سے کچھ فاصلے پر یہ رک کر وہ شران کو گھورنے لگا وہ بھی نہایت اطمینان سے ذرا بھی مرعوب ہوئے بنا اس کے عفریت جیسے چہرے کو دیکھے گیا پھر پہل ناگ نے ہی کی وہ پھنکارا ہوا سرخ زبان نکالے اس پر جھپٹا اس نے برقی فٹاری سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ناگ پر ناگ چلائی جوا چٹکی سی گئی تھی۔

ناگ پھنکارتے ہوئے پھر اس پر حملہ آور ہوا اس نے پھر اچھل کر خود کو بچایا تھا۔ چند منٹ پہلی سلسلہ جاری رہا سانپ حملہ کرنا اور شران کا انداز دفاعی ہوتا جا چکا وہ اڑتا ہوا ناگ کی گردن پر جا پڑا۔ ناگ نے سمجھنا چاہا مگر تب تک وہ اس کی گردن کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ ناگ کے حلق سے غضب ناک پھنکار نکلی وہ اضطرابی انداز میں اچھلا تو شران کے وجود کو بھی جھٹکا لگا تھا اور اسی جھٹکے کے سبب ناگ کی گردن اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی اب پھر ناگ اس پر حملہ کرنا اور وہ اچھل اچھل کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا اس نے ایک بار پھر خود کو بچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ناگ کے درمیانی دھڑ پر جا گرا ناگ نے اپنی وزنی دم اس کے سر پر دے ماری اس کی آنکھوں کے آگے تارے سے تارے گئے اس بار وہ بڑی مشکل سے بچا تھا۔

وہ اب جھٹکن سے بڑھ حال ہو چلا تھا اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا پسینے میں جھیکے بال فراخ پیشانی سے چپک گئے تھے۔ ناگ کا پلڑا بلاشبہ بھاری رہا تھا اگر وہ چاہتا تو اب تک شران کو ڈس کر ختم کر چکا ہوتا لیکن اب وہ اسے تھکا تھکا کر لطف اندوز ہو رہا تھا شاید وہ جان چکا تھا کہ جب چاہے ڈس کر اسے ”ختم“ کر سکتا ہے لیکن اب وہ اس سے ٹھیک رہا تھا شران کی مزاحمت اب بھی جاری تھی مگر اس میں پہلا سادم نہیں رہا تھا اب کے ناگ نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اس کا دھڑ خمران کے جسم



یہ سردیوں کی رات تھی، رات کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، دوسرے کسی لوکی منہوں آواز آ جاتی، اس وقت رات تقریباً آدھی بیت چکی تھی، جب ایک خوفناک سایہ ایک گھر کے سامنے آ کر اچانک غائب ہو گیا اگلے ہی لمحے گھر کے اندر سے کسی لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں..... بابا وہ مجھے مار دے گا بابا مجھے اس سے بچاؤ، دیکھو بابا وہ سامنے کھڑا ہے اس لڑکی نے روتے ہوئے کہا..... دوسرے ہی لمحے دوئی کا ایک ہیولہ اس لڑکی کے جسم میں داخل ہو گیا اور پھر اس لڑکی کے منہ سے غراہٹیں نکلنے لگیں..... میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا..... میں سب کو ماروں گا ختم کر دوں گا.....

ڈسنے کی کوشش کر رہا ہے۔
 ”اللہ.....“ درو کرٹ کی مانند اس کے پورے
 وجود میں دوڑا تو اس کے دل سے۔ بے اختیار کراہ لگی تھی۔
 ”اللہ.....“ اس کا بے جان ساسر ایک طرف
 ڈھلک گیا اور ذہن پاتال کی اندھی، گہری کھائیوں میں
 ڈوب گیا..... یہ اس کا آخری احساس تھا۔
 (جاری ہے) ۱

بھیا نک مردانہ آواز بلند ہوئی..... میں تیری بیٹی نہیں ہوں، میں بہت پرانا ہوں..... صدیوں سال پرنا ہوں..... مجھے اس لڑکی اور اس کے سات ساتھیوں کی تلاش تھی..... اور اب اس لڑکی کے ملتے ہی میں ان ساتوں تک پہنچ جاؤں گا..... پچھلے سات جنموں سے مجھے ان کی تلاش تھی..... انہوں نے میری تمام تر ہلکتیوں کو ناکام بنایا تھا..... جب انہوں نے مجھے مارا تھا تو ان لوگوں نے میری لاش کو جلایا نہیں تھا..... بلکہ مجھے تڑپنے کے لئے انہوں نے ایک پہاڑ میں موجود سوسال پرانے خوفناک مندر میں میری لاش کو دفن کر دیا تھا..... اس مندر میں بہت سی آتمائیں موجود ہیں لیکن وہ سب رات کو اپنا شکار تلاش کرتی ہیں..... یہ لڑکی اور اس کی تین سہیلیاں وہاں گئی تھیں..... اور اس طرح میں نے اس کے جسم میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا..... اور اس لڑکی کے پیچھے آ گیا..... اور گھر تلاش کر لیا..... اور اب میں اس لڑکی کے جسم میں داخل ہو کر ان لڑکوں کو ڈھونڈوں گا..... باہا با..... وہ قہقہہ لگنے لگا اس کے بعد وہ خوفناک سایہ اس لڑکی کے جسم سے نکل گیا اور وہ لڑکی بے ہوشی کی حالت میں نیچے گر کر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

اور سناؤ آخر آج کل کیا کر رہے ہو..... سہیل عباس نے اس سے سوال کیا..... اس نے جواب دیا..... کچھ خاص نہیں جی..... اس کی بات سن کر کاشف نے سوال کیا..... تم تو ہر وقت میچ کرتے رہتے ہو..... تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... تم تو اپنی دوست کی طرف زیادہ توجہ ہی نہیں دیتے..... وہ بیچاری ہر وقت تمہیں یاد کرتی رہتی ہے.....

دراصل..... وہ چار دوست تھے اور چاروں ہی ٹیچر تھے..... اور اتفاق سے چاروں ایک ہی اسکول میں پڑھاتے تھے..... ایک کا نام سہیل عباس، دوسرے کا نام آخر اور تیسرے کا نام کاشف تھا اور چوتھا امتیاز تھا..... چاروں ہر وقت خوش رہتے تھے..... ان کی زندگی میں ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی..... وہ کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا

نہیں کرتے تھے..... آج امتیاز نے ان سے ایک بہت ہی عجیب و غریب قسم کے خواب کا ذکر کیا اس نے ان سے کہا..... کہ وہ جب رات کو سوتا ہے تو اس کو خواب میں ایک بہت ہی خوفناک قسم کا آدمی نظر آیا ہے..... اس کی شکل بہت ہی خوفناک تھی اس کی کالی سیاہ رنگت اور جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ بہت ہی خوفناک تھا..... اس نے مجھ سے کہا کہ تم اور تمہارے ساتھی اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ..... اب میں نے دوبارہ اس لڑکی کے جسم پر قبضہ کیا ہے..... وہ تم لوگوں کو جانتی ہے اور اب تم کو کوئی بھی میرے قہر سے نہیں بچا سکتا..... وہ لڑکی اور کوئی نہیں بلکہ کاشف کی دوست سارہ ہے..... اور اب تو تم لوگ کسی طرح مجھے نہیں مار سکتے کیونکہ میرے پاس بے شمار ہتھیار ہیں۔

دراصل میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں جہاں وہ مجھے نظر آتا ہے وہ بہت ہی بھیا نک پہاڑ نظر آتا ہے، ہم سب دوست اس پہاڑ پر چڑھتے ہیں..... اس پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد ہمیں ایک بہت ہی ڈراؤنا مندر نظر آتا ہے..... اس میں بے شمار تابوت پڑے ہوئے ہیں اور سامنے ہندو مذہب کا ایک بت کھڑا ہوتا ہے اس پر چمکاڑ کا نشان بنا ہوتا ہے..... اچانک اس کی بے نور آنکھیں چمکنے لگتی ہیں..... اس کی آنکھوں کی روشنی ایک تابوت پر پڑتی ہے تو اس کا ڈھکن خود بخود کھل جاتا ہے اور اس میں سے وہ بھیا نک شیطان نکلتا ہے اور وہ مجھے یہ سب کچھ کہتا ہے جو میں نے تم سب کو بتا دیا ہے.....

اس کی بات سن کر سب کھڑے ہو گئے..... ان میں سے سہیل نے کہا..... ”کہ میں ایک اللہ والے بزرگ کو جانتا ہوں، ان کا نام عبدالکیم ہے، عبدالکیم ہی ہمیں اس مسئلے کا حل بتائیں گے۔ سب نے اس کی بات کی تائید کی اور وہاں سے روانہ ہو گئے.....“ کچھ دیر بعد وہ عبدالکیم کے گھر پہنچ گئے..... امتیاز نے عبدالکیم کو اپنا مسئلہ بتایا..... عبدالکیم نے ان کی بات غور سے سنی..... اور بولے..... ایک منٹ رکو میں ابھی آتا ہوں..... وہ ان سے کہہ کر باہر نکل گئے..... تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آئے تو ان

کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا..... انہوں نے وہ پیالہ میز پر رکھا..... انہوں نے ان چاروں کی طرف دیکھا اور سسکرانے لگے اور بولے.....

”میں تمہارا مسئلہ تلاش کرتا ہوں“ انہوں نے ان سے کہا کہ اب تم مجھ سے بات مت کرنا..... انہوں نے مندر ہی مندر میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا..... تقریباً پانچ منٹ بعد پانی زور زور سے بہنے لگا..... دو منٹ بعد پانی رک گیا اور پانی میں ایک بھیا نک چہرہ نمودار ہوا، اس کی شکل بہت خوفناک تھی..... اچانک پانی میں سے ایک بھیا نک آواز بلند ہوئی..... پانی میں موجود شیطان نے ان سے کہا..... ”کہ اب میں امر ہونے والا ہوں اور اب میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا“ باہا با.....

تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ مجھے صرف سات انسانوں کے خون کی ضرورت ہے اور اب میں نے تین خون کر دیے ہیں، اس طرح اب مجھے امر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا..... تم لوگوں نے پچھلے جنموں میں مجھے بہت شکست دی ہے، لیکن اب تم نہیں بچ سکتے..... باہا با..... اس کے بعد حکیم صاحب نے پانی پر ہاتھ مارا تو بھیا نک چہرہ غائب ہو گیا..... سب نے حکیم صاحب سے سوال کیا کہ اب کیا ہوگا، ہمیں اس شیطان کو مارنے کے لئے کیا کرنا ہوگا..... عبدالکیم نے ان سے کہا حوصلہ رکھو میرے بچوں..... اس مسئلہ کا ابھی حل نکالنا ہوں، یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے..... جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو دیکھنے میں بہت پرانی نظر آ رہی تھی..... وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اس کتاب کا مطالعہ کرنے لگے..... تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد انہوں نے سر اوپر کواٹھایا اور بولے مجھے ایک دن کا وقت چاہئے کل صبح میرے پاس آ جانا..... ان کی بات سن کر سہیل عباس بولے..... ”کہ ہم نے تو کسی شیطان کو نہیں مارا، ہم تو کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے..... پھر یہ شیطان ہمارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔“

اس کی بات سن کر حکیم صاحب بولے کہ تم کو کون سا کہانی معلوم ہو جائے گی..... اور وہ سب کھڑے

ہو گئے..... اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

سحر تم کیسی ہو..... نیلم نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے پوچھا..... اس کی بات سن کر پاس کھڑی چاندنی نے پوچھا.....

اس کو تو ہر وقت اپنے دوست امتیاز کا خیال رہتا ہے..... اس کی بات سن کر سحر نے کہا کہ چاندنی تم کو بھی تو ہر وقت اپنے دوست سہیل کی فکر رہتی ہے، کہ وہ کہاں ہے..... اس وقت وہ کیا کر رہا ہے..... اس نے کھانا کھایا ہے کہ نہیں اور تو اور نیلم کو ہی دیکھو، ہر وقت اپنے پیارے اختر کو کونج کرتی ہے اس کے بعد سب کے قہقہے کمرے میں گونجنے لگے..... اچانک ان کو سارہ کی یاد آ گئی..... اور سب اداس ہو گئیں..... اچانک نیلم کی آواز ابھری..... کہ کاش ہم اس ویران مندر نما مندر میں نہ جاتے..... تو آج سارہ ہمارے ساتھ ہوتی۔

اس کی باتیں سن کر سب کی آنکھیں بھر آئیں..... دراصل وہ چار دوست تھیں..... ایک کا نام چاندنی، دوسری کا نام نیلم تھا اور تیسری کا نام سارہ تھا جبکہ چوتھی کا نام سحر تھا..... چاروں ہی ایک کالج میں پڑھتی تھیں..... وہ سب سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھیں..... ایک دن وہ سب دوسری لڑکی کے گھر گئیں..... اس کا نام حنا تھا..... حنا نے ان کو ایک خوفناک پہاڑ کے درمیان ایک ڈراؤنے مندر کا ایک واقعہ سنایا..... حنا ایک لڑکے سے پیار کرتی تھی اس کا نام رفیق تھا..... وہ دونوں ہی کالج میں پڑھتے تھے..... وہ ہر وقت اپنے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے..... ایک دن رفیق، حنا، نیلم، چاندنی، سحر اور سارہ نے اس پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنایا..... رفیق نے اپنی بانٹیک کو باہر نکالا اور اسے اشارت کر کے باہر نکل آیا وہاں پر سب موجود تھیں ان سب نے اپنی کاریں اشارت کیں اور وہاں سے روانہ ہو گئے..... ان کی بانٹیک سب سے آگے تھی اور باقی کاریں پیچھے تھیں..... ڈرائیونگ سیٹ پر نیلم تھی..... اس کی برابر والی سیٹ پر سحر موجود تھی..... سحر باہر کے موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی..... اس کی نظر اچانک

انتیاز پر بڑی..... تو اس نے گاڑی روکنے کو کہا..... تو ٹیلیفون نے کار روک دی..... اتنے میں ملک انتیاز گاڑی کے قریب آ گیا..... اس نے سحر سے پوچھا کہ آج تم سب کہاں جا رہی ہو..... سحر نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی..... مٹھوٹے پھرنے کے لئے..... اس نے کہا..... شام کو ہوٹل میں ملیں گے، سحر نے کہا ٹھیک ہے..... اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے..... ان کی بائیک تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی جب آبادی ختم ہوئی تو آگے ویرانہ ہی ویرانہ آ گیا..... ان سب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اپنی طرف کھینچ رہی ہو..... ان کو انہیں سامنے ایک پہاڑ نظر آیا..... ان سب نے اپنی کاریں روک دیں..... وہ سب کاروں سے باہر نکلیں اور اس پہاڑ پر چڑھنے لگے..... پہاڑ پر چڑھنے کے بعد ان کو سامنے ایک مندر نظر آ گیا..... وہ سب اس کی جانب بڑھے..... اور پہاڑ کی دوسری سائیڈ پر پہنچے اترنے لگے..... وہ سب مندر کے قریب پہنچ کر رک گئے.....

اچانک سارہ لڑکھڑا کر چیخے گر گئی..... وہ سب سارہ کی جانب بڑھیں..... سارہ ایک گڑھے میں جا گری..... رفیق اور حنا نے ہمت کی اور گڑھے میں اتر گئے..... تو ان کی خوف سے چیخیں نکل گئیں..... سامنے ایک غارتھا وہ دونوں اس غار میں داخل ہو گئے..... جو باقی پیچھے رہ گئی تھیں..... انہوں نے اس گڑھے میں اترنے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھائے..... تو گڑھا خود بخود بند ہو گیا..... وہ دونوں سارہ کی تلاش میں اس غار میں داخل ہو گئے، وہ دونوں آگے بڑھتے گئے، غارتھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اس غار کا اختتام ایک بہت ہی خوفناک تہ خانے میں جا کر ختم ہوا جب وہ تہ خانے کے اندر داخل ہوئے تو حنا کی خوف سے چیخ نکل گئی.....

سامنے ایک بہت بڑا بت بنا ہوا تھا اس کے آگے بے شمار تابوت موجود تھے اور ایک تابوت کے قریب سارہ نیچے کی طرف منہ کر کے بیٹھی ہوئی تھی اس کی پشت ان کی طرف تھی..... حنا نے سارہ سے قریب جا کر اس کو اپنی جانب متوجہ کیا..... تو اس کی چیخیں نکل گئیں..... سارہ کی سرخ

انگاری جیسی آنکھیں ان کو گھور رہی تھیں..... حنا نے خوف سے ایک جھرجھری کی اور رفیق کے پاس آ گئی..... رفیق نے سارہ کی طرف دیکھا..... اور بولا..... کون ہے تو..... رفیق نے سب کچھ دیکھ کر کہا اور کیوں اس لڑکی کے ٹیم میں داخل ہوا ہے..... سارہ نے اپنے منہ سے بھیا تک قہقہہ لگایا اور باہر کی جانب بھاگی..... وہ دونوں بھی اس کے پیچھے باہر نکل آئے..... سارہ نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تو وہ ہوا میں اڑنے لگی..... وہ ایک راستے سے باہر آ گئی..... وہ راستہ اس شیطان کے بت کے پیچھے سے نکل رہا تھا..... وہ دونوں بھی باہر نکل آئے..... باہر موجود ان تین لڑکیوں نے جو سارہ کو دیکھا تو انہوں نے شور مچا دیا..... لیکن سارہ ہوا میں اڑتی ہوئی ان کے پاس آئی اور بولی اب تم سب کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا..... اس نے کہا اور ہوا میں بلند ہو کر ایک جانب اڑنے لگی..... وہ دونوں ان لڑکیوں کے پاس آئے اور انہیں وہاں سے بھاگ جانے کا کہنے لگے..... اتنے میں زوردار ہوا چلنے لگی..... اور وہ وہاں سے بھاگ گئیں..... سب اپنی کاروں میں بیٹھ گئیں اور اب ان کا رخ گھر کی جانب تھا.....

☆ ☆ ☆
یاراب ہمیں کیا کرنا ہوگا..... سہیل نے پوچھا اس کی بات سن کر انتیاز نے جواب دیا کیا کریں گے اب ہم نہیں بلکہ اب تو باجی ہی اس کا کوئی حل تلاش کریں گے..... جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے ان لڑکیوں کو کال کی اور گھر پر بلا لیا..... کال سننے کے بعد وہ سب ان کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئیں..... اور اب وہ انتیاز کے گھر جا رہی تھیں کیونکہ وہ سب دوست آخر کے گھر موجود تھے..... اب وہ سب ان کے آنے کا انتظار کر رہے تھے..... وہ تمام تیاری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئیں.....

☆ ☆ ☆
مجھے چھوڑ دو میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا اس جہنم کی جیت میری ہوگی، وہ لڑکے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے..... سارہ بے قابو ہو کر مردانہ آواز میں بول رہی تھی کیونکہ

وہ بیہوش ہوئی تھی تو اس کے والد نے اسے رسیدوں سے باندھ دیا تھا..... سارہ کے وجود میں جو شیطان تھا اس نے تین لڑکوں کو جان سے مار دیا تھا..... اس کا کہنا تھا کہ وہ سات خون کرے گا..... اس کے گرد بابا جی نے آیت الکرسی کا حصار بنادیا تھا..... اور اب وہ اس حصار کے اندر قید ہو کر رہ گئی تھی..... اب وہ شیطان جو کہہ رہا تھا مجھے چھوڑ دو..... وہ لڑکے اور لڑکیاں میرے تابوت میں اگر پہنچ گئے تو پھر مجھے ان سے شکست کھانی پڑے گی لیکن وہ نہیں جانتے کہ میری آتما کو وہ کیسے ختم کر سکتے ہیں، پھر اس نے کہا..... ہاں وہ بڑھا کھوٹ ان کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دے گا لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا.....

☆ ☆ ☆
وہ سب اکٹھے ہو کر صبح بابا حکیم کے پاس پہنچ گئے..... بابا حکیم کی آنکھیں سرخ لال ہو رہی تھیں..... جیسے وہ ساری رات جاگتے رہے ہوں..... انہوں نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ سب بیٹھ گئے..... بابا حکیم نے اپنے پوتے کو بلایا جس کا نام ظفر تھا بابا جی کے دو بیٹے تھے ایک کا نام محمد شفیع تھا اور دوسرے کا نام بشیر احمد تھا..... شفیع کا ایک بیٹا تھا ظفر جبکہ بشیر احمد کے دو بیٹے تھے..... ایک کا نام محمد تنویر احمد اور دوسرے کا نام فلک شیر..... تنویر اور فلک شیر دونوں ہی پڑھائی میں بہت ذہین بچے تھے..... اور وہ دونوں ہی اس اسکول میں پڑھتے تھے..... جس میں وہ چاروں استاد پڑھاتے تھے..... تنویر اور فلک شیر چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے..... جبکہ ظفر ان دونوں سے بڑا تھا..... وہ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا..... بابا نے ظفر کو بلایا اور چائے لائے کو کہا..... کچھ دیر بعد ظفر چائے لے آیا..... تو سہیل نے کہا..... بابا اس کی کیا ضرورت تھی.....

اس بات کو سن کر بابا مسکرانے لگے..... اور گویا ہوئے..... کہ آج سے تقریباً سو سال پہلے تمہارے اندر بے شمار شکتیاں موجود تھیں اور جب تم سب جوان ہوئے تو تم نے ایک مندر کے بت کو توڑا تھا جو ہندوؤں میں بہت مقبول مانا جاتا تھا..... اس کا ایک پجاری جس کا نام رام لال تھا..... اس نے تم کو مارنے کے لئے بہت سے

چلے گئے..... اس کے پاس بے شمار کالی طاقتیں موجود تھیں تم نے اس کی تمام شکتیوں کو ناکام بنادیا تھا اور ایک داس نے جس کا نام سارہ ہے اس کے جسم پر قبضہ کر لیا، اس نے اپنا جسم چھوڑ دیا تھا..... یہ جب کی بات ہے جب تم سب کالج چارہ تھے..... تو وہ اچانک سارہ کے جسم میں داخل ہو گیا..... اور اس نے تم سب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے تم سب زخمی ہو گئے..... اس نے صرف سہیل اور چاندنی اور انتیاز پر حملہ نہ کیا کیونکہ ان کے گلے میں آیت الکرسی کے لاکٹ موجود تھے..... اس نے جب سب کو زخمی کر دیا تو..... سہیل چاندنی اور انتیاز بھاگنے لگے، اچانک سہیل کو شوکر لگی اور وہ نیچے گر گیا تو اس کا لاکٹ ٹوٹ گیا.....

اس بدروح نے اس پر بھی حملہ کر دیا..... چاندنی نے اور انتیاز نے مسجد کی طرف دوڑ لگادی جبکہ بدروح ان کے اوپر اڑ رہی تھی..... وہ دونوں مسجد میں داخل ہو گئے..... انہوں نے امام صاحب کو سب کچھ بتادیا اور امام صاحب نے ان کو پانی پڑھ کر دیا..... اور کہا اس بدروح پر ڈال دو..... اور جب چاندنی اور انتیاز باہر آئے تو اس بدروح پر انہوں نے پانی ڈال دیا اور اس طرح تم لوگوں نے اس بدروح کو ختم کر دیا لیکن مکمل ختم نہ کر سکے..... اور اس کی لاش کو پرانے مندر کے تہ خانے میں ڈال دیا.....

جب سے یہ تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے..... بابا کی باتیں سن کر انہوں نے پوچھا بابا اب ہم کس طرح سارہ کو بچائیں..... بابا نے ان کو پانی دیا اور بولا جاؤ اور جا کر اس پانی کو اس بدروح پر ڈال دو اور اس کی لاش کو جلا دو..... وہ سب سارہ کے گھر گئے تو وہاں انہوں نے اس پر پانی ڈالا اور ویرانے میں جا کر انہوں نے اس شیطان کی لاش کو جلا دیا تو زوردار ہوا چلنے لگی اور پہاڑ لرزے لگا..... وہ سب پہاڑ کے احاطے سے باہر آئے تو پورا پہاڑ زمین بوس ہو گیا..... انہوں نے اپنی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا.....

☆ ☆

”میں اس کا بہترین دوست ہوں آئندہ اسے یوں بلا وجہ سزا دینے کا سوچنا بھی مت ورنہ بہت برا انجام ہوگا تمہارا۔“

جنوبی کو ریا کے چوتھے بڑے شہر ڈیگو کے اس آرام دہ گھر میں اس وقت دوپہر کے تین بجے تھے وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ تیرہ سالہ فی من نہایت خوبصورت خدوخال کا مالک تھا۔

”Yes Yes میں جیت گیا۔“ فی من گاڑیوں کی ریس کا گیم جیتتے ہوئے بولا۔ وہ اس وقت کمرے میں اکیلا تھا۔ اور اپنے آپ ہی بڑبڑا رہا تھا وہ جیت کے بالکل قریب تھا کہ تب ہی اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اس کے مام اور ڈیڈ آگے پیچھے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔

”اوہ امام، ڈیڈ آپ دونوں یہاں میں بس گیم جیتنے ہی والا ہوں۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی مام اور ڈیڈ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اس کے ڈیڈ بولے۔

”فی من اپنا گیم بیچ میں چھوڑ دو ہم تم سے ایک ضروری بات کرنے آئے ہیں۔“

”بس ذرا سی دیر ڈیڈ میں گیم جیتنے ہی والا ہوں۔“ فی من نے کہا۔

”سنائیں تم نے بند کر داسے۔“ اب کی بار وہ ذرا غصے سے بولے۔

”بس ایک منٹ ڈیڈ۔“

فی من بعد تھا۔ اس کے ڈیڈ نے غصے سے اس

من نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔



”ٹھیک ہے بتاؤ کیا وضاحت ہے اس بار تمہارے پاس ٹیل ہونے کی۔“ مام بولیں۔
 ”مام ڈیڈ آپ تو جانتے ہی ہیں امتحانوں سے پہلے میری طبیعت کافی خراب ہوتی تھی لہذا میں تیاری نہیں کر سکا۔“

”بس بچے بہت ہو گیا۔ طبیعت تو تمہاری میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ تمہاری سزا اب یہ ہے کہ جب تک ہم تمہیں کسی سخت سے اسکول میں نہیں بھیج دیتے تمہارے کمرے سے ایک ایک چیز نکال لی جائے گی۔“ اتنا کہہ کر اس کے ڈیڈ اسکا ویڈیو گیم لے کر کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے۔

”آخر آپ لوگوں کو ہو کیا گیا۔“ تی من حیران پریشان سا بولا۔
 ”اب تو تمہیں ہونے والا ہے بچے۔“ اس کی مام یہ کہتے کے ساتھ ہی میز کی دراز کی طرف بڑھیں اور چنگی باہر نکال لی اور پھر اس کے ٹی وی کی تار کاٹ ڈالی۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں مام؟ کیا آپ دیوانی ہو گئی ہیں۔“ تی من اب بستر سے نیچے اتر آیا تھا۔ اس کی مام نے اس کا لپ ٹاپ میز پر سے اٹھایا اور کمرے سے باہر لے گئیں۔ تی من انہیں روکتا ہوا پیچھے پیچھے آنے لگا۔ تب ہی کمرے میں اس کے ڈیڈ داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی اس کی کتابوں کی شیلیٹ میں سے کتابیں نکالنا شروع کر دیں۔

”ڈیڈ پلیز یہ تو رہنے دیجیے یہ تو پڑھنے کی کتابیں ہیں۔“ وہ بے چارہ اب رونے والا ہو رہا تھا لیکن اس کے ڈیڈ نے ایک نہ کنی اور غصے سے کتابیں اس کی طرف کرتے ہوئے بولے۔

”یہ ساری کاک بکس ہیں لڑکے۔ آج سے تم صرف اسکول کی کتابیں پڑھو گے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

تی من بچوں کی طرح رو دیا۔
 اس کے مام باپ شروع سے ایسے ہی تھے معمولی

سی بات پر سخت سزا دینے والے۔ انہوں نے کبھی اس کا اس طرح خیال نہیں رکھا تھا جیسے کہ کسی اچھے مام باپ کو کھنا چاہئے۔ تی من بھی اس وجہ سے بے چارہ الگ تھلک رہتا تھا۔ اس کے والدین بھی کبھی اس سے کوئی بات نہ کرتے نہ ہی کبھی اس پر کوئی توجہ دیتے لیکن بس انہیں یہ لگی رہتی کہ ان کا بیٹا دوسروں کے بچوں میں نمایاں نظر آئے جو کہ والدین کی توجہ کے بغیر ناممکن تھا۔ تی من بھی اپنی دنیا میں مست رہتا کبھی لپ ٹاپ پر دوستوں کے ساتھ چینگ کر رہا ہوتا تو کبھی ٹی وی دیکھ رہا ہوتا تو کبھی کاک بک بڑھ رہا ہوتا یا پھر ویڈیو گیم کھیل رہا ہوتا جو اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت بھی وہ ویڈیو گیم ہی کھیل رہا تھا جب اس کے مام اور ڈیڈ نظر بنے کمرے میں چلے آئے اور آتے ہی اسے امتحانوں میں ٹیل ہونے کی سزا سنائی اور سزا بھی اتنی سخت کہ بے چارہ تی من کا دل خون کے آنسوؤں رہا تھا وہ خاموشی سے بستر پر بیٹھ کر آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔

شام کا وقت قریب آیا تو اس کے ڈیڈ نے اسے کمرے سے باہر بلایا اور اسکول کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھادی۔

”اسے اونچی آواز سے پڑھو۔“ تی من صوفے پر بیٹھ کر پڑھنے لگا تب ہی وہ جتنی سے بولے۔
 ”یہاں بیٹھ کر نہیں سامنے کھڑے ہو کر میرے سامنے پڑھو۔“

”ڈیڈ آخر آپ میرے ساتھ اتنا برا سلوک کیوں کر رہے ہیں۔“ وہ منہ بولا۔

”برا سلوک تو ابھی میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہاں لیکن اگر تم اسی طرح بکواس کرتے رہے تو بتاؤں گا کہ برا سلوک کسے کہتے ہیں۔“ انہوں نے سختی سے کہا۔ وہ بے چارہ پھر پڑھنے لگ گیا جب پڑھتے پڑھتے آدھا گھنٹہ ہو گیا تو وہ تنگ آ کر بولا۔

”ڈیڈ میں مزید دیر یوں کھڑا نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے بیٹھنے کیوں نہیں دیتے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جاؤ اپنے کمرے میں

اکرام کرو۔ لیکن یاد رہے آج رات تمہیں ڈنر نہیں ملے گی۔“ انہوں نے اپنی طرف سے ایک اور دم بلاسٹ کر دیا اب تو تی من شپٹا ہوا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں پڑھ رہا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”دھنیں اب تم کمرے میں جا کر آرام کرو اور تمہارے لئے آج رات کوئی کھانا نہیں ہوگا۔“ سمجھے اب جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ وہ طیش میں آتے ہوئے بولے۔ تی من چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔

اس رات تی من اپنے بستر پر بیٹھا خاموشی سے کتابوں کی خالی شیلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پیر کی طرف دیکھا اس کی تار کٹی پڑی تھی پھر وہ اپنے ویڈیو گیم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور ایک دم اس کا ہو گیا اسے آج رات کھانا بھی نہیں ملا تھا وہ بے چارہ بس ایک کپ کافی پی کر اپنے کمرے میں سوئے کے لئے آ گیا تھا مگر بھلا خالی پیٹ جب چوہے دوڑ رہے ہوں تو نیند کسے آتی ہے۔ وہ بھی بے چارہ کمرے کی لائٹ بجھا کر بستر پر لیٹا کر میٹیں بدل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے مام، ڈیڈ ایسے کیوں ہیں۔ اس کے تمام دوستوں کے مام ڈیڈ تو بہت زیادہ خیال رکھنے والے اور پیار کرنے والے ہیں پھر آخر اسی کے مام، ڈیڈ ایسے کیوں ہیں۔ وہ اس کی سالگرہ والے دن بھی سختی سے پیش آتے ہیں۔ اور دوسرے بچوں کے سامنے اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ان کا بیٹا کتنا نالائق ہے۔ اور تو وہ کبھی اس کے ساتھ تصویر کھینچنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ مام تو بچوں سے بہت لاف کرتی ہے۔ اس پوری دنیا میں مام ہی تو ایسی سختی سے جو اپنی اولاد کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے لیکن اس کی مام کو ہر وقت پارٹیز میں جانے کی لگی رہتی ہے۔ وہ کبھی اس کی طبیعت کو سمجھنے تک کی روداد نہیں تھیں۔

پھر اچانک ہی اسے خیال گیا کہ مام اور ڈیڈ نے آج کہا تھا کہ وہ اسے کسی سخت سے اسکول میں داخل کرائیں گے نامعلوم وہ کونسا اسکول ہوگا، یہ سوچ کرتی

من پریشان ہو گیا اور پھر بھی سوچتے سوچتے اسے نیند مچی آ گئی۔

اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو وہ جلدی جلدی شاور لے کر ناشتے کی میز پر پہنچا۔ رات کو بھوکے پیٹ سویا تھا سو اس وقت خوب زوروں کی بھوک لگی تھی مام نے ہائے ڈیڈ۔ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔ اور جلدی جلدی ناشتہ شروع کر دیا وہ کھانے پر ٹوٹا پڑا تھا۔ ڈیڈ نے تنقیدیں لگا ہوں سے اسے دیکھا تب ہی اس کی مام بول پڑیں۔ ”یہ تم کیا بھوکے نندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹے پڑے ہو۔ کھانا کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ آرام سے کھاؤ سمجھے۔“

”مام پلیز! میں رات کو خالی پیٹ سویا تھا۔“ تی من نے رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”خالی پیٹ سوئے تھے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کھانے کے آداب بھول جاؤ۔“ مام بولیں۔

”اچھا ہاں سنوتی من، میں نے اور تمہاری مام نے تمہارے لئے ایک اسکول دیکھا ہے ہم تمہیں وہاں داخل کر رہے ہیں۔“ ڈیڈ نے بتایا۔

”اچھا وہ اسکول کہاں ہے؟“ تی من نے پوچھا۔

”وہ اسکول یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔“ ڈیڈ نے بتایا تو تی من اپنی جگہ سے اچھل ہی تو پڑا۔

”تین گھنٹے کی ڈرائیو پر تو بھلا میں روزانہ آنا جانا کیسے کروں گا۔“

”تم وہاں سے آنا جانا نہیں کرو گے تم وہیں رہو گے۔“ مام بولیں۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔

”مطلب یہ کہ اسکول میں ہی باسٹل بھی ہے تم وہیں رہو گے اور ہاں نہ ہی وہاں ٹی وی دیکھنے کی سہولت ہے اور نہ ہی ویڈیو گیمز کھیلنے کی اجازت ہے اور نہ ہی کاکس رکھنے کی اجازت ہے۔ ہاں کمپیوٹر کی سہولت وہاں

ہوگی۔“ ڈیڈ نے تو گویا اس پر ہم بلاسٹ کر کے رکھ دیا۔
”نہیں، نہیں، نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ میرے
ساتھ ضرور کوئی مذاق کر رہے ہیں۔“ وہ بری طرح گھبرا کر
بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کوئی تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہا۔
اور آرام سے بیٹھ کر اپنا ناشتہ کرو کل رات بھی تم بھوکے
سو گئے تھے۔ اور ہم اتنے ظالم ماں باپ نہیں ہیں کہ تمہیں
بھوکا مار دیں۔“ ڈیڈ نے کہا۔

”یہ آپ لوگ میرے ساتھ زیادتی کر رہے
ہیں۔ اچھا نہیں کر رہے ہیں یہ آپ لوگ میرے ساتھ۔“
ٹی من اب بالکل روئے والا ہو گیا تھا۔ آنکھیں بھی
بھرا آئی تھیں۔

”مجھے ایک موقع اور دیجیے۔“ اب کی بار میں
ایگزائمز میں اچھے نمبرز لاؤں گا۔“ وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔
”ہمیں تمہاری کوئی بات نہیں سنی سمجھے؟“ نام
نے سختی سے کہا تو ڈیڈ نے ٹی من کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس
کر بیٹھا۔ ”چلو ناشتہ کرلو۔ خواہ بخواہ روئے دھونے
سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ ٹی من نے آنسو صاف کئے
اور خاموشی کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔

ٹی من کے مام اور ڈیڈ اسے جلد از جلد دوسرے
اسکول بھیجنا چاہتے تھے لہذا انہوں نے اسے اپنا سامان
پیک کرنے کا کہہ دیا۔ وہ بے دلی سے اپنا سامان پیک
کرنے لگا۔ اور پھر ایک ہفتے کے اندر اس کے ڈیڈ اسے
اپنی کار میں بٹھا کر دو روزانہ کے علاقے کے اسکول میں
لے گئے۔ سارا سفر خاموشی میں گزرا۔ ٹی من سارا وقت
کھڑکی کے باہر جھانکتا رہا۔ وہ اپنے ڈیڈ کی طرف دیکھنا
بھی نہیں چاہتا تھا وہ ان سے سخت ناراض تھا اور دوسرے
وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی اتاری ہوئی صورت دیکھیں
وہ ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ بھلے نہیں اس کی کوئی پرواہ
ہو یا نہ ہو بھلے وہ اس کے ساتھ جیسے مرضی پیش آئیں
اسے اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے انہیں اس کی
پرواہ نہیں ہے ایسے ہی اسے بھی اسے بھی ان کی کوئی پرواہ
نہیں ہے۔ لیکن اندر سے اس کا دل رور رہا تھا۔ تقریباً تین

گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ ایک جنگل نما جگہ پر آ گئے
۔ یہاں دو درخت کوئی آبادی نہیں تھی ہاں البتہ سامنے
ایک بہت بڑی عمارت نظر آ رہی تھی جو بے شک اس
اسکول کی تھی۔ ”یہ رہا تمہارا نیا اسکول، پسند آیا؟“ اب کی
بار ڈیڈ نے مسکرا کر پوچھا۔ تو وہ بے چارہ زبردستی مسکرا دیا۔

”چلو اندر چلتے ہیں۔ اپنا سامان گاڑی سے باہر
نکالو۔“ ٹی من نے بے دلی سے اپنا سامان گاڑی سے
باہر نکالا اور ڈیڈ کے ساتھ اسکول کی عمارت میں داخل
ہوا۔ یہ عمارت ذرا پرانی طرز کی تھی اندر داخل ہوتے ہی
ٹی من نے پیچھے مڑ کر دیکھا دروازہ بند ہو رہا تھا اسے یوں
لگا جیسے یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو رہا ہے۔

”چلو پرنسپل کے آفس میں چلتے ہیں۔“ اس کے
ڈیڈ نے کہا۔ تو وہ خاموشی کے ساتھ ان کے پیچھے چل دیا۔
پرنسپل کے آفس میں اجازت لے کر اندر داخل
ہوئے سامنے ایک عمر رسیدہ سخت سے نظر آنے والے
پرنسپل اپنی ٹیبل کے پیچھے کرسی پر براجمان تھے۔

”آئیے تعریف رکھیے۔“ انہوں نے ڈیڈ سے
ہاتھ ملایا اور پھر ٹی من سے وہ دونوں ٹیبل کے سامنے رکنی
دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ٹی من کو اپنے سامنے بیٹھے پرنسپل
سے بے حد خوف آ رہا تھا۔

”میرا نام گمن ہو ہے۔“ پرنسپل نے اپنا نام بتایا۔
”جی اور میرا نام جنرل دو ہے۔ خوش قسمتی سے یہ
میرا بیٹا ہے ٹی من لیکن بد قسمتی سے نہایت کمزور لالچ
ہے۔ آپ پلیز اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے گا۔“ ڈیڈ
نے کہا تو ٹی من ادا اور شرمندہ سا نظر آنے لگا۔ پرنسپل
جلدی سے مسکراتے اور بولے۔

”آپ بے فکر رہیں ہم پیار سے ہی اسٹوڈنٹس
کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔“
”وہ تو ٹھیک ہے۔ پرنسپل صاحب لیکن یہ پیارت
سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔“ ڈیڈ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
”آپ بے فکر رہیں ہم سنبھال لیں گے۔“ کچھ
دیر مزید بات چیت کرنے کے بعد ڈیڈ وہاں سے جا۔
گئے تو ٹی من نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”ڈیڈ پلیز مجھے کال کر دیں گا۔“

”ہاں ضرور کروں گا۔“ وہ اتنا کہہ کر اپنا ہاتھ
چھڑاتے اسکول کی عمارت سے باہر نکلتے چلے گئے۔ ٹی
من انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

تب ہی اچانک پیچھے سے کسی نے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا سامنے
پرنسپل صاحب کھڑے تھے۔

”آ جاؤ ٹیک میں پہلے تو تم سے کچھ باتیں کرنی
پڑیں گی۔“ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اسے
اپنے ساتھ لے کر ایک پارک پر اپنے آفس میں آ گئے۔
”Well تو تمہارے ڈیڈ نے بتایا ہے کہ تم
مارے پیچھے میں فیل ہو گئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں
کیوں؟“ انہوں نے رعب سے پوچھا۔

”میرا میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے تیاری
نہیں کر سکا۔“ ٹی من نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت خوب بہانے اچھے کر لیتے ہو تم جب ہی
تو شاید تمہارے والدین نے تمہیں یہاں ڈلوادیا۔ لیکن
بے فکر ہو یہاں ہم تمہاری طبیعت خراب نہیں ہونے
دیں گے۔ اب اپنا سامان لاؤ سب سے پہلے تو اپنا سامان
پیک کرواؤ۔“ اتنا کہہ کر پرنسپل گمن ہونے اس کا سوٹ
کیس کھول ڈالا اور سارا سامان الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے
اس میں انہیں MP3 نظر آیا۔ انہوں نے ایک دم
گھور کر اسے دیکھا اور پھر وہ سامان میں سے نکال لیا
برہوئے۔

”جس دن تمہیں اس اسکول سے گھر جانے کی
اجازت ملے گی اس دن اب یہ تمہیں ملے گا۔ اس سے
پہلے اسے آخری بار دیکھ لو۔“ اتنا کہہ کر پرنسپل نے وہ اس
کی نظروں کے سامنے لہرایا اور ایک طرف ہٹا کر رکھ دیا۔
انہوں نے اس کا سوٹ کیس بند کیا اور اسے تھما دیا۔

”ہاں سب ٹھیک اب تم اپنے کمرے میں جا سکتے
ہے۔“ اتنا کہہ کر پرنسپل صاحب نے ٹی من کو اس کے
کمرے میں بھیج دیا۔ وہ اپنا سوٹ کیس لے کر اپنے
کمرے میں پہنچا۔

ٹی من نے دھیرے سے دروازہ کھولا
اور اندر کمرے میں قدم رکھا تو اپنے سامنے اسے تین
لڑکے اور دکھائی دیئے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔
”ہائے۔“ وہ سب ایک ساتھ بولے۔

”ہائے تم لوگ میرے کمرے میں؟“ ٹی من
نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کمرہ نہیں یہ ہمارا کمرہ بھی ہے۔“ ایک
لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو یعنی ہم سب ایک روم شیئر کریں گے؟“ ٹی
من نے پھر حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں بالکل یار اور نہیں تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ یہ
کوئی فائیو سٹار ہوٹل ہے جو تمہیں رہنے کے لئے الگ
سے کمرہ ملے گا۔“ اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویسے تمہارا نام جان سکتا ہوں۔“ اس نے
پوچھا۔

”میرا نام ٹی من ہے۔“ ٹی من نے مسکراتے
ہوئے اپنا سوٹ کیس ایک طرف رکھا اور اس لڑکے سے
ہاتھ ملایا۔

”میرا نام سی جن ہے۔“ اس نے بتایا۔ باقی کے
دو لڑکے بھی آگے آئے۔ ”میرا نام دوگک دو ہے۔“ ایک
موٹے سے لڑکے نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے
اس سے ہاتھ ملایا میرا نام جی سنگ ہے تیرے لڑکے
نے اس سے ہاتھ ملایا وہ ان تینوں میں سب سے
خوبصورت تھا۔

دوگک دو لگتا ہے تم پڑھائی میں بہت اچھے ہو ورنہ
میرا تو حال ہی نہ پوچھو؟“ ٹی من نے دوگک دو کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ایسا کیوں لگا؟“ اس نے حیرت
کا اظہار کیا۔

”تمہارے چشمے سے۔“ سچ بتاؤ تمہیں پڑھتے
پڑھتے چشمہ لگ گیا نا؟“ ٹی من نے پوچھا۔

”ارے نہیں یار یہ تو یونہی میری نظر کمزور ہے
ورنہ تو میں پڑھائی میں بالکل پیچھے ہوں۔“ دوگک دو نے

افسوس سے کہا۔

”کیا واقعی؟“ تی من کو حیرت ہوئی۔

”ہاں واقعی اور ویسے بھی میں پڑھائی میں سب سے پیچھے ہوں جب ہی تو میرے والدین نے میرا یہاں داخلہ کرایا ہے۔“ دو ٹوک دوئے بتایا۔

دوستوں میں بھی پڑھائی میں سب سے پیچھے ہوں۔
میرے والدین بھی مجھ سے بے حد تنگ ہیں انہوں نے بھی
تنگ آ کر مجھے یہاں ڈال دیا ہے۔ ”تی من نے بتایا۔

”سمجھ نہیں آ رہا ہمارے والدین ہم سے تنگ آ کر ہمیں اسی سخت سے اسکول میں کیوں داخل کر رہے ہیں۔“ تی من نے کہا۔

”اسی لئے تو انہوں نے ہمیں اس سخت سے اسکول میں داخل کرایا ہے کیونکہ وہ ہم کو ناپسند کرتے ہیں۔“ جی سنگ نے کہا۔

”مجھے نہیں آتا حالانکہ میں تو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ان کی اکلوتی اولاد ہوں پھرنا معلوم یہ سب کیوں۔“ تی من اداس لہجے میں بولا۔

”خیر چھوڑ دیے سب آؤ تمہیں اسکول دکھاتے ہیں۔“ کسی جن نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
”ہاں پلیز! ضرور دکھاؤ! ویسے یہ اسکول ہے

کیسا؟“تی من نے اچانک ہی خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

گادوہ تم خود دیکھ لو گے۔“ جی سبک نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
 ”کیا مطلب؟“ تی من نے چونک کر دیکھا۔

”مطلب تم ابھی خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ چلو ہمارے ساتھ چھہیں اس اسکول کی سیر کرائیں۔“ جی سنگ نے ایک بار پھر اسی شریہ لہجے میں جواب دیا تو توئی من

خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا وہ اسے لے کر کلاس رومز دکھانے لگے۔ ”یہ ہماری کلاس ہے، یہاں سے سوئمنگ پول بھی نظر آتا ہے۔“ سی جن نے بتایا۔

سوئمگ پول نظر آرہا تھا۔ ”ارے واہ۔ یہ تو بہت ہی عالی شان نظارہ ہے۔“ ”تی من خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”باہر چل کے دیکھو اور بھی عالی شان نظارے ہیں۔“ اتنا کہہ کر جی سنگ اسے اپنے ساتھ کلاس سے باہر لے آیا۔ دو گنگ دو اور سی جن بھی ساتھ میں تھے۔ وہ

تینوں اسے لے کر اسکول کے ایک ایسے حصے میں آ گئے
جہاں بالکل خالی اور ویران سا لگ رہا تھا۔
”یہ کون سی جگہ ہے؟“ فی من نے پوچھا۔

”ہاہاہا! ارے یہی تو اصل جگہ ہے۔ یہی تو وہ جگہ ہے جو ہمارا مقام ہے اور خدا نہ کرے مستقبل میں تمہارا بھی مقام بن سکتا ہے۔“ جی سنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں؟“ قی من نے حیرت سے سر کھجایا۔

لوہے کی سلاخوں والا ہے اس کمرے میں اسٹوڈنٹس کوہڑا کے طور پر بند کیا جاتا ہے۔“ دو جگہ وونے بتایا۔“
 ”ناہمکن..... تم لوگ ضرور میری ٹانگ کھینچ رہے

”پشمنی روم“

”ارے نہیں اب یہ کیا ہے۔ اب کیا کسر رہ گئی ہے۔“ قتی من بڑبڑایا۔

دو تگ دو ونس دیا پھر بولا۔ ”یہ کمرہ اب استعمال نہیں ہوتا یہ کمرہ سالوں سے بند پڑا ہے ہم نے کبھی اس کمرے کے اندر جا کر نہیں دیکھا۔ اس کے بارے میں

مشہور ہے کہ یہاں تمام اسٹوڈنٹس کوزا میں دی جاتی تھیں۔ جس کی کو بھی سخت سزا دینی ہوتی اسے یہاں لے آتے۔ پھر ایک دن کسی لڑکے نے یہاں خودکشی

کر لی۔ اس نے خود کو پچاسی دے ڈالی۔ اس کے بعد سے یہاں کوئی نہیں آتا۔ تب سے یہ جگہ بالکل ویران پڑی ہے۔ یہاں آنا منع تو نہیں ہے لیکن اس تالے کو کھولنا

”واقعہ یہ جگہ تو بے حد پراسرار ہے۔ لیکن دیکھنا

”ارے کیا باؤ لے ہوئے ہو تم۔ ایسا کرنے کا

”میں سب کے سامنے تھوڑی چپکے سے یہ کام

نزدیک کھڑا کسی جن سونامی لڑکے سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ قی من نے حیرت سے پوچھا
اس لئے کیونکہ وہاں ان چاروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔
تینوں لڑکے اسے لے کر واپس جانے لگے۔

”یہ بے چارہ پاگل ہے۔ سنا ہے کہ جب اس لڑکے نے خودکشی کی تھی تو اس کے بعد اس نے یہاں اسکول میں کچھ دیکھ لیا تھا۔ بس تب سے یہ اپنا جینی توازن

”اس بے چارے کا نام کیا ہے۔ اور یہ یہاں کیا کرتا ہے؟“ تی من نے پوچھا۔

”ہاں اب یہ تم نے دلچسپ سوال پوچھا اس کا نام
 ۱۔ اوں ہے۔ اور یہ یہاں کے پرنس صاحب کن ہو کا چھوٹا
 بھائی ہے۔“ سی جن نے بتایا۔

”اے نہیں کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ کیا واقعی یہ؟“
 من نے حیرت سے آنکھیں پھلائیں۔
 ”ہاں بالکل سچ۔“ سی جن نے کہا۔ اور پھر تینوں

لڑکے واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ جی سنگ اسے
ہنا کیمرہ دکھانے لگا وہ ایک ڈیجیٹل کیمرہ تھا اس نے
سے کیمرے میں سے بے شمار تصویریں دکھائیں اس

لیا اور پھر اسکول یونیفارم پہن کر تیار ہو گیا۔

اس کے پاس اب ناشتہ کرنے کا وقت بھی نہیں بچا تھا۔ لڑکوں نے اس سے کہا کہ "اس نے اسٹے میں ویسے ہی بہت دیر کر دی ہے اگر وہ سزا سے بچنا چاہتا ہے تو جلدی سے گراؤنڈ میں ورزش کرنے پہنچے۔" وہ جلدی جلدی گراؤنڈ میں پہنچا اور دھاگھنڈہ یونہی سب کو ورزش میں گزر گیا۔ پھر سارے لڑکے اپنی کلاسز میں چلے گئے تی من بھی ان تینوں کے ساتھ اپنی کلاس میں پہنچا اس کی سیٹ اتفاق سے سی جن کے آگے ہی تھی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

پہلا پریڈ شروع ہوا ہن ہونا نامی ٹیچر اندر چلے آئے ان کے اندر آتے ہی پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ "مڈ مارننگ اسٹوڈنٹس" انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔

"تو ایسا ہے کہ یہاں آج ایک نیا چہرہ بھی ہمارے بیچ موجود ہے۔" تی من غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ایسے حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو لڑکے میں تمہاری ہی بات کر رہا ہوں۔ اٹھا اپنی جگہ سے ادھر آؤ اور اپنا تعارف کراؤ۔" انہوں نے حکم دیا تو تی من خاموشی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے برابر پوری کلاس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"میرا نام تی من ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"اور یہ بھی تو بتاؤ کہ تم یہاں کیوں لائے گئے ہو۔" ہن ہونے طوفی اس کی طرف دیکھا۔

تی من پہلے تو تھوڑا حیران ہوا پھر اس کی نظر دونگ وپر پڑی وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ داری سے کام لینے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"میں تمام پیرز میں قیل ہو گیا تھا اس لئے میرے والدین نے مجھے یہاں داخل کرایا ہے کیونکہ یہ اسکول بہت اچھا ہے تاکہ یہاں رہ کر میں اچھی طرح پڑھ سکوں۔" تی من نے قدرے بھولپن سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم واپس اپنی جگہ پر بیٹھ سکتے ہو۔" ٹیچر ہن ہونے کہا تو تی من شرمندہ شرمندہ سا اپنی جگہ واپس جا کر بیٹھ گیا۔

پوری کلاس خاموش تھی کسی کے سانس تک لینے کی آواز نہیں آ رہی تھی پھر کچھ دیر یونہی پڑھائی میں گزر گئی۔ ٹیچر ہن ہو بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور پوری کلاس اس طرف متوجہ تھی سوائے تی من کے وہ کھڑکی میں سے باہر سوئمنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیچر نے ایک دوبار اس کا نام لیا لیکن جب وہ متوجہ نہ ہوا تو وہ خود اس کے پاس چلے آئے۔ تی من اب بھی سوئمنگ پول کی طرف دیکھ رہا تھا ہن ہونے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ "کدھر دھیان ہے تمہارا لڑکے، میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" اب تو تی من شپٹا گیا اس بے چارے کو واقعی ان کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

"کیا کر رہے تھے؟" "کک کچھ نہیں۔" تی من نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا گریبان اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ "تم کھڑکی سے باہر سوئمنگ پول دیکھ رہے تھے ہے نا۔"

"جی جی..... وہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔" "جی۔" تی من نے ایک بار پھر مصحوبیت سے جواب دیا۔

"چلو آؤ باہر جا کر تمہیں اس کی سیر کراتا ہوں۔" اتنا کہہ کر انہوں نے تی من کو کھینچ کر کھڑکیا اور اسے کلاس سے باہر لے گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی کلاس میں شور مچا گیا۔

"ارے نہیں بے چارہ تی من مارا گیا۔" یہ جی سنگ کی آواز تھی۔ پھر اچانک ہی سی جن نے سب کا دھیان کھڑکی کے باہر سوئمنگ پول کی طرف دلایا۔ "وہ دیکھو وہ رہائی من۔" اس نے کہا۔ ٹیچر ہن ہوئی تی من کو لئے سوئمنگ پول کی طرف بڑھ رہے تھے وہاں لے جا کر وہ اسے سوئمنگ پول میں دھکا دینے لگے۔ تب ہی تی من حیرت سے چلا پڑا۔

"سر یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"تم ہوتے کون ہو مجھ سے یہ پوچھنے والے۔" بہت پسند ہے ناں تمہیں سوئمنگ پول تو جاؤ مزے کرو۔" اتنا کہہ کر ٹیچر ہن ہونے اسے پانی میں دھکیل دیا۔ وہ بے چارہ اتنی ٹھنڈ میں نہ بہت پانی میں گرتے ہی تڑپ کر رہ گیا۔

"مزے کر لئے ہوں تو باہر آ جاؤ۔" انہوں نے کہا تو بے چارہ تی من سردی سے کانپتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ اسے لے کر واپس کلاس میں آگے اور اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ بے چارہ تی من سر سے پیر تک ہچکا ہوا تھا۔

"جب یہ پریڈ ختم ہو جائے تو جا کر کپڑے پیچ کر لیتا۔" انہوں نے سختی سے جواب دیا۔ تی من نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ بے چارہ سارا پریڈ سردی سے کانپتا رہا۔ سی جن نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہل دیئے کے لئے اپنا ہاتھ رکھا۔ جب پریڈ ختم ہوا اور ٹیچر ہن ہو ہاتھ کی سنگ جھٹ سے بولا۔

"دیکھ لیا کیسے جلاد ہیں یہاں کے ٹیچر، چھوٹی ہوئی بات پر سزا دیتے ہیں۔"

"میں کپڑے پیچ کر کے آتا ہوں۔" تی من نے کہا اور پیچ کرنے چلا گیا۔ وہ واقعی حیران پریشان تھا کہ یہ اسکول ہے یا جیل۔ یہ اسکول تو اس کی توقع سے بھی کچھ کہیں زیادہ خراب نکلا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے والدین نے اس اسکول میں ایسی کیا خوبی دیکھی جو اسے یہاں ڈالوا۔ انہیں آخر کیوں ایسا لگا کہ اس سے پیار نہیں کرتے؟ لیکن نہیں بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے وہ دونوں تو دنیا کے سب سے اچھے ماں باپ ہیں۔ تی من نے خود کو ٹپکی دی اور پھر اس نے سوچا کہ وہ فون اپنے مام ڈیکو اس سب کے بارے میں بتائے گا۔

اگلے روز تی من صبح وقت براٹھ گیا۔ ہاٹ شاور کے بعد اس نے ٹیچر روم میں ناشتہ کیا۔ "آج کے دن بہت سنبھل کے رہوں گا کوئی ایسا کام نہیں کروں گا کہ پرنیچر مجھے سزا دیں۔" تی من نے تینوں لڑکوں سے۔

"چاہے جتنا مرضی بیچ کے رہ لو سزا تو تب بھی تمہیں مل کر ہی رہے گی۔" جی سنگ نے کہا۔

"یہ درست کہہ رہا ہے یہاں کے اصول تو تم نے دیکھ ہی لئے ہیں۔ کتنے انوکھے ہیں۔" دونگ دو نے کہا۔ "ہاں یہ بات بھی ہے۔" تی من نے کہا۔ لیکن اس بے چارے کو خبر نہ تھی کہ اس کی ساری کوششیں ناکام جانے والی ہیں۔ ناشتے کے کچھ ہی دیر بعد جب سارے لڑکے ورزش کرنے گراؤنڈ میں پہنچے تو اچانک ورزش کرتے کرتے تی من کے جوتے کھل گئے وہ انہیں باندھنے کے لئے جیسے ہی جھکا ورزش کے ٹیچر من جن نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ "اسے لڑکے ادھر آؤ کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے رعب سے پوچھا۔

تی من نے اپنا نام بتایا اور ان کے پاس چلا گیا۔ "جب تم سے ورزش کرنے کو کہا گیا تو تم اپنے جوتوں کے ساتھ کیوں کھیل رہے تھے۔" من جن نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"نہیں سر وہ میرے جوتے کھل گئے تھے۔" تی من بری طرح بوکھلا یا۔ "اب جو کرنا ہو وہ وہاں جا کے کرنا۔" اتنا کہہ کر ٹیچر من جن نے اسے بازو سے پکڑا اور اسی جگہ لے آئے جہاں وہی سلاخوں کے دروازے والا کمرہ تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اسے اندر بند کر دیا تی من اپنا سامنے لے کر رہ گیا ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد وہ اس کمرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ تب ہی اس کی نظر فرش پر پڑ گئی۔ والے لال بیگ پر پڑی وہ ایک دم ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ لال بیگ اور دوسرے کیڑے مکوڑوں سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک بار پھر یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ آخر اس کے مام ڈیکو نے اسے اس اسکول میں کیوں داخل کرا دیا۔ کیا انہیں پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ یہ اسکول کتنا خراب ہے۔ یا انہیں معلوم تھا؟ وہ جانتے تھے؟ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ یہاں اسٹوڈنٹس کے ساتھ کئے جانے والے سلوک سے بالکل انجان ہیں۔ ورنہ میں تو ان کا اپنا پیا رابٹا ہوں وہ میرا برا کبھی نہیں چاہیں گے۔

سوچتے سوچتے قی من کی نظریں باہر کچھ فاصلے پر بنے
پشیمت روم پر پڑیں۔ اور وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا
کہ آخراں سزاوانے کمرے کا معمر کیا ہے آخر کیوں جن
سوتے خود کشی کی اور اس کی روح اس کمرے میں قید کیوں
ہے؟ اور اس کے مرنے کے بعد لاوان نے ایسا کیا دیکھا
کہ اپنا قاضی تو ازان کھو بیٹھا۔ وہ ضرور ایک روز ان سارے
رازوں پر سے پردہ اٹھا لے گا۔ وہ ایک ایک راز فاش
کر کے رہے گا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ٹیچر جن جن
نے آخر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک دم ہی اپنی
سوچ کے پردے سے باہر نکلا۔

”چلو اب کلاس میں تمہاری سزا پوری ہوئی
۔“ انہوں نے کہا تو قی من ان کے پیچھے اپنی کلاس میں
چل دیا۔
ابھی ایک ہی پریڈ گزارا ہوگا کہ دوسرے ٹیچر بیون
وہ اپنی کلاس لینے چلے آئے۔ انہوں نے آتے ہی قی
من کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور پھر بولے۔
”قی من، میں نے سنا ہے کہ آج پھر تمہیں
ورڈش کے وقت سزا ملی۔ آخر تم آتے ہی ان سب کے
ریکارڈز کیوں توڑ رہے ہو۔“ انہوں نے باقی لڑکوں کی
طرف طنز یہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں لیا ہے سر۔ مجھے یونہی خواہ
مخواہ چھوٹی چھوٹی بات پر سزا دی جا رہی ہے۔ اور وہ بھی
اتنی سخت۔“ قی من روٹھے روٹھے لہجے میں بولا تو بیون
وہ تو جیسے غصے سے ہلک ہی ہو گئے۔
”کیا کہا لڑکے ذرا پھر سے کہہ کر دکھانا میں
تمہاری زبان سمجھ لوں۔“ اتنا کہتے ہی وہ اپنی جگہ سے
اٹھے اور زور دیک بکچ کرتے قی من کو گرجاں سے پکڑ لیا۔
پھر گرج کر بولے۔ ”سخت سزا تو تمہیں ابھی
بک مل ہی نہیں ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ کہتے ہیں سخت
سزا۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی لکڑی کی
اسک سے قی من کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا وہ بے
چارہ اف اف کرتا رہ گیا۔ جی سنگ، جی جن اور دو رنگ دو
اپنا سر پکڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جب بھی ایسی

صورتحال ہوتی تو پوری کلاس میں سنا سنا جھماکتا۔ اس
وقت بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ جب وہ اسے مار مار کر اپنا
جنون اس پر اتار چکے تو تھک کر واپس اپنی کرسی پر
جا کر بیٹھ گئے۔
”بے ہودہ بدتمیز لڑکا ہونہ۔“ وہ غصے سے ٹائی کی
ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولے۔
قی من سخت پریشان تھا اس نے تو سوچا تھا کہ سزا
سے زیادہ سے زیادہ بچے گا۔ لیکن اسے تو ساری سزائیں
آج ہی مل رہی تھیں۔ ہاف بریک کے وقت قی من
بہت بے چین ہو رہا تھا اس اسکول میں نہ فی وی کی
سہولت تھی نہ کوئی کہانی کی کتاب پڑھنے کی اجازت تھی نہ
ہی ویڈیو گیمز نہ ہی ایم بی ٹی تھری کچھ بھی تو نہیں تھا یہاں وہ
بری طرح بور بور ہوتا تھا کھر پر تو وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی
رہتا تھا لیکن یہاں تو ان لوگوں نے قید کر کے
رکھا ہوا تھا۔ اس سے مزید صبر نہ ہوا تو وہ سزاوانے کمرے
کا راز جاننے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ پہلے وہ پشیمت روم
کے باہر پہنچا تالے کو ہلا جلا کر دیکھا لیکن وہ بہت بھاری
اور مضبوط تالا تھا۔ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں تھا۔
اس نے اسے توڑنے کے لئے آس پاس میں کوئی چیز
تلاش کی لیکن کچھ نہ ملا۔
مجبوراً اس نے اسکول کے باہر لان میں سے
ایک بڑا اور بھاری پتھر اٹھایا اور اسے لے کر واپس
اندرا سی جگہ آ گیا۔ پہلے اس نے اوپر اوپر دیکھا جب تکلی
ہو گئی کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو اس نے پتھر کو زور سے
تالے پر دے مارا۔ زور کی آواز پیدا ہوئی۔ لیکن تالا نہ
ٹوٹا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی چند لمحوں کی کوشش۔
تالا ٹوٹ گیا۔ قی من نے پتھر ایک طرف پھینکا ہاتھ
جھاڑے اور دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔
دروازہ چرکی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ قی من نے
کمرے میں قدم رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسنے عرصے
سے یہ کمرہ بند ہے یہاں تو بدبو ہوئی ہوگی لیکن وہاں
تو عجیب قسم کی بڑی پیاری خوشبو آ رہی تھی قی من کمرے
کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مختلف سامان فرنیچر وغیرہ

اور کمرے کے بیچ میں ایک لکڑی کی کرسی گری ہوئی تھی
اس کے اوپر قی من نے نگاہ کی تو سناٹے میں آ گیا۔
چھت پر ایک بچائی کا پھندہ لٹک رہا تھا قی من
سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہی وہ بچائی کا پھندا ہے جس
پر اس لڑکے نے خود کو لٹکا یا تھا ابھی وہ کمرے کا مزید جائزہ
لے رہا تھا کہ اسے کمرے کے باہر سے کسی لڑکے کے بولنے کی
آواز سنائی دی۔
”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ تم یہاں کیا
کر رہے ہو؟“

قی من نے اپنی چوری پکڑے جانے کے ڈر
لے وہاں دیکھا تو اسی طرح ایک سیدھا سادہ معصوم سا
لڑکا کمرے کے باہر کھڑا اسے باہر بلا رہا تھا۔
”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ دراصل میں دیکھ رہا تھا کہ اس
کمرے میں کیا ہے۔“ قی من نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم کیا کر رہے
تھے۔ لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اگر کسی کو پتا
چل گیا تو بڑی لکڑی سزا ہو جائے گی۔“ اس لڑکے نے
کہا۔

”ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن تم تو کسی کو اس
کمرے میں کچھ نہیں بتاؤ گے نا؟“ قی من نے ایک دم
گھبرا کر پوچھا۔

”بے شک نہیں۔۔۔۔۔ بالکل نہیں کبھی نہیں
روپیے بھی میں تمہیں اتنا برا لگتا ہوں کیا۔۔۔۔۔ میں تو خود
اس کے نظام سے تنگ ہوں۔“ اس لڑکے نے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ قی من نے پوچھا۔
”ہنگ جن۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا اور قی
من سے ہاتھ ملایا اس نے بھی اپنا نام بتایا اور خوشی اس
کا ہاتھ ملایا۔

”سنا ہے کہ جن سونے یہاں خود کشی کر لی تھی؟“
قی من نے ہنگ جن کو بتایا۔

”اس نے خود کشی نہیں کی تھی۔ اسے مارا گیا تھا۔“
جن نے انکشاف کیا۔

”مارا گیا تھا لیکن کس نے مارا۔“ قی من حیرت

سے اچھل پڑا۔
”یہ بات تو ایک معمر ہے لیکن اس کے مرنے
کے بعد جن سو کی روح بے قابو ہو گئی اور وہ پورے اسکول
میں راج کرنے لگی۔ اساتذہ کے کام بگاڑنے لگی۔ تب
ہی اساتذہ نے منتظر پڑھ کر اس کی روح کو یہاں قید کر دیا
اور یہی بات لاوان کی تو اس نے روح کو بھیا تک روپ
میں دیکھ لیا تھا اس لئے وہ اپنا قاضی تو ازان کھو بیٹھا۔“ ہنگ
جن نے بتایا۔

”کیا واقعی؟“ قی من نے حیرت سے پوچھا۔
”ہاں واقعی۔۔۔۔۔ اب چلو یہاں سے چلتے ہیں کسی
نے دیکھ لیا تو خیر نہیں ہماری۔“ ہنگ جن نے کہا تو قی من
بھی وہاں سے چل دیا۔

بریک کا وقت ختم ہوا تو تمام لڑکے اپنی کلاسوں
میں واپس آ گئے پر پہل گن ہو کلاس کا راؤنڈ لینے آئے
ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سے شدید غصہ اور خوف
جھلک رہا تھا۔ ”تم میں سے کس کم بخت نے سزا کے
کمرے کا دروازہ کھولا۔“ انہوں نے غصے سے کپکپاتی
آواز میں پوچھا۔

یہ سنتے ہی پوری کلاس میں سرگوشیاں سی ہونے
لگیں کیونکہ کسی کی بھی توقع میں ایسی بات ہرگز نہیں تھی
کہ آج ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

”میں پوچھتا ہوں کس کم بخت نے وہ تالا توڑا۔“
”ہم نے نہیں توڑا سر۔۔۔۔۔ ہم تو وہاں جاتے بھی
نہیں۔“ سب لڑکوں نے فوراً سے کہا۔

”ہاں نہیں جاتے لیکن آج وہاں کوئی گیا ہے
۔۔۔۔۔ شرافت سے بتا دو کہ یہ کام کس کا ہے ورنہ بہت برا
ہوگا۔“ تمام لڑکے سہمے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے
رہے۔

”ٹھیک ہے تو پھر سزا سب کو ملے گی۔ اسی وقت
سارے لڑکی سوئمنگ پول کے ٹھنڈے پانی میں چھلانگ
لگائیں جا کر اور پانچ منٹ سے پہلے کوئی باہر نہیں آئے
گا۔“ پرنسپل گن ہونے چچ کر کہا تو سارے لڑکے اپنی سزا
پوری کرنے پہلے گئے۔ قی من کو اپنی وجہ سے سب کو سزا

ملتا دیکھتا برا تو لگ رہا تھا لیکن پرنسپل صاحب کے سامنے جج بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

اس رات فی من نے اپنے گھر فون ملایا۔ تین بار تیل بچنے پر اس کے ڈیڈے نے فون اٹھایا۔

”ہیلو؟“ انہوں نے کہا۔

”ہیلو ڈیڈے میں فی من بات کر رہا ہوں۔“ فی من بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”اور سناؤ بڑھائی کسی چل رہی ہے۔ کچھ سیکھا وہاں جا کے یا بس یونیورسٹی گھر کی طرح فارغ بیٹھے ہو۔“ ان کے لہجے میں اپنے بیٹے فی من کی آواز سن کر کسی قسم کی کوئی خوشی نہیں تھی۔

”ڈیڈے آپ تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں کا نظام بے حد خراب ہے معمولی سی بات پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں مجھے آج خود تین بار سزا ملی ہے۔“ فی من نے جلدی جلدی بتایا۔

”کیا کہا؟ تین بار سزا ملی ہے۔ شرم آنی چاہیے جنہیں ایسا کیا کر دیا تم نے کہ تمہیں ایک ہی دن میں تین بار سزا ہو گئی سدھر جاؤ فی من اتنی ڈھٹائی اچھی نہیں ہوتی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے وہاں جا کر بھی کچھ نہیں سیکھا میرا تو خیال تھا جب میرا بیٹا وہاں سے پڑھ کر نکلے گا تو ایک نیائی من بن چکا ہوگا۔ لیکن تم تو.....“

اف بس بہت ہو گیا..... میں پرنسپل سے بات کروں گا کہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئیں اور ایک بات اور سن لو آئندہ مجھے تمہاری طرف سے کوئی شکایت نہ سننے کو ملے۔“ انہوں نے سختی سے کہا۔

”لیکن ڈیڈے میری بات تو سنیں۔“ فی من نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں مزید تمہاری کوئی بیکواس نہیں سن رہا۔ مجھے پہلے ہی تمہاری باتیں سن کر سر درد ہو گیا ہے اب تم سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔“

”ڈیڈے پلیز ایہ تو بتادیں کہ کام کیسی ہیں؟“ فی من نے بے قراری سے بولا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں..... یہیں پاس بیٹھی ہیں۔

تمہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ڈیڈے نے لا پرواہی سے کہا۔

”پلیز کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔“ فی من نے ایک بار پھر التجائیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں کر سکتے ہو یہ لو کرو۔“ اتنا کہہ کر ڈیڈے نے فون فی من کی ہام کو تھما دیا۔

”ہیلو فی من..... مام آپ کیسی ہیں میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں۔“ فی من نے مصحوبیت سے کہا۔

”ہاں ہاں ہم بھی تمہیں یاد کرتے ہیں لیکن یہ میں کیا سن رہی ہوں ڈیڈے کہہ رہے ہیں تمہیں آج تین بار سزا ہوئی ہے..... تم دھیان سے کام کیوں نہیں کرتے۔ بہت دل دکھایا ہے تم نے میرا۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں غصے سے کہا۔

”مام پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“ فی من نے اداس لہجے میں کہا۔

”ایسا کرو اب تم سو جاؤ میں اور تمہارے ڈیڈے بھی مودی دیکھ کر سونے کے لئے لیٹ رہے ہیں۔“ اتنا کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے لائن کاٹ دی۔ فی من ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔

بہر حال اس نے ریسیور واپس کر لیا پر رکھا اور اپنے کمرے کی طرف سونے کے خیال سے چل دیا وہاں پہنچا تو تینوں لڑکے اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

”ہاں کیا بات بات ہوئی گھر والوں سے؟“ سی جن نے پوچھا۔

”ہاں ہو گئی۔“ فی من نے آہستگی سے جواب دیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں وہ لوگ؟“ دوگ دو نے اس کا اثر ہوا چہرہ دیکھ کر دریافت کیا۔

”کچھ بھی نہیں وہ ناراض ہیں ابھی بھی..... اور میں نے یہ بتا کر کہ آج مجھے تین بار سزا ہوئی انہیں مزید ناراض کر دیا۔“ فی من نے بستر پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں ایک دن تو مان جائیں گے۔“ جی سنگ نے اسے اداس دیکھ کر تسلی دی۔

فی من خاموشی سے بستر پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ باقی تینوں لڑکے بھی لاشیں آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گئے۔

رات کا نامعلوم کون سا پھر تھا جب دوگ دو کی آنکھ کسی کے کراہنے کی آواز سے کھلی۔ وہ نیند میں آ نکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جن سو مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“ کمرے کے باہر سے لا اون کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”نن نہیں جن سو نہیں رک جاؤ۔“ اور پھر بارہ تیز قدموں کی آواز سنائی دی شاید لا اون بھاگ رہا تھا دوگ دو کو تحس ہوا وہ یہ تو جانتا ہی تھا کہ آج کسی سر پھرے لڑکے نے سزا کے کمرے کا تالا توڑ ڈالا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بستر سے اتر کر چل بیروں میں پہنی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے لا اون تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن نامعلوم وہ کس چیز سے ڈر رہا تھا وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ تب ہی اسے دیوار پر کسی کا سایہ نظر آیا جو مسلسل لا اون کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ دوگ دو یہ منظر دیکھ کر بری طرح ہم گیا اور واپس کمرے میں چلا آیا اور دروازہ اچھی طرح سے بند کر دیا۔ پھر اس نے فی من کو بھونک کر اٹھا دیا۔

”فی من فی من جلدی اٹھو۔“ وہ بدحواسی کے عالم میں بولا۔

”کیا ہوا..... سب ٹھیک تو ہے ناں۔“ فی من نے نیند سے جاگتے ہوئے پوچھا۔

”رو..... روح..... باہر جن سو کی روح ہے۔“ دوگ دو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آرام سے تمہیں ہو کیا گیا ہے..... کیا دیکھ لیا تم نے.....“

”آتما جن سو کی آتما دوگ دو نے ہی ایک رٹ لگا رکھی تھی۔“ ان کی آوازیں سن کر جی سنگ اور سی جن بھی نیند سے بیدار ہو گئے۔

”کیا ہوا؟ کیا مصیبت ہے سارا دن اسکول میں

خوار ہوتے ہیں رات کو بھی سونے نہ دو تم۔“ جی سنگ بے زار لہجے میں بولا۔

”یہ سونے کا وقت نہیں ہے..... جن سو کی روح۔“ آزاد ہو گئی ہے۔ نچانے کون کم بخت تھا وہ جس نے سزا کے کمرے کا دروازہ کھول ڈالا۔“ دوگ دو نے کہا۔

”دوگ دو پلیز شانت ہو جاؤ۔“

”سزا کے کمرے کا دروازہ میں نے کھولا تھا۔“ فی من کے اس اکتشاف پر تینوں لڑکے اپنی جگہ سے اچھل بی تو پڑے۔

”فی من تمہارا دماغ پھر گیا تھا کیا؟“ سی جن نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

جبکہ جی سنگ کو چپ لگ گئی اور دوسری طرف دوگ دو سیدھے ہاتھ کی انگلیاں منہ میں کاٹتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

”کیا کر دیا تم نے یار..... اب جن سو کی روح ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گی۔“

”دوستو! پلیز شانت ہو جاؤ اور میری بات سنو میں آج تم لوگوں کو اس بارے میں بتانے ہی والا تھا لیکن مام ڈیڈے سے فون پر بات کرنے کے بعد میں اتنا اپ سیٹ ہو گیا کہ مزید کوئی بات کہنے بنا ہی سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دیکھو میری بات سنو لا اون تو بے چارہ پاگل ہے اس بے چارے کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرتا لیکن تم لوگ تو اس طرح مت ڈرو۔ وہ تو پہلے ہی جن سو کی روح سے ڈرتا تھا۔ اور اب یہ بات جاننے کے بعد کہ اس کمرے کا دروازہ کھل گیا ہے تو وہ مزید ڈر گیا ہے کہ جہاں اتنے سالوں سے جن سو کی روح قید تھی اب دروازہ کھلنے سے آزاد ہو گئی ہے۔ تم لوگ پلیز پریشان نہ ہو سو جاؤ۔ بے فکر ہو کے دیکھنا کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہونہہ..... ٹھیک ہو جائے گا تمہیں تو میں چھوڑوں گا نہیں۔“ فی من، دوگ دو بڑبڑایا تا ہوا سونے کے لئے لیٹ گیا۔

فی من کے سمجھانے پر باقی سب بھی سونے کے لئے لیٹ گئے۔

اگلے روز صبح تی من نے اٹھتے ہی معمول کے مطابق ہاٹ شاور لیا اور پھر کچھ روم میں ناشتہ کرنے پہنچا پھر خاموشی سے ورزش کرنے کے بعد وہ جی سنگ، سی جن اور دو رنگ ودا بھی کلاس کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ انہیں سزا کے کمرے کے باہر لڑکوں کا جھوم نظر آیا اور عجیب افراتفریح کا عالم تھا۔ کافی شور سننے میں آ رہا تھا۔ تی من جھوم میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا اور سزا والے کمرے کے سامنے جا کر رک گیا۔ نظروں کے صحن سامنے کمرے کے پتھوں بچ لالوں کی لاش پھانسی کے پھندے پر لگی ہوئی تھی۔

تی من کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کمرے میں پرنسپل گمن ہوسمیت تمام اساتذہ موجود تھے۔ خاموشی کے ساتھ لالوں کی لاش کو نیچے اتارا گیا۔ اور پھر پرنسپل صاحب کے کہنے پر اسے اسکول کے باہر بے لائن میں زمین کھود کر دفنا دیا گیا۔ انہوں نے تابوت وغیرہ کا بھی کوئی بندوبست نہیں کیا۔

”یونہی اس کی لاش کو ٹی تلو دبا دیا۔“ تمام لڑکے اسکول کے لائن میں لالوں کے جنازے میں شریک خاموش کھڑے تھے۔ پرنسپل گمن ہو کر بالکل چپ لگ گئی تھی۔ آج کے دن کے لئے پڑھائی بھی کینسل کر دی گئی تھی۔ تمام لڑکوں کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔

تی من اپنے دوستوں کے ساتھ واپس کمرے میں پہنچا تو کافی پریشان لگ رہا تھا۔ تینوں دوست بھی اس سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ اس سے الگ الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ تی من نے یہ دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

”دوستو! پلیز میری بات سنو میں جانتا ہوں تم سب لالوں کی موت کا ذمہ دار مجھے سمجھتے ہو لیکن یقین جانو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ تی من نے کہا۔

”ہاں ہاں تم تو بڑے بھولے ہو۔“ جی سنگ نے ناراضگی سے کہا۔

”آخر تمہیں پڑی کیا تھی سزا والے کمرے کا“

دروازہ کھولنے کی۔“ سی جن نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے لیکن میرا یقین کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تی من نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یونہی..... کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر مرنا ہی تھا تو پرنسپل گمن ہو کیوں ناں مر گئے۔ ہر وقت نظر بنے پھرتے ہیں۔“ جی سنگ نے منہ بسور کر کہا تو تی من نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”مطلب یہ کہ یہاں کے اساتذہ اتنے برے ہیں اگر یہی میرا جانی تو بڑا مزہ آئے۔ ہمارے ہیرو تو تم جب بنو گے۔ ابھی تم نے تالا توڑ کر کوئی کمال نہیں کیا۔ ان جلا دوں سے ہماری جان چھڑاؤ تو بات ہے۔ جی سنگ مسکراتے ہوئے بولا۔ تو دو رنگ دو اور سی جن بھی مسکرا دیے۔ جبکہ تی من نا بھیجی کے عالم میں اپنا سر کھجاتا رہ گیا۔

اس رات دو رنگ دو کی نیند سے آنکھ کھلی تو اسے ٹیچر بن جن کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

”نن نہیں جن سو میری بات سنو میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ لیکن پلیز مجھے معاف کر دو۔“ اور پھر بن جن کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔

دو رنگ دو بری طرح ڈر گیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ خاموشی کے ساتھ دوبارہ سو جائے لیکن پھر رہا نہ گیا تو پچھلی رات کی طرح تی من کو سمجھو ڈرکھا ڈالا۔

”تی من جلدی اٹھو جن سو کی روح پھر آگئی ہے۔“

تی من فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کک کیا ہوا؟“ تی من نے گھبرا کر پوچھا تو دو رنگ دو نے اسے ٹیچر بن جن کے بولنے کی آواز کے بارے میں بتایا۔

”کچھ کر تی من یا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”دو رنگ دو کھکھایا۔“

”تم گھبراؤ مت اور ایسا کرو کہ بے فکر ہو کے سونے کے لئے لیٹ جاؤ۔ تم دیکھنا سب ٹھیک ہوگا۔“ تی من نے تسلی دی۔

”ارے یا کیسے ٹھیک ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں ان دونوں کو بھی اٹھا دیتے ہیں۔“ دو رنگ دو سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہیں نہیں ان دونوں کو سونے دو اور تم بھی سو جاؤ میرا یقین کرو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ تی من نے تسلی دی۔

”ٹھیک ہے لیکن آج رات میں تمہارے ساتھ سوؤں گا۔ بٹو مجھے جگہ دو اپنے بستر پر۔“ اتنا کہہ کر دو رنگ دو نے اپنے بستر پر سے نکل اٹھا اور تی من کے بستر میں گھس گیا۔ تی من بھی بے چارہ خاموشی کے ساتھ لیٹ گیا۔

ساری رات دو رنگ دو کی گھبرا کر آنکھ کھلتی رہی اور وہ بار بار تی من کے ساتھ چٹ جاتا۔

اگلے روز چاروں لڑکے جب ورزش کرنے گراؤنڈ میں جمع ہوئے تو ٹیچر بن جن ابھی تک نہیں آئے تھے۔ دو رنگ دو نے گھبرا کر تی من کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں تمہیں بتا رہا ہوں آج ٹیچر بن جن نہیں آئیں گے۔ تم دیکھ لینا۔“

”افو ہو..... کیوں فضول کی بات کر رہے ہو وہ آگئی آتے ہی ہوں گے۔“ تی من نے تسلی دی۔

لیکن پانچ منٹ، دس منٹ اور پھر پورے پندرہ منٹ گزر جانے پر پرنسپل گمن ہونے تی من کو بھیجا کہ باکرہ دیکھ کر آئے کہ ٹیچر بن جن کہاں رہ گئے۔ تی من اٹھتا ہوا سر ہلاتا ہوا ٹیچر بن جن کو دیکھنے چلا گیا۔

اس نے پورا اسکول چھان مارا لیکن وہ کہیں نہ ملے سب سے آخر میں وہ سزا والے کمرے کی طرف آیا تو اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر گرتے گرتے بھاگا۔

سامنے پھانسی کے پھندے پر ٹیچر بن جن کی لاش لگی ہوئی تھی۔

بے اختیار اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا

اور اگلے قدموں واپس بھاگا۔ وہ ہانپتا کانپتا گراؤنڈ تک پہنچا۔

”پرنسپل صاحب..... وہ ٹیچر بن جن سزا والے کمرے میں..... وہ مر گئے ہیں۔“ تی من نے ہانپتے ہوئے کہا۔

پرنسپل گمن ہو کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ دوڑتے ہوئے سزا والے کمرے کی طرف بھاگے۔ تمام لڑکے بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑے یہ دیکھنے کے لئے کہ اب کیا نئی مصیبت آگئی۔ جب سارے وہاں پہنچے تو پرنسپل گمن ہوا آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے بن جن کی لاش کو لٹکتے ہوئے دیکھا اور پھر پریشانی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

پھر کل کی طرح پرنسپل صاحب اور دوسرے ٹیچرز نے ان کی لاش نیچے اتاری اور پھر خاموشی کے ساتھ انہیں بھی دفنا دیا گیا۔ تمام لڑکوں نے پھر ان کے جنازے میں شرکت کی۔

تی من کو حیرت اس بات کی تھی کہ یہ لوگ اس بارے میں نہ پولیس کو کچھ بتا رہے ہیں اور بس خود ہی لاش کو دفنا دیتے ہیں نہ ہی یہ وجہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آخر یہ لوگ خود کو پھانسی پر کیوں لٹکا رہے ہیں۔

اس رات تی من ہاٹ شاور لینے کے بعد سونے کی نیت سے اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا جب ہی اسے پرنسپل گمن ہوئے آفس میں سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی۔

اسے تجسس ہوا کہ آخر اتنی رات گئے کوئی پرنسپل کے آفس میں کیا کر رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے وہ آگے بڑھا اور چھپ کر دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکنے لگا۔

سامنے پرنسپل گمن ہو، بیون دو اور ٹیچر بن جن ہو کر سیوں پر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ان کے سامنے میز پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔

”جن سو کیا تم لوٹ آئے ہو۔“

”ہاں میں لوٹ آیا ہوں۔“ پرنسپل گمن کے

پوچھنے پر ایک لڑکے کی آواز سنائی دی۔

”کک..... کیا تم اپنا بدلہ لینے آئے ہو؟“ پر پہل نے دوبارہ پوچھا۔

”ہاں میں اپنا بدلہ لینے آیا ہوں..... دوبارہ“ کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر کمرے میں تیز ہوا چلی اور ساری موم بتیاں بجھ گئیں۔

تی من گھبرا کر واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ سیدھا اپنے بستر میں گھس گیا اور کبل منہ تک اوڑھ لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخروہ کس کی آواز تھی؟ کیا وہ واقعی جن سو کی آواز تھی؟ اور جن سو کی روح اگر آزاد ہوگئی ہے تو وہ اپنا کون سا بدلہ لینے آئی ہے۔ اور یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

اور پھر اگلے روز پھر ہون دو کی لاش سزاوالے کمرے میں چھت سے لگتی ہوئی ملی۔ اور اس سے اگلے روز پھر ہون ہوئی بھی ٹھیک اسی طرح موت واقع ہوگئی اب تک پورے اسکول میں بہت زیادہ خوف پھیل گیا تھا۔ پر پہل گمن کے چہرے پر جہاں پہلے ہر وقت غصہ رہتا تھا اب خوف کی پرچائیاں نظر آتی تھیں۔

اس روز تی من نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سزاوالے کمرے کا معملہ حل کر کے ہی رہے گا اس کے لئے وہ چپکے سے سزاوالے کمرے میں پہنچا۔ وہاں اس نے کسی قسم کی کوئی ایسی چیز تلاش کرنا شروع کی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہاں سالوں پہلے ہوا کیا تھا۔

تب ہی اسے کمرے کے ایک کونے میں ایک ڈبچہ کیمرہ نظر آیا۔ اس نے فوراً اسے اٹھا کر دیکھا کیمرہ بند تھا۔ اس نے اس میں سے میووری کارڈ نکال لیا اور اسے احتیاط کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس رات جب سب سو رہے تھے تب تی من نے جی سنگ کا کیمرہ میز پر سے اٹھایا اور وہ میووری کارڈ اس کے اندر لگایا۔ اور پھر اس میں بنی ایک ویڈیو کیسے لگا۔

ویڈیو میں اس نے دیکھا کہ جن سو کی کسی چھوٹی سی بات پر پہل گمن ان کے چھوٹے بھائی لا اون اور

مرنے والے باقی کے تمام اساتذہ جن سو کو پکڑ کر سزا والے کمرے میں لے کر جا رہے ہیں۔ جن سوان کی منت سماجت کر رہا تھا وہ کبہر ہاتھا۔

”اس سے غلطی ہوگئی ہے اسے معاف کر دیا جائے۔“ لیکن پر پہل گمن ہونے لگی تھی کہ یہ دیا کہ ”ہر غلطی کی سزا ملتی ہے۔“ اور پھر انہوں نے کمرے کے بیچوں بیچ ایک کرسی رکھی اور اس پر جن سو کو کھڑا کیا اور پھانسی کا پھندہ جو اسٹوڈنٹس کو ڈرانے کے لئے رکھا گیا تھا جن سو کے گلے میں ڈال دیا۔

وہ محض اسے ڈرانا چاہتے تھے..... لیکن جن سو کی بد قسمتی کہ اس کے اپنے بیک کی ٹھوکری لگ جانے سے کرسی اپنی جگہ سے گر گئی اور بے چارہ جن سو پھانسی کے پھندے پر لٹکا ہوا رہ گیا۔

پر پہل صاحب اور باقی اساتذہ نے اسے بیٹانا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ دم توڑ چکا تھا اس کے بعد ویڈیو پختہ ہوگئی۔

اب تی من کو اصل بات معلوم ہوگئی تھی کہ جن سو کی موت کے ذمہ دار یہاں کے اساتذہ ہیں اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جن سو وہ لڑکا ہے جو اس دن سزاوالے کمرے کا تالا توڑنے پر اسے ملتا تھا اور اپنا نام جن سو بتایا تھا۔

اس نے کیمرہ آف کیا میز پر رکھا اور جیسے ہی پلٹ کر دیکھا تو سامنے جن سو کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو تم نے میری اصلیت جان لی۔“ جن سونے پوچھا۔

”ہاں میں نے سب جان لیا لیکن یہ بتاؤ کہ یہ ویڈیو کس نے بنائی۔“ تی من نے پوچھا۔

”یہ ویڈیو ایک لڑکے نے چسپ کر بنائی تھی لیکن وہ بعد میں اتنا ڈر گیا کہ اس نے یہ کیمرہ وہیں پھینکا اور کسی کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ جن سونے بتایا۔

”تو تم یہاں اپنا بدلہ لینے آئے ہو؟“ تی من نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

”ہاں میں اپنا بدلہ لینے آیا ہوں۔ تو تم اپنا بدلہ

لے لو۔“ تی من نے کہا تو جن سو بولا۔

”ہاں میں اب وہی کرنے جا رہا ہوں۔“ اور وہ وہاں سے غائب ہو گیا۔

اگلے روز پر پہل گمن ہوئی بھی لاش مل گئی۔ پولیس نے تمام لڑکوں کے بیانات نوٹ کر لئے۔ تی من کے پاس سے میووری کارڈ بھی مل گیا جس میں جن سو کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کی ویڈیو بنی ہوئی تھی۔

حکومت کی طرف سے اس اسکول پر پابندی لگ گئی کہ وہاں اسٹوڈنٹس کے ساتھ خراب سلوک کیا جاتا ہے۔ اسکول کی عمارت بھی حکومت کے قبضے میں آ گئی۔

اس دن تی من اپنے گھر میں مام ڈیڈ کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی دادی بھی کھڑی تھیں وہ نہایت ٹش میں لگ رہی تھیں۔

”شرم آتی ہے مجھے تم دونوں پر کیسے سنگدل ماں باپ ہو تم دونوں۔ تم دونوں اس قابل نہیں ہو کہ تی من کی پرورش کر سکو لہذا آج سے تی من میرے ساتھ رہے گا۔“ چلو بیٹائی من اپنا سامان پیک کر دیا اور میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“ انہوں نے تی من کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مام پلیز! ہم ماننے ہیں ہم سے غلطی ہوئی لیکن پلیز آپ ہمیں تی من سے الگ نہ کریں۔ ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“ ڈیڈ نے کہا۔

”ہو گیا ہوگا تمہیں اپنی غلطی کا احساس لیکن اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ تی من میرے ساتھ رہے گا۔“ انہوں نے سختی سے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں دادی جو ہوا سو ہوا میں مام اور ڈیڈ کے ساتھ رہنا پسند کروں گا۔“ تی من نے کہا اور اپنے مام ڈیڈ کی سائینڈ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

دادی دھیرے سے مسکرائیں۔

”تم دونوں بہت خوش قسمت ہو کہ تی من تم سے اتنا پیار کرتا ہے ورنہ اگر یہ انکار کر دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے میرے ساتھ جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔

آئندہ سے تی من کا خاص خیال رکھو ورنہ ہی آئندہ تم دونوں کی طرف سے کسی قسم کی کوئی شکایت سننے کو ملے مجھے۔“ دادی نے وارن کیا۔

”آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ مام نے تی من کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا تو ڈیڈ نے بھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تی من بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد کی بات ہے تی من اس وقت کلاس میں اکیلا اپنے بچہ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کسی معمولی سی بات پر اس پر چلا رہے تھے۔

اور پھر انہوں نے اسے مارنے کے لئے اسٹک اٹھائی تب ہی پیچھے سے ایک ڈراؤنی شکل کے لڑکے نے انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”ت..... تم کون ہو؟“ انہوں نے پکلاتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس کا بہترین دوست ہوں آئندہ اسے یوں بلاؤ کہ سزا دینے کا سوچنا مجھے مت ورنہ بہت برا انجام ہوگا تمہارا۔“ اس لڑکے نے کہا اور ٹیپر کو چھوڑ دیا۔

وہ بری طرح ڈرے اور گھبرائے ہوئے کلاس سے باہر بھاگ گئے۔ ان کے جاتے ہی وہ لڑکا اپنی اچھی شکل میں لوٹ آیا۔ وہ جن سو تھا۔

”جن سو تم یہاں؟“ تی من نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں یہاں..... تم میرے سب سے بہترین دوست ہو۔ تم نے مجھے سزاوالے کمرے سے آزاد کر دیا۔ قید سے رہائی دلائی۔“ جن سونے پیار سے کہا۔

”اور تم بھی میرے بہترین دوست ہو تم نے بھی مجھے اس اسکول سے نجات دلا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ وہاں رہنا بالکل قید کا ٹٹے جیسا تھا۔“ تی من نے اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگ لیا۔

☆☆

رقص عروسی

عامر ملک - راویلینڈی

ہم قبا کیوں میں پھر کے زمانے سے یہ قانون رائج ہے کہ جو شخص بھی ہماری کسی عورت کی توہین کرے اسے دور اتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے،

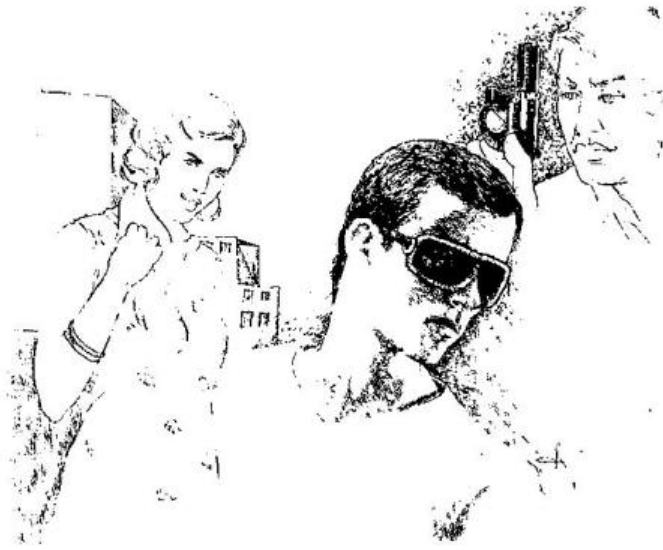
”جارج قمرٹن“

”اچھا وہ بڑا صاحب جو تیل کی تلاش میں ان پہاڑیوں میں آیا تھا، جی ہاں صاحب مجھے وہ خوب یاد ہے کیونکہ میں بھی تیل کی تلاش میں اس سفر میں اس کا ساتھی تھا جس سے وہ کبھی واپس نہ آیا آپ پوچھتے ہیں اس کا کیا حشر ہوا تو یہ ایک ایسا ہی سوال ہے جس کا صحیح جواب اور کوئی تو کیا میں خود بھی آپ کو بتا نہیں سکتا۔ حالانکہ میں پڑھا لکھا ہوں اور اپنے قبیلے کے دانش مندوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ اس دور دراز علاقے میں اپنی انشورنس کمپنی کی طرف بسلسلہ تحقیقات آئے ہیں۔ آپ بڑے صاحب کی موت کے ثبوت کی تلاش میں آئے ہیں تو جناب واقعات کا جہاں تک مجھے علم ہے میں بیان کئے دیتا ہوں یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ ان واقعات کو اس کی موت کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔“

کہانی کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب بڑا صاحب دریائی کشتی سے ہمارے ساحل پر اتر آئے تو ذاتی طور پر اسے جانتے ہوں مگر مجھے اس کا حلیہ اچھی طرح یاد ہے وہ بڑا لمبا چوڑا تنومند انگریز تھا آنکھیں انگاروں کی طرح دھبکی ہوئی، آواز میں بادلوں کی سی گرج اور لہجہ ایسا توہین آمیز جیسے وہ کسی آزاد پہاڑی قبائلیوں سے نہیں بلکہ کنوئوں سے مخاطب ہو۔ ہم

پہاڑی لوگ ٹھنڈے مزاج اور حیرت انگیز مبرم مخل کے مالک لوگ ہیں اور غیر ملکی لوگ عموماً بھی غلطی کر کے نقصان اٹھاتے ہیں کہ وہ ہمارے مبرورداشت کو ہماری بزدلی اور کم ہمتی سمجھ بیٹھتے ہیں میری بات سکون سے سنئے صاحب آپ معاملات کو ان کی صحیح شکل میں دیکھ ہی نہیں سکتے اگر آپ پہلے سے بڑے صاحب کے مزاج ذہنیت اور اس رعونت کا اندازہ نہ کر لیں جو اس کا خاصہ تھی اور اس نفرت اور حقارت کو بھی نہ سمجھ لیں جو ہم لوگوں کے لئے شروع ہی سے اس کے دل میں موجود تھی اس کی آنکھیں ڈراؤنی تو تھیں ہی بلکہ سفاک بھی تھیں وہ ایک سرد ملک کا باشندہ تھا شاید اسی لئے وہ ہماری عورتوں کے مختصر ترین لباس کو موسم کا تقاضہ سمجھنے کی بجائے دعوت گناہ سمجھ بیٹھا۔

آپ پھر بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ ہمارا نکتہ نظر سمجھنے کے لئے سکون کی ضرورت ہے کیونکہ آپ ہم سے وقتی طور پر ہم آہنگ ہوئے بغیر یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ بڑے صاحب نے جب جنگل میں پہلی بار لپٹا کو اپنے سامنے نیم عریاں لباس میں پایا تو اس کے دل میں ہوس نے کیسی پھیل جھادی ہوئی۔ لپٹا ہمارے گورے بابو کی حسین و جمیل آنکھوں میں بیٹی ہے۔ گورے بابو بھی کر سکتے ہو میں اوپر پہاڑوں میں تیل تلاش کرنے آیا ہوں۔“ گورے بابو نے اس کی بات



سن کر اپنے نتھنے اس طرح پھیلانے جیسے کسی مردار کی بو سونگھ رہے ہوں۔ مگر جواب اسے نرمی ہی سے دیا۔ ”ہاں میں کچھ سامان لینے آیا ہوں اور صبح سویرے واپس جاؤں گا۔“

”نہیں میں دوپہر کے کھانے کے بعد روانہ ہونا چاہتا ہوں اور اگر تم کچھ مزدوروں کا انتظام کر دو تو میں تمہیں کچھ روپے بھی دوں گا۔“ بڑے صاحب نے رعونت سے کہا۔

”دوپہر کا وقت آرام کا وقت ہے اور یہاں ایک کہات مشہور ہے کہ دوپہر کے وقت پاگل کتے یا بے وقوف انگریز ہی سفر کرتے ہیں۔“ گورے بابو نے جواب دیا اس پر بڑے صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور گورے بابو کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولا۔

چکہ کی ایک حسین و جمیل لڑکی سے شادی کی اور ہمیشہ کے لئے ہمارے ہو کر رہ گئے وہ چھوٹے قد کے ہیں سر گنجا ہے اطوار اتنے پیارے اور آواز ایسی میٹھی ہے کہ ہم میں دیوتا کی طرح پوجے جاتے ہیں وہ دریا کے کنارے آباد ہو گئے اور تھوڑا سا جنگل صاف کر کے کیلے کے درختوں کا باغ لگا لیا اب ان کے چھ بچے ہیں جن میں لپٹا سب سے بڑی اور اکلونی لڑکی ہے اس دن وہ کچھ سامان خریدنے بازار گئے ہوئے تھے جب بڑے صاحب کشتی سے اترے تو وہ ہیں ان سے اس کی ملاقات ہو گئی لمبے چوڑے بڑے صاحب نے سختی گورے بابو کو بے حد سردمہری سے مخاطب کیا۔

”میں نے سنا ہے تم اس علاقے میں کاشتکاری کرتے ہو اور یہ کہ تم پہاڑی علاقے تک نہ صرف میری رہنمائی کر سکتے ہو بلکہ وہاں تک میرا سامان لے جانے کا انتظام بھی کر سکتے ہو میں اوپر پہاڑوں میں تیل تلاش کرنے آیا ہوں۔“ گورے بابو نے اس کی بات

ڈاکو کی درگت

ایک بہادر شخص نے دکان میں ڈکیتی کی غرض سے آنے والے ڈاکوؤں کی درگت بنا کر انہیں پولیس کے حوالے کر دیا بتایا گیا ہے کہ یو کے ریاست ویلز کے شہر ایرڈیر کے ایک اسٹور میں 2 ڈاکو داخل ہوئے اور مالک پر چاقو تان کر رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس اچانک حملے کے باوجود دکان دار ڈرانہ گھبرایا بلکہ نہ صرف خود پر تاجاقو قابو کیا بلکہ ڈاکوؤں کو دکان میں بند کر کے خوب درگت بنائی اور پولیس کے ہتھے چڑھوایا۔

(ساجد علی - کھڑو ضلع ساٹھڑ سے)

رنگو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم بڑے صاحب کی ہولناک موت کا تصور ہی کر رہے تھے کہ وہ حیرت انگیز تیزی سے پیچھے مڑا ایک بھیانک ہتھیار لگایا اور اپنے طاقتور کئے سے رنگو کا جیڑا توڑ کر رکھ دیا رنگو قلا بازیاں کھاتا ہوا دور جاگرا اور اس کے چاقو کا تیز پھل زمین پر گھس گیا۔

اب ہم چار مزدور رہ گئے تھے اور جیسے ہی چاقو سنبھالے آگے بڑھے بڑے صاحب نے تیزی سے اپنی جیب سے پستول نکال لیا ہم اس کی پھرتی پر حیران ہشدر اور خوف زدہ ہو کر رہ گئے۔ ہمارے ہاں ایک کہادت ہے کہ گرم مکہ ٹھنڈے فولا دے زیادہ تیز رفتار اور زود اثر ہوتا ہے اور ہم میں سے کوئی بھی چونکہ اس کہادت کا جج جھوٹ پر کھنے پر آمادہ نہ ہو سکا اس لئے ہم نے اپنے اپنے بوجھ خاموشی سے اٹھائے بڑے صاحب نے راہو کا بوجھ بھی ہم سب میں بانٹ دیا اور پستول کی زد میں ہمیں گدھوں کی طرح ہانکنے لگا خون تھوکتا ہوا رنگو بھی بوجھ اٹھائے ہمارے ساتھ تھا اور پھر جب شام کے سامے گھرے ہو گئے تو اس نے ہمیں رکے کا اشارہ کیا ہم میں کسی میں بھی اب اتنی ہمت نہ تھی کہ کھانے اور سونے کے سوا اور کچھ سوچ بھی سکے ہم نے جلدی جلدی آگ جلا کر کھانا تیار کیا

سے سوال کیا۔ راہو نو عمر ہونے کے باوجود ایک نڈر تھا اس لئے بے ہجک بول اٹھا۔

”میں بیمار ہوں اور شدید گرمی کی وجہ سے بے بس ہو گیا ہوں تھوڑا سا آرام مل جائے تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ مگر بڑا صاحب اس طرح کا جواب سننے کا کہاں عادی تھا اس نے زور سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور چلا اٹھا۔

”گرمی تمہارے لئے بھی اتنی ہے جتنی میرے لئے۔ اب تم آگے چلو میں تمہاری بیماری کا علاج کرتا ہوں وہ جب بھی تمہارے قریب آئے گی میں تمہاری پشت پر تھوکر مار کر بھگا دوں گا۔“ بڑے صاحب کا یہ طرز عمل قطعی احمقانہ تھا چنانچہ اب ہر چہرے پر اس کے خلاف نفرت نمایاں تھی راہو کا ہاتھ تو اپنے کمر بند تک بھی پہنچ گیا جہاں اس کا دھاردار چاقو پوشیدہ تھا مگر اس کے پیٹ کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا اس لئے اس نے کوئی اور حرکت کئے بغیر اپنا بوجھ زمین پر رکھ دیا اور بیٹھتا ہوا بولا۔

”پیٹ کا درد دور ہونے تک میں یہاں بیٹھوں گا۔“

”ہرگز نہیں.....“ بڑا صاحب زور سے چیخا۔
”میں تمہیں مزدوری کا ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔ جاؤ اپنی بیماری کے ساتھ دھن ہو جاؤ۔“
مزدوروں کی سانسیں تیز ہوئیں اور ان کے ہاتھ اپنے اپنے کمر بند تک جانے کے لئے بے چین مگر بڑے صاحب کے بے پناہ رعب نے انہیں کچھ نہ کرنے دیا لیکن رنگو جو سب سے پیچھے تھا جیتے کی سی پھرتی سے اچھلا اور اب اس کے دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کا پھل سورج کی شعاعوں میں جگمگا رہا تھا عین اسی وقت گورے بابو آگے بڑھے اور بڑے صاحب کو بھانسنے لگے کہ وہ مزدوروں سے یہ انداز گفتگو اور طرز عمل اختیار کر کے غلطی کر رہا ہے۔ لیکن بڑے صاحب نے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا اور وہ شرمسار ہو کر پیچھے ہٹ گیا بڑے صاحب کے پیچھے سے

لوگ جانتے ہیں جس سے دم گھٹنے لگتا ہے پسینہ چونیوں کی طرح کاٹتا ہے حیران من بھر کے ہو جاتے ہیں اور قدم اٹھانا مشکل لیکن یہاں کے موسم اور قیامت خیز گرمی کے اثرات مابعد سے ناواقف اور بوجھ سے آماد بڑا صاحب اتنا تیزی سے بھاگا جا رہا تھا جیسے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ ظاہر ہے ایسے بے سمجھ آدمی کا ساتھ دینا بہت ہی مشکل کام ہے لیکن کرائے کے مزدور پیچھے رہ کر اپنی مزدوری بھی خطرے میں نہیں ڈال سکتے اس لئے جیسے تیسے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ تین گھنٹے وہ ہمیں اسی رفتار سے دوڑتا رہا مگر راہو کے لئے جو مزدوروں میں سب سے کم سن تھا اور جو پیٹ کے درد کا مریض بھی تھا اب اس رفتار سے چلنا ممکن نہ تھا اس لئے اس کا بڑا بھائی رنگو دوڑا دوڑا گورے بابو کے پاس گیا اور درخواست کی کہ راہو کی حالت کے پیش نظر تھوڑی دیر رک جانے کی اجازت دی جائے۔

”مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ گورے بابو نے دلی رنج سے کہا۔

”بڑا صاحب تو آگے آگے بھاگ رہا ہے اور رک جانے کی اجازت وہی دے سکتا ہے۔“
”مگر پیٹ کی بیماری اسے نہیں میرے بھائی راہو کو ہے۔“ رنگو بیچ دتا بکھا کر بولا۔

”آپ اگر بڑے صاحب سے کہیں تو وہ ضرور مان جائے گا۔“ اس ملک میں طویل قیام کے انمول تجربوں میں سے گورے بابو کا ایک یہ بھی تجربہ تھا کہ بیمار مزدور کی جان بچانے کے لئے تھوڑی دیر رک جانا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے بڑے صاحب کو آواز دی۔

”ایک مزدور بیمار ہو گیا ہے۔“ بڑا صاحب یہ سنتے ہی غصے سے پیچھے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا مزدوروں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تم میں سے کون ہے جو بیماری کا بہانہ کر کے آرام کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے بڑی نفرت اور عنوت

”مگر دو پہر کی دھوپ میں مزدوروں کے لئے بوجھ اٹھا کر چلنا ممکن نہ ہوگا کل صبح پری رکھئے۔“ گورے بابو نے گویا چیل کی۔

”لعنت بھیجی صبح پر اور اپنے مشورے پر بھی اگر تم روئے کمانا نہیں چاہتے تو میں کوئی اور انتظام کر لوں گا۔“ گورے بابو کے لئے چونکہ روپے چھوڑ دینا مشکل تھا کیونکہ ان روپوں سے ان کے کئی کام نکل سکتے تھے اس لئے انہوں نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے بڑے صاحب سے پوچھا۔

”مگر آپ پہاڑیوں میں جا کر کیا کریں گے۔“
”میں تیل کی تلاش میں ہوں ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ ان پہاڑوں میں تیل کے آثار موجود ہیں کیا تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو۔“

”میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ گورے بابو نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

”تمہارے جیسے نیک قوم انگریزوں کو میں کیا کہوں جو دو کئے کی جنگی عورتوں پر ریتھ کر اپنی قوم کا مفاد تک بھلا دیتے ہیں۔“

بڑے صاحب نے بڑے نفرت سے کہا اور جب اس نے یہ الفاظ کہے تو میری نظر گورے بابو کے چہرے پر پڑی اور میں ان کے چہرے کے پیچھے بدلتے ہوئے رنگوں سے ان کے دل کی کش مکش کا اندازہ لگا رہا تھا مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے صبر سے کام لیا اور پتا اور تمباکو جیب سے نکال کر سرکٹ بنانے لگے۔

بڑے صاحب نے آخر اپنی ضد منوائی کی اور ٹھیک دو پہر کے وقت ہم بڑے صاحب کے سامان کے بوجھ تلے دبے ہوئے پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے ہم چھ مزدور تھے اور گورے بابو بھی۔ اپنے دو چھروں پر اپنا سامان لا دے ہمارے ساتھ تھے بڑا صاحب اپنے شانے پر ایک چڑی بیگ لٹکائے ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔

عین دوپہر کے وقت چلتے ہوئے سورج کے نیچے بھاری بوجھ اٹھا کر چلنا کتنا مشکل کام ہے یہ کچھ ہم ہی

اور کھا کر لیٹ گئے اس دوران میں بڑے صاحب نے ہم سے کوئی بات نہ کی وہ ہم سے دور ایک بڑے درخت کے تنے سے پیڑ لگائے بیٹھا رہا ہم پر اس کی دہشت اس طرح چھا چکی تھی کہ سب ہونے کے باوجود ہم اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا تصور نہ کر سکے ہم لوگ بزدل نہ تھے مگر اس کی شیطانی طاقت سے ہمارے دل و دماغ اس طرح مرعوب ہو گئے تھے کہ صبح اٹھتے ہی ہم نے اپنا سفر شروع کر دیا اور وہ سفر جو ہمیشہ تین دن میں ختم کیا کرتے تھے زندگی میں پہلی بار صرف ڈیڑھ دن میں ختم ہو گیا اور ہم شام سے پہلے پہلے گورے بابو کے ڈیرے کے سامنے پہنچ گئے۔

پہلے ایک کتا بھونکتا ہوا سامنے آیا اور اس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی دوڑتی ہوئی آئی مگر اپنے والد کی بجائے کئی آدمیوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی یہ لپٹا تھی اور یہ سوچ کر خون میں میری رگوں میں جھنکے گا کہ جب بڑے صاحب کی خوف ناک اور پرہوس نگاہ اس کی جانب اٹھے گی تو کیا ہوگا۔ اور میرا یہ خوف بے جا نہیں تھا کیونکہ لپٹا حسن اور جوانی کی ایک بے نظیر تصویر تھی اس کا سر ایا تو بیان کرتا تو میرے بس میں نہیں ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کے معمولی سوتی لباس میں جیسے ہوئے جوان جسم کی قویں زاویے اور اجمار اتنے دلکش تھے کہ ایک دفعہ تو دیکھنے والے کا دل بھی دھڑکنے لگتا بھول جاتا تھا۔ اس کی بے پناہ معصومیت اس کی پرچیا آنکھیں اس کے اچھوتے گال اور ہونٹ اور اس کا معصوم جسمانی انداز سونے پر سہاگہ تھا وہ ابھی صرف سولہ برس کی بھی مگر مشرق میں سولہ سال کی لڑکی عورت کہلاتی ہے۔

وہ سڑک کے کنارے بے حس سی کھڑی رہی اور ہم مزدوروں کو اس نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا شروع ہی سے اس کی نگاہیں ہمارے پیچھے آنے والے بڑے صاحب پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کسی مسور ہرنی کی طرح اسے مسلسل دیکھے جا رہی تھی بڑا صاحب اس کے قریب پہنچ کر رک گیا اور ایسی نظروں سے

اسے گھورنے لگا جن کا مفہوم اگر وہ سمجھتی ہوتی تو نہ جانے کہاں جا کر چھپ گئی ہوتی لیکن وہ قطعاً معصوم تھی اور اب تک اس نے اپنے باپ کے سوا کوئی گورا آدمی دیکھا بھی نہ تھا اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے دل میں کیا تھا اور وہ کیوں اتنی توجہ سے بڑے صاحب کو دیکھ رہی تھی اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسی سحر زدہ کی طرح دو قدم اور اس کی طرف بڑھ آئی اور پھر خدا جانے کیا ہو جاتا اگر اسی وقت گورے بابو وہاں نہ آ جاتے وہ سفر کی تھکان سے چورتے لیکن ان کے چہرے پر جو آثار نمایاں تھے وہ صرف تھکان کے نہ تھے۔

”تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے تم جاؤ اور مجھے اس لڑکی سے دو باتیں کر لینے دو۔“ بڑے صاحب نے گورے بابو سے کہا۔

”یہ میری بیٹی لپٹا ہے۔“ گورے بابو نے کہا اور ان کی آواز غلاف معمول کشیدہ تھی بڑے صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

”میں دوغلی نسل کی عورتوں کو دور سے پہچان لیتا ہوں۔ یہ ضرور تمہاری بیٹی ہوگی۔“ اور یہ الفاظ ایسے تھے کہ اگر وہ یہ الفاظ کہنے کی بجائے گورے بابو کے منہ پر تھپڑ مار دیتا کہ شاید انہیں اتنی تکلیف نہ ہوتی پھر بڑا صاحب لڑکی کی طرف مڑا اور بولا۔

”یہاں میرے پاس آؤ۔“ لیکن فوراً ہی گورے بابو زور سے چلا اٹھے۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ اور اٹھا ہوا لپٹا کا قدم رک گیا اور وہ اس طرح دوڑ کر پیچھے ہٹ گئی جیسے گہری نیند سے اچانک بیدار ہوئی ہو۔

”جاؤ گھر چلی جاؤ۔“ گورے بابو نے لپٹا سے کہا اور وہ مڑ کر دیکھے بغیر بھاگ گئی۔

”تم اسے مجھ سے بچا نہیں سکتے میں جیسے ہی اشارہ کروں گا وہ دوڑی آئے گی۔“ دوغلی نسل کی عورتوں کو میں خوب جانتا ہوں۔“ بڑے صاحب نے بے حد رعوت سے کہا اور گورے بابو کی نگاہوں کی چمک بے

بڑھ گئی ان کے ہونٹ سکڑ گئے چمکدار دراندانت باہر آئے اور ان کا حجم و شقیں چہرہ و فتاحیہ ہو گیا یہ گھر کر بڑے صاحب زور سے ہنسا اور اپنی جیب ہتھپٹانے لگا جیسے جتار ہا ہو کہ اپنے اور اس لڑکی کے درمیان آنے والی اس حقیر انسان، گورے بابو کو قتل کر دینا اس کے لئے ایک کھیل سے زیادہ نہیں گورے بابو کی غالباً یہ بات سمجھ گئے چنانچہ ضبط سے کام لے کر سگریٹ بنانے لگے۔ لیکن ان کے ہاتھ اس قدر لرز رہے تھے کہ بہت سا تمباکو نیچے گر گیا یہ دیکھ کر بڑے صاحب نے خاموشی سے روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور وہ یہ روپے لے کر خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ گورے بابو نے نہ تو بڑے صاحب سے کوئی بات کی اور نہ ہی اسے اپنے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی اور وہ بھی ان کے دل کی طبیعت سمجھ رہا تھا اور اس سے لطف لے رہا تھا۔ اس لئے خاموشی سے ہمیں ساتھ لے کر دو سو گز پر سے چلا گیا اور وہیں اچانک پک لگا یا صاف نظر آ رہی تھی کہ وہ فی الحال پہاڑیوں کی طرف نہیں جائے گا بلکہ اس نے کہہ دی دیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی کئی دن تک یہاں مقیم ہے رات کے اندھیرے میں گورے بابو میرے پاس آئے اور مجھے بتایا۔

”بڑے صاحب سے ملاقات کے بعد سے لپٹا عجیب عجیب حرکتیں کر رہی ہے جس کی وجہ سے میں مت پریشان ہوں۔“ میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

”وہ مجھے جو کچھ بھی دیں گے میں بجالاؤں گا۔“ اس پر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا میں صبح نہنے سے پہلے چمکے قہیلے کے سردار تک ان کا پیغام لکھ کر اس کا جواب لاسکتا ہوں۔“

کیونکہ لپٹا چمکے قہیلے کے سردار کے بیٹے سے بوب تھی اس لئے پیغام کی اہمیت میری سمجھ میں آ گئی تھی فوراً آدھ ہو گیا پیغام یہ تھا۔ ”شادی اگلے ماہ طے پائی تھی مگر بعض وجوہ سے میں یہ شادی فوراً

کر دینا چاہتا ہوں اس لئے آپ کل بارات لے کر آ جائیں اگر آپ نے آنے میں دیر کی تو ہمیں بچھڑانا پڑے گا۔

میں گورے بابو کے تیز رفتار فخر پر بیٹھ کر پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گیا اور پیغام پہنچا کر صبح ہونے سے پہلے واپس بھی آ گیا۔

صبح حالات سے بے خبر بڑا صاحب اس یقین کے ساتھ کہ لپٹا اس کے پاس ضرور آئے گی تین گھنٹے تک اپنے کیمپ میں انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی دوپہر کو وہ گورے بابو کے گھر پہنچ گیا اور ان کا بندر دروازہ کھٹکھٹایا میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ صحن میں شام کے ضیافت عروسی کے انتظام میں مصروف تھا میرے سامنے ہی گورے بابو نے اپنا دروازہ کھولا مگر اس طرح کڑواں ہیرل کی شامت گن ان کے ہاتھ میں تھی اور اس کی دونوں نالیاں بڑے صاحب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں گورے بابو نے بڑے صاحب کو بتایا۔

”آج ان کی بیٹی کی شادی ہے اور وہ بے حد مصروف ہیں۔“ یہ کہہ کر گورے بابو نے دروازہ بند کر لیا اور بڑا صاحب بے نیل و مرام اپنے کیمپ میں واپس چلا گیا شادی مصروفیت میں اسے پھر کسی نے بھی یاد نہ کیا۔

آس پاس کی بستیوں میں بلاوے بچھے جا چکے تھے اور مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی ساحل پر لکڑی کے تختوں کا ایک پلیٹ فارم رقص عروسی کے لئے بنایا گیا تھا جسے ہر طرح کے جنگلی پھولوں سے سجایا گیا تھا جنگلی پھولوں کے حسن اور بیلے چینی کی مست خوشبو نے روح پرور سماں پیدا کر دیا تھا۔ روشنی لکڑی کے کندے مشعلوں کی مانند جلانے کے لئے اونچائی پر چاروں طرف باندھ دیئے گئے تھے جو رات میں بھی دن کا سماں پیدا کرنے والے تھے۔ عورتوں اور بچوں نے بے ہنگم شور مچا رکھا تھا مگر یہ خوشی کا موقع تھا اور اندیشہ ہائے دور درواز کے باوجود گورے بابو بھی ہنس ہنس کر اپنے مہمانوں سے گفتگو کر رہے تھے

اور پھر جب ضیافت کی ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو شام ڈھلے چمکے قبیلے کے بارانی بھی پہنچ گئے دولہا کمار کے چمرٹ میں تھا اور اس کی آن بان قابل دید تھی کمار اپنے قد قامت اور حسن شباب کے لحاظ سے ان سب میں ممتاز اور نمایاں تھا اور صدیوں کی سرداری کا جاہ و جلال اس کی ہر اداسے بھلک رہا تھا۔ چمکے قبیلے کا بڑا پجاری اور حکیم بھی بارات کے ساتھ تھا کیونکہ شادی کی رسوم اسے ہی انجام دینی تھیں وہ بے حد بوڑھا تھا اس کی عمر بڑھ سو سال سے کم نہ ہوگی اور بڑھ صدی کا تجربہ علم اور دانش معمولی چیز نہیں ہو سکتی۔ بارانی گورے بابو کے مکان کے سامنے نصف دائرے کی شکل میں اپنے نیزے تان کر کھڑے ہو گئے اور پجاری نے متر پڑھنے شروع کر دیئے ساتھ ساتھ وہ ڈھول بھی بجائے چار ہاتھ دفعتاً دروازہ کھل اور کمار آگے بڑھ کر دہن لپٹا کر جو اپنے باپ کے بازوؤں کا سہارا لئے باہر آ رہی تھی۔

بلاشبہ یہ ایک بینظیر جوڑا تھا دونوں کے بھڑک دار لباس عروسی نے ان میں وہ شان و شوکت پیدا کر دی تھی کہ ان پر نگاہ ہی نہیں ٹھہرتی تھی دونوں حسین و جمیل تھے اور باوقار اور پر جلال بھی۔

”صاحب آپ پھر بے چین ہو رہے ہیں حالانکہ اب کہانی ختم ہونے والی ہے۔“ لیکن میں اسے بہر حال اپنے ہی طریقے پر بیان کروں گا کیونکہ اس رات کا ایک ایک واقعہ میرے دل پر نقش ہے اور واقعات کی ترتیب میں کوئی تبدیلی مجھے منظور نہیں۔

آہ..... کیا عجیب نظارہ تھا چاروں طرف مشعلیں جل رہی تھیں مقدس آگ خوشبودار بڑی بوٹیوں کے مستی افروز دھوئیں میں نہاں تھی اور دولہا دہن اس مقدس رشتے میں باندھے جا رہے تھے جسے ہمارے عقیدے کے مطابق موت بھی نہیں توڑ سکتی۔ شادی کی رسوم ختم ہوتے ہی ساز بجنے لگے اور پھر ناگو ناچ شروع ہو گیا ناگو جوانی کے ناچ کو کہتے ہیں اور یہ نوجوان جوڑوں کا ناچ ہے اس کا اختتام رقص عروسی

پر ہوتا ہے جس میں صرف دولہا اور دہن حصہ لیتے ہیں۔ اور اسے ایک مقدس ناچ سمجھا جاتا ہے ناگو ختم ہونے ہی والا تھا کہ۔

بڑا صاحب بن بلا یا مہمان بن کر رقص گاہ میں گھس آیا مگر ناچنے والے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر ناچتے رہے اب دوسرے جوڑے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے تاکہ رقص عروسی کے لئے میدان خالی ہو جائے بڑا صاحب لپٹا اور کمار کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی ہولناک نگاہوں سے شرماتی لپاتی لپٹا کو گھورنے لگا وہ بغیر کچھ کہے اپنی ہولناک آنکھوں سے دیر تک اسے گھورتا رہا دفعتاً وہ گورے بابو کی طرف مڑا اور ان سے بولا۔

”بارات غالباً آج رات ہی واپس چلی جائے گی۔“

”ہاں ان ہی پہاڑیوں میں جہاں تم جانا چاہتے ہو.....“ گورے بابو نے جواب دیا۔

”میں صبح سویرے ہی روانہ ہو جاؤں گا اور جلد سے جلد اپنا کام نپٹا کر واپس آ جاؤں گا اور پھر کچھ دن یہاں تفریح کروں گا بڑے صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا اور لپٹا کو گھورنے لگا میں گورے بابو کے پیچھے ہی کھڑا تھا میں نے اچانک ان کے جسم میں کچھ محسوس کی اور میں اپنے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھ کر ان کے اور قریب ہو گیا وہ میرے دوست بھی تھے اور محسن بھی اور وہ اس وقت ایسی لڑکی کے باپ تھے جسے ایک بدנית انسان نگاہ بد سے دیکھ رہا تھا کوئیں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ گورے بابو کے دل میں کیا ہے مگر میں فوری عمل کے لئے بہر حال تیار تھا۔ لیکن اچانک ہی تالیاں بجنے لگیں اور یہ ناگو کے اختتام کا اعلان تھا کسی نے ساز چھیڑا اور پھر ایک ایک کر کے تمام ساز بجتے گئے اور اتنی پر شور اور تیز موسیقی شروع ہو گئی کہ دل سینوں میں زور زور سے دھڑکنے لگے سانس تیز ہو گئیں پھر دفعتاً لپٹا نے پورے جوش اور دلولے سے رقص عروسی شروع کر دیا۔ پہلے اس نے اپنے دولہا کی

ہلاکس لیں پھر اس کے گرد ایک چکر لگایا پورے زور سے گھومی اور پھر مکان کی طرح تن گئی اس کا حسن اپنی مثال آپ تھا اور عالم رقص میں تو اس کے انداز واقعی قیامت ڈھارے تھے موسیقی تیز ہو گئی اور رقص کی شدت بھی بڑھتی گئی پھر لپٹا نے کمار کو جوش رفاقت سے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس سے لپٹ کر رقص کرنے لگی یہ ایک مقدس رقص تھا اور نہ صرف ناچنے والے بلکہ دیکھنے والے بھی ایک سرور میں جھوم رہے تھے رقص ابھی پورے جوش سے جاری ہی تھا کہ۔

اچانک چاندی کے بہت سے سکوں کی جھکار سنائی دی رقص اچانک رک گیا حیران و ششدر لپٹا کے قدموں میں چاندی کے بہت سے روپے بکھرے پڑے تھے اور پھر لپٹا کے چہرے پر ندامت کی زردی اس طرح پھیل گئی جیسے اس کا سارا لبو کسی نے نچوڑ لیا ہو کمار کا چہرہ بھی غصے سے سرخ اور پھر سیاہ ہو گیا اور وہ کچلے ہوئے زہریلے سانپ کی طرح مل کھانے لگا۔

کون تھا وہ خبیث جس نے مقدس دہن لپٹا کو ایک ناچنے والی ایک طوائف سمجھ کر اپنی دولت کی نمائش کی تھی ہر نگاہ میں یہ سوال تھی اور ساری نگاہیں ہر جھکائے واپس اپنے کپ کی طرف جاتے ہوئے بڑے صاحب پر جم کر رہ گئیں۔

اچانک کمار نے خنجر اپنے کمر بند سے کھینچ لیا اور بڑے صاحب کے پیچھے لپکا مگر گورے بابو نے اچانک اس کی کلائی تھام لی اور سرگوشی کی اس کی جب میں بہتول ہے اس وقت اسے جانے دو البتہ کل صبح وہ تیل کی تلاش میں پہاڑیوں کی طرف جانے والا ہے مگر کمار نے اپنے دوستوں کو سمجھا بھگا کر کوئی ہنگامہ کرنے سے باز رکھا اور وہ لوگ اپنے سینوں میں دہائے انتقام کی آگ کو اپنی پہاڑیوں کی طرف واپس چلے گئے۔

بڑے صاحب کے حکم کے مطابق صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی ہم اپنا اپنا بوجھ اٹھا کر پہاڑیوں کی طرف چل دیئے دن بھر ہم سفر کرتے رہے۔ اور رات

کو آرام کر کے صبح سویرے چل دیئے دوپہر ہو رہی تھی کہ مریل ٹیڈوں پر سوار دو قبائلی دور سے آتے نظر آئے وہ سیدھے ہماری ہی طرف آئے اور بڑے صاحب کو بتایا کہ وہ یہ سن کر آئے ہیں کہ وہ تیل کی تلاش میں نکلا ہے اور چونکہ انہوں نے ایک جگہ تیل کے واضح آثار دیکھے ہیں اس لئے وہ بڑے صاحب کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے انہوں نے بتایا کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر گہرائی میں ایک چشمہ ہے جس کی سطح پر روغن کی تہہ سی جی رہتی ہے اور آگ سے چشم زدن میں جل اٹھتی ہے بڑا صاحب یہ سن کر بڑا خوش ہوا اور فوراً انہیں مقول انعام کا لالچ دے کر اکیلا ہی ان کے ساتھ چل دیا ہمیں اس نے حکم دیا کہ یہاں پر ہی کیمپ لگا لیں اور اس کی واپسی کا انتظار کریں اور پھر جب وہ تیلوں ایک پہاڑی کے پیچھے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو رگوا اپنے بھنے ہوئے خون آلود ہونٹ سیکڑ کر چلا اٹھا ”خس لم جہاں پاک“ اور پھر ہم نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

میں صاحب ہمارا دہاں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا بالکل ہی بے کار اور لا حاصل تھا کیونکہ وہ قبائلی جو اسے لے گئے تھے چمکے قبیلے کے لوگ تھے اور ہم قبائلیوں میں پھرنے کے زمانے سے یہ قانون رائج ہے کہ جو شخص بھی ہماری کسی عورت کی توہین کرے اسے دوراتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے نہیں صاحب اس کی موت کے ثبوت کی تلاش بھی لا حاصل ہے بلکہ خطرناک بھی ہو سکتی ہے خواہ یہ ثبوت انشورٹس سمیٹی ہی کو کیوں نہ مطلوب ہوں کیونکہ چمکے قبیلے کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شکار کی لاش پر شہد کا لپ کر کے اسے جنگلی چوہنیوں کے بلوں کے قریب ڈال دیتے ہیں اور چونکہ جنگلی چوہنے انشورٹس کمپنیوں کے قوانین سے آگاہ نہیں ہیں اس لئے وہ ایسی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہنے دیتے جسے شاخت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

☆☆

خوفناک ہیلوین

ثناء احمد - حیدر آباد

”میں نے ان کو ان کے انجام تک پہنچا دیا، اب اپنے اصل قاتل سے بھی بدلہ ضرور لوں گا۔“
مگر ہیلوین کی رات کیونکہ آگلی بار ہیلوین منانے کی باری میری ہے۔“

امریکہ میں ہیلوین کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔

تھیں۔ دکانوں میں بہت زیادہ رش تھا۔ لوگ مختلف قسم کے ماسک اور لباس خریدنے میں مصروف تھے۔ انگریز اس تہوار کو شوق سے مناتے ہیں۔ مختلف قسم کے ماسک اور لباس پہنتے ہیں۔ پارٹیوں میں جاتے ہیں اور بچے گھر گھر جا کر ٹافیاں وصول کرتے ہیں۔ روز بھی شاپنگ کر کے واپس گھر آ رہی تھی کہ اس کا موبائل واہیریت کرنے لگا۔ اس نے اپنا موبائل سائلنٹ پر لگا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ شاپنگ کے دوران ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے واہیریشن لگا رکھی تھی۔ اس نے فون پک کیا جبکہ دائیں ہاتھ سے گاڑی چلا رہی تھی۔ ہاں گھوڑیاں بولیں۔ روز نے فون پک کرتے ہی کہا۔
روز میں تمہارے گھر میں ہوں اور تم کدھر گھوم رہی ہے؟

گھوڑیاں پوچھا۔ بس پانچ منٹ تک آگئی، ڈرائیونگ کر رہی ہوں، روز نے کہا اور فون بند کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ گھر پہنچ چکی تھی۔ روز شاپنگ تم نے بہت کی ہے۔ لگتا ہے اس بار گھر خوب سجاوگی کیوں ایسا ہی ہے نا؟ گھوڑیاں روز سے پوچھا نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔

تو پھر.....؟ گھوڑیاں پوچھا۔ اسے میں روز کی مہی چائے کر آگئی، روز اور گھوڑیاں صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ سامان میں گھر کو سجانے کے لئے نہیں لائی بلکہ اس بار فارم ہاؤس سے آئے۔ روز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے

ساتھ کہا۔

فارم ہاؤس.....؟ میں کچھ سمجھتی نہیں۔ گھوڑیاں حیرت سے کہا۔

میری جان گھوڑیاں اس بار ہم اپنا ہیلوین میری دادی کے فارم ہاؤس میں منائیں گے۔ روز نے کہا تو اس کی امی بھی بولی۔ ”ہاں بیٹا گھوڑیاں روز نے اس بار ہیلوین فارم ہاؤس میں منانے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے بھی سوچا ٹھیک رہے گا۔ جاؤ مزے کرو یہی تو تم لوگوں کی عمر ہے۔“

اگر یہ گھوڑیاں خوشی سے بولی۔ چائے کے کپ خالی ہو چکے تھے روز کی امی نے لٹی۔ روز کی دادی کا فارم ہاؤس نیویارک شہر سے کچھ دور تھا وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جبکہ روز اپنے والدین کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی اور اس کے سب دوست بھی نیویارک کے ہی رہائے تھے۔ روز کے دوستوں میں گھوڑیاں، موزی، میکس اور جیک تھے۔ یہ سب دوست کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے جبکہ روز کا منگیتر ہر خوشی روز کے ساتھ انجوائے کرتا تھا۔ ایک سال ہو گیا تھا ان کی منگیتر کو، رات کو ہیلوین تھا اور روز نے سب سے پہلے اپنے منگیتر کو فون کیا اور سارا پلان بتایا۔ پھر باقی دوستوں کو آگاہ کیا۔ شام تک سب پہنچ چکے تھے۔ ایک بڑی سی دین میں سب دوست اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ دین روز کے منگیتر کو لے گئی تھی اور دین بھی وہی چلا رہا تھا روز اس کے ساتھ آگے بیٹھی ہوئی

تھی، پیچھے گاڑیاں اور سوزی تھیں جبکہ وین کی آخری سیٹوں پر میکس اور جیک بیٹھے ہوئے تھے۔ وین تیزی سے جارہی تھی۔

ویسے روز ہم نے کبھی تمہارا فارم ہاؤس دیکھا نہیں۔ میکس بولا۔

ہاں تو اب جارہے ہو نا، روز بولی۔ گھر کو سجا یا ہوا تھا میں نے تو پھر جب پتہ چلا کہ اس بار فارم ہاؤس جانے کا پلان ہے تو میں حیران رہ گیا۔ روز تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اس بار جیک نے کہا۔ سر پرانز دینا چاہتی تھی اور کچھ نہیں روز نے کہا۔

اوہ یہ لڑکی بھی نا..... اب چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔ اٹی باتیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ سوزی نے کہا تو جیک جو کہ اس کے پیچھے ہی بیٹھا۔ اس کی چوٹیاں جھنجھکی، آہ..... سوزی ہلکا سا جھنجھکی..... لڑکے دونوں ہنسنے لگے..... Idiot، سوزی بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

ہیلوین کا سارا سامان لے لیا؟ کوئلے نے روز سے پوچھا؟

ہاں ماسک بھی سب کے لے آئی تھی اور موم بتیاں، کچھ نئے کپڑے، ڈرنکز اور کیک باقی سب چیزیں بھی، روز بولی۔

کچھ شاپنگ میں نے بھی کر لی تھی۔ کوئلے مسکرا کر بولا۔

کچھ دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ پھر کوئلے اونچی آواز میں بولا۔ لو Gays ہم پہنچ گئے۔ وین رک جگنی تھی۔ اوہ..... میکس، گلوڑیا بولی۔ سب اترے فارم ہاؤس کی حفاظت اور صاف ستھرائی کے لئے روز کے ڈیڈ نے ایک سیکورٹی گارڈ رکھا ہوا تھا وہ اس وقت گیٹ کے باہر کھڑا تھا وہ 45 سال کا تھا، اسے زیادہ کا لگ نہیں رہا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا، کوئلے وین کے اندر ہی تھا اس نے وین فارم ہاؤس کے اندر کی۔ باقی سب باہر ہی اتر چکے تھے۔ فارم ہاؤس کافی بڑا تھا۔ کافی بڑا صحن تھا۔ صحن میں گھاس لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف سوئمنگ پول تھا۔ ہیلو۔ روز نے چوکیدار سے کہا۔

سب اندر چلے گئے۔ شام ہو رہی تھی۔ واہ یار ماننا پڑے گا مکمل صاف ستھرا ہے یہ گھر تو..... میکس بولا۔ انہوں نے گھر کو خوب سجا یا۔ جب گلوڑیا جھٹ پر گئی تو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بھائی ہوئی نیچے آئی۔ روز روز..... وہ آوازیں دیتی ہوئی نیچے آئی۔ کیا ہوا ہے روز نے کہا..... وہ ادھر سامنے والا گھر..... وہ بولتے بولتے رک گئی۔

کیا؟ روز نے بولا۔ چلو میرے ساتھ گلوڑیا نے کہا اور اسے پکڑ کر لے گئی۔ جب دونوں اوپر گئیں تو روز بھی تجسس میں پڑ گئی۔ اس گھر کو جیسے بھی آگ لگی تھی۔ روز نے حیرت سے کہا..... ہاں وہی تو گلوڑیا بولی۔

حیرت ہے آتے ہوئے ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ روز بولی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کچھ آگے ہے، گلوڑیا نے کہا۔ آؤ چوکیدار سے پتہ کرتے ہیں۔ روز بولی۔

وہ نیچے آئیں..... چوکیدار سے روز نے پوچھا۔ اس گھر کو کیا ہوا تھا؟

سب بیٹھے ہوئے تھے چوکیدار نے بولنا شروع کیا۔

وہ جو گھر آپ نے دیکھا ہے نا وہ ایک قصاب کا گھر ہے اس کا نام ولیم تھا۔

وہ گھر بہت پہلے آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ اس گھر کو آگ پولیس والوں نے لگائی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خوب صورت گھر تھا اس قصبے کا سب سے خوب صورت گھر..... چوکیدار کچھ خاموش ہوا پھر بولا۔ جب سب لوگ وہاں پہنچے تو پورا گھر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ ولیم کی چیخوں کی آوازیں سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن پولیس نے آخر کیوں ولیم کو جلا یا؟ کوئلے نے پوچھا۔

پولیس کے مطابق ولیم باگل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور دو بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ جب پولیس وہاں

پہنچی تو اس نے پولیس والوں پر بھی فائرنگ شروع کر دی اور مجبوراً پولیس والوں کو اس کے گھر کو آگ لگانا پڑی..... جب ہم وہاں پہنچے تو پورا گھر جل رہا تھا۔

پر ایسا کیا ہوا کہ ولیم نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ اب کی بار روز نے پوچھا۔ لوگوں کے مطابق ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پولیس والوں نے جھوٹی کہانی بنائی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پولیس والوں نے خود ولیم کے بیوی اور بچوں کو مارا تھا۔ ان کی لاشیں سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ جب ہم نے دیکھا تھا..... چوکیدار نے کہا۔

ہم سے کیا مراد ہے تمہاری؟ اور کون تھا تمہارا ساتھ؟ کوئلے نے پوچھا۔

میں اور اسٹن صاحب..... چوکیدار نے کہا۔ انکل؟ کوئلے حیرانی سے بولا۔ جی ہاں چوکیدار نے کہا۔

ہاں مجھے یاد ہے پچھلی ہیلوین پہ ڈیڈی رات کے وقت ادھر آ گئے تھے۔ کیونکہ دادی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ روز نے کہا۔

اچھا تو یہ سارا واقعہ پچھلی ہیلوین پہ ہوا تھا؟ گلوڑیا اس بار بولی۔

ہاں..... چوکیدار نے کہا۔ اگر لوگوں کی بات سچ ہے تو تم اس وقت کہاں تھے۔ جب یہ واقعہ ہوا؟ کوئلے نے پوچھا۔

تب میں شہر گیا ہوا تھا جب واپس آیا تو آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے کار اندر پارک کی اسٹن صاحب بھی اسی وقت باہر نکلے تھے اور جب ہم وہاں پہنچے تو اور لوگ بھی تھے۔ چوکیدار نے کہا پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔

پولیس نے ایسا کیوں کیا؟ روز نے پوچھا۔ ولیم کے ساتھ کسی کی سخت دشمنی تھی اور اسی دشمنی نے پولیس کو بھاری رقم دے کر ایسا کروایا تھا۔ چوکیدار نے کہا۔

اور وہ شخص کون تھا؟ کوئلے نے پوچھا تو میکس کھڑا ہو کر بول پڑا۔ دفع کرو یار۔ ہمیں کیا لینا دینا؟ تم

لوگ کیا اس ٹاپک کو پکڑ کے بیٹھ گئے ہو وہ جو بھی تھا مرچکا۔ اور ہم گڑھے مردے اکھاڑ رہے ہیں۔ وہ مرا نہیں ہے۔

میکس کی بات کی تردید کرتے ہوئے چوکیدار بول پڑا تو سب حیران رہ گئے۔

کیا؟ روز نے پوچھا؟

ہاں..... جس کسی نے ولیم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ایسا کیا تھا اس کا مجھے تو پتہ نہیں کہ وہ کون تھا البتہ ولیم مر نہیں ہے وہ بخیر گیا تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ مر چکا ہے پر جب دو ہفتوں بعد ان پولیس والوں کے قتل ہو گئے تھے جنہوں نے آگ والی کارروائی کی تھی تب ایک پولیس والے کے جسم پر رکھے ہوئے پیپر پر جو کچھ لکھا تھا وہ پڑھ کر سب کو اندازہ ہو گیا کہ ولیم زندہ ہے۔

ایسا کیا لکھا تھا اس پر؟ کوئلے نے کہا۔

”میں نے ان کو ان کے انجام تک پہنچا دیا، اب اپنے اصل قاتل سے بھی بدلہ ضرور لوں گا۔ مگر ہیلوین کی رات کیونکہ اگلی بار ہیلوین منانے کی باری میری ہے۔“ اور اس کے نیچے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ چوکیدار بولا۔

یعنی وہ اگلی ہیلوین آج رات نہ ہے.....؟ گلوڑیا بولی۔

ہاں، کیونکہ ہیلوین کی رات ولیم کا سب کچھ تباہ ہوا تھا۔ تو اس نے بھی اگلی ہیلوین پہ اپنے اصلی دشمن کا سب کچھ تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چوکیدار نے بتایا۔

پرانے شریف کے قتل کے بعد یہاں نئے شریف کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ پولیس والوں کو قتل کرنے کے بعد ولیم اچانک غائب ہو گیا اور نیا شریف جس کا نام بل ہے ولیم کو تلاش نہ کر سکا۔ اور مجھے نہیں لگتا کہ آج رات کوئی ولیم کے محلے ہوئے گھر کے باہر پہرہ دے گا۔ اسے پکڑنے کے لئے، چوکیدار نے ساری تفصیل بتائی۔

”اور ولیم کیا جج میں آج رات آئے گا؟“ روز نے تجسس میں پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ میں نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بتا دیا۔ چونکہ اصرار نہ کیا۔

اور لوگوں کو کون بتاتا ہے؟ کوئلے نے پوچھا۔ یہ سب محن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج مکمل طور پر ڈوبنے کو تھا غصہ ہی ہوا چل رہی تھی۔

لوگوں کو وہ بوڑھی عورت بتاتی ہے کچھ اس پر یقین کر لیتے ہیں اور کچھ نہیں۔

اس بوڑھی کا گھریا نکل ولیم کے گھر کے سامنے ہے چھوٹا سا گھر ہے۔۔۔۔۔ اسی نے لوگوں سے کہا تھا کہ پولیس والوں نے خود ولیم کا خاندان ختم کیا۔ چونکہ اصرار نہ کیا۔

خیر۔۔۔۔۔ تم اب باہر جاؤ۔ رات ہونے والی ہے۔ ہم نے بھی تیاری کرنی ہے۔ کوئلے نے کہا۔

چونکہ اصرار نہ ہونے لگا۔ کسی چیز کی مدد چاہئے تو بلا لیجئے گا۔ اس قصبے سے کچھ آگے ایک پارک ہے۔۔۔۔۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ ہیلو وین وہیں جا کر مناتے ہیں۔ اور چونکہ اصرار نہ کر چلا گیا۔

اف تو ہے۔۔۔۔۔ سوزی بولتے ہوئے اٹھی۔ حیرت ہے ڈیڈی نے بھی بتایا نہیں اس بارے میں۔ روز بولی۔

دفع کرو۔۔۔۔۔ ہم یہاں سلیم بیٹ کرنے آئے ہیں، اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ کوئلے نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ سب اندر جا رہے تھے۔ رات ہوئی تھی۔

سب نے مختلف ماسک پہنے ہوئے تھے۔ کیا خیال ہے ہمیں اسی پارک میں جانا چاہئے بہت مزہ آئے گا۔ میکس نے رائے دی۔

ہاں کیوں نہیں کوئلے نے کہا۔ Happy Helloven۔۔۔۔۔ سب نے کہا۔

روز باہر آگئی محن میں۔۔۔۔۔ گھوڑیا بھی اس کے ساتھ تھی۔

پڑوسی ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھی ہیلو وین دس کریں۔ روز نے کہا اور کچھ

مکھوم بھی لیس کے۔۔۔۔۔

ہاں چلو گھوڑیا بولی اور وہ باہر نکل گئی۔ آؤ پہلے اسی بوڑھی کے گھر چلتے ہیں۔ روز بولی۔

ارے وہ منحوس ہے ادھر نہیں جائیں گے۔ گھوڑیا نے کہا تو روز بولی۔ ”ایسا نہیں کہتے چلو۔“

نہیں تم جاؤ اکیلی۔ میں واپس جا رہی ہوں اور گھوڑیا واپس جانے لگی۔

روز اکیلے ہی آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔ اسے اصل میں کچھ تجسس بھی تھا جس کی وجہ سے وہ بوڑھی کے گھر کی طرف جا رہی تھی اس نے دروازے پر دستک دی اور مرکز ولیم کے تاجہ حال گھر کو دیکھا۔

یہ بھی کافی بڑا گھر ہے اور یقیناً اپنے وقت میں بہت خوب صورت ہی رہا ہوگا اس نے بڑبڑایا۔ روز نے ماسک پہنا ہوا تھا گولڈن رنگ کا بہت خوب صورت ماسک تھا جبکہ اس کے باقی دوستوں نے خوفناک ماسک پہنے تھے۔ اسنے میں دروازہ کھلا۔ روز نے ماسک اوپر کیا۔۔۔۔۔ Happy helloven اس نے بوڑھی سے کہا جو دروازے کو پکڑے کھڑی تھی۔

تم کون ہو؟ وہ بولی۔

میں روز ہوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس فارم ہاؤس میں آئی ہوں جو ساتھ ہی ہے۔ بوڑھی نے باہر نکل کر فارم ہاؤس پر نظر ڈالی۔

”تم لوگ کیوں آئے ہو یہاں؟ بہتر ہے تم لوگ چلے جاؤ اس بار ہیلو وین منانے کی باری اس کی ہے۔“ بوڑھی روز کو قدرے غصے سے دیکھتے ہوئے بولی اور اندر چلی گئی۔ وہم سے دروازہ بند کر دیا۔

روز کو تب ایک جھٹکا لگا۔ گھوڑیا بھی یہی توجہ میں منحوس ہے۔ روز بولتے ہوئے مڑی ہی تھی تب اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ ولیم کے گھر سامنے کی دیوار گری ہوئی تھی اور اندر محن میں شاید ولیم ہی کھڑا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے صرف انسانی جسم نظر آ رہا تھا۔ یعنی سائے کی طرح۔۔۔۔۔ روز گھبرا گئی اور واپس فارم ہاؤس کی طرف آنے لگی۔ وہ جیسے ہی فارم ہاؤس میں داخل ہوئی سب

دین میں بیٹھ رہے تھے کوئلے جبکہ باہر آنے لگا تھا۔ کہاں رہ گئی تھی تم۔ گھوڑیا نے بتایا کہ تم بوڑھی کے گھر گئی تھی۔ کوئلے نے کہا۔

ہاں دیکھو وہ اکیلی رات ہی پڑوسن بھی ہے سوچا ہیلو وین دس کر آؤں، وہ میری دادی کی جگہ کی ہیں ویسے بھی دادی کا تو جھپٹا ہیلو وین کے دوسرے دن ہی انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن گھوڑیا ٹھیک کہہ رہی تھی وہ تو پاگل ہی لگتی ہے۔ بولی۔ ”بہتر ہے یہاں سے چلے جاؤ۔ ہیلو وین منانے کی باری اس کی ہے۔“ روز بتاتی جا رہی تھی۔

میں نے تو پہلے ہی کہا تھا نہ جاؤ۔ گھوڑیا دین کے اندر سے بولی۔

چلو بھی کوئلے کیا کھڑے ہو گئے ہو؟ چلو روز بیٹھو تم بھی۔۔۔۔۔ میکس نے کہا۔

چلو۔۔۔۔۔ سوچو مت۔۔۔۔۔ کوئلے نے روز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اندر بیٹھے۔۔۔۔۔ کوئلے نے دین اشارت کی اور دین مرکز پر آگئی۔ چونکہ اصرار نہ کیا اور رائفل لے کر کھڑا ہو گیا۔ جب میں مڑی تو ولیم تھا شاید محن میں کھڑا تھا۔ روز نے کہا تو جبکہ زور سے ہنسا۔ تم پر بوڑھی کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔ جبکہ بولا۔ وہ شراب کی بوتل پی رہا تھا۔

کوئلے نے یکدم دین روکی۔ وہ رہا دیکھا۔ روز نے اشارہ کیا۔ جبکہ نے منہ باہر نکالا۔۔۔۔۔ ہائے ولیم کیسے ہو؟ Happy helloven یہ میری طرف سے جبکہ نے کہا اور شراب کی بوتل چھینکی جو ولیم کے گھر کی ٹوٹی دیوار پر لگتی ہی ٹوٹ گئی۔

پاگل ہو گئے ہو؟ روز گھبرا کر بولی۔ اسے چڑھ گئی ہے۔ میکس نے غصے سے کہا۔

تم نے دین کیوں روکی چلو۔۔۔۔۔ گھوڑیا پیچھے سے بولی۔ اسنے میں بوڑھی کے گھر کا دروازہ کھلا۔ ”جاؤ یہاں سے شرارتیں بچو جاؤ۔“ وہ غصے سے بولی اور پتھر اٹھا لیا۔

اوکے اوکے کوئلے جلدی سے بولا اور دین بھاگادی۔

یہ بڑھیا تو ج میں پاگل ہے گھوڑیا نے کہا۔ کوئلے نے لمبا سانس لیا۔۔۔۔۔ ویسے جبکہ کی بھی غلطی ہے۔ سوزی اب کی بار بولی۔

ویسے یہ ہمارے خلاف کیوں ہے؟ روز نے پوچھا۔

کون بڑھیا؟ پاگل ہے سب کے ہی خلاف ہوگی۔ کوئلے نے کہا۔

نہیں یار وہ پہلے بھی غصے میں تھی بولی۔ ہم لوگ یہاں آئے ہی کیوں؟ جیسے ہم نے ولیم کو مارا ہو۔ روز بولی۔ وہ مرنا نہیں ہے زندہ ہے سالہ۔۔۔۔۔ میکس بولا۔

ہاں جو بھی ہے۔ روز نے کہا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

ویسے تمہارے پاپا پہلے ادھر فارم ہاؤس میں ہی رہتے تھے؟ گھوڑیا نے پوچھا؟

ہاں اور ہیلو وین منانے گھر آئے تھے پر شام کو آئے تھے اور رات کو پھر واپس لوٹ گئے جب دادی بیمار تھی۔ پھر دادی کے انتقال کے بعد وہ کچھ جتنے ادھر ہی رہے اور بعد میں نیویارک واپس آ گئے۔۔۔۔۔ جبکہ میں می کے ساتھ بہت پہلے یہاں آئی تھی۔۔۔۔۔

میں تو نیویارک ہی رہنا پسند کرتی تھیں۔۔۔۔۔ ان کو یہ فارم ہاؤس اتنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جبکہ ڈیڈ بولتے کہ وہ انہیں اس قصبے کا سب سے اچھا گھر لے کر دیں گے تب تو انہیں آنا ہی پڑے گا۔ پردادی کے انتقال کے بعد ڈیڈ بھی ہمارے ساتھ نیویارک ہی میں رہنا شروع ہو گئے۔

بس کچھ دن یہاں رہے تھے۔ دادی کے انتقال کے بعد حالانکہ وہ نیویارک میں کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کو اس جگہ سے کافی لگاؤ ہے۔ روز بولی گئی۔

ہے نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ جب سے تمہاری دادی کا انتقال ہوا اس کے بعد وہ یہاں شاید آئے بھی نہ ہوں گے۔ میکس بولا۔

ہاں صحیح کہا تم نے۔ روز نے کہا۔

لوٹنے گئے۔ کوئلے بولا۔

سب گاڑی سے اترے ماسک پہنے۔ جبکہ

جھول رہا تھا۔ میکس نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ پارک بہت بڑا نہ تھا۔ پر کافی رش تھا۔ جھولے گئے ہوئے تھے۔ چیزوں کے انشال لگے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے۔

بینا تم ٹھیک ہو؟ بوڑھی نے پاس آ کر پوچھا۔ مگر ولیم جواب دیے بغیر روز کے فارم ہاؤس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے چہرے پر بکرے کا ماسک پہنا ہوا تھا۔ جس کے اوپر دو سینک بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی جھری تھی۔ ”بہت برا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا۔“

”واپس چلے جاؤ۔“ بوڑھی بڑبڑائی۔ سب اندر شور و غل میں مشغول تھے مگر روز ایک سائیز پر کھڑی تھی اس نے ماسک پہنا ہوا تھا۔ کوئلے پاس آیا۔

کیا ہوا؟ وہ بولا۔
کچھ نہیں۔ روز نے کہا۔
ابھی تک جیک کی حرکت کی وجہ سے پریشان ہو؟
کوئلے نے پوچھا۔
ہاں وہ نہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ روز بولی۔
وہ اس لئے کہ جیک غلط حرکت کی تھی۔
کوئلے نے وضاحت کی۔

مجھے کچھ نہیں لگ رہی۔ وہ ہمارے پیچھے ہی نہ پڑ جائے۔ وہ بوڑھی کچھ تو جانتی ہے۔ روز نے آشفاق کیا۔ تم بھی ناروڑ۔ کیوں پیچھے پڑ گئے؟ صرف ایک بوتل جینے کی وجہ سے؟ اور بوڑھی۔۔۔۔۔ وہ تو ہے ہی پاگل۔ چلویشن نہ کوئلے بولا تو روز ہلکا سا بناوٹی مسکرائی۔

☆.....☆.....☆
چوکیدار کھڑا تھا اس نے بکرے والے ماسک پہنے ہوئے شخص کو دیکھ لیا تھا جو آگے بڑھ رہا تھا۔ ولیم نے بڑی جھری سامنے کی تو چوکیدار ڈر گیا۔ کون ہو تم؟ چوکیدار نے پوچھا۔ اور راکھل سیدھی کر لی۔ ولیم نے جھری زور سے جھینگی چوکیدار کی بائیں آنکھ میں گھس گئی۔
چوکیدار دوسرے ہی لمحے زمین پر جا گرا۔ ولیم

نے گیت کھولا اور اندر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ جیک جب کچھ سنبھل چکا تو بولا۔
تو کس نے کہا تھا اتنی پینے کو۔ میکس نے کہا۔
میں باہر کا چکر لگاؤں۔ جیک بولا اور باہر نکل گیا۔ گلیور یا اور سوڑی سب کو ہیلوین ویش کر رہی تھی۔ ولیم نے پورے فارم ہاؤس کو آگ لگادی تھی پورا فارم ہاؤس آگ میں جل رہا تھا۔

بوڑھی باہر نکلی۔ ولیم اب پارک کی طرف جا رہا تھا وہ جیسے ہی بوڑھی کے گھر کے پاس پہنچا تو بوڑھی اسے پکڑتے ہوئے بولی۔ ایسا مت کرو۔ جو اصل مجرم ہے اسے سزا دو ان کو چھوڑ دو۔ اس نے بوڑھی کو دیکھا۔ وہ ماسک اس پر بہت بھیانک لگ رہا تھا اس کے ہاتھ جلے ہوئے تھے۔ وہ خوفناک سی آواز میں بولا۔ اگر مجھ سے دشمنی تھی تو مجھے مار تے میری بیوی بچوں کا کیا قصور تھا؟ ان سب کے بعد اصلی مجرم کی بھی باری آئے گی۔ یہ بھی تو اسی کے ہی گئے ہیں۔ وہ بولا۔

☆.....☆.....☆

شیرف آپ کو نہیں لگتا کہ ولیم اس ہیلوین کوئی ہنگامہ کرے گا؟ ایک پولیس والے نے پوچھا۔
بہت بہودہ سوال ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں لگتا کہ جو پولیس والے قتل ہوئے تھے وہ ولیم نے کئے تھے۔ وہ تو ہمیں گمراہ کرنے کے لئے ایسا ڈرامہ کیا ہوگا کسی نے۔ شیرف نے کہا۔

ارے ہاں۔۔۔۔۔! کچھ نہیں جاؤ وہ قاتل تو لاؤ دیکھو ذرا۔۔۔۔۔ وہ عورت گمشدگی کی کوئی رپورٹ لکھوا کر گئی تھی دن کو۔۔۔۔۔ شیرف نے سنی ان سی کر کے اپنا حکم دیا۔

☆.....☆.....☆

ارے جیک کہاں ہے؟ کوئلے نے میکس سے پوچھا۔

طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی رہی۔ باہر گیا

ہے۔ میکس بولا۔

روز گلیور یا اور سوڑی کی طرف چلی گئی۔ آڈیشنل سے کچھ خریدتے ہیں۔ سوڑی نے کہا۔
نہیں پہلے ہی جھولے میں بیٹھے ہیں گلیور یا بولی۔

ہاں ٹھیک ہے روز نے کہا۔
میکس اور کوئلے کو بھی بلا لاتے ہیں۔ سوڑی بولی۔

نہیں رہنے دو۔۔۔۔۔ ہم لڑکیوں میں ان کا کیا کام؟ گلیور یا نے ہنس کر کہا۔

جیک سر کو پکڑے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ یعنی وہ کافی آگے نکل آیا تھا ان کی دین کچھ آگے پارک کی ہوئی تھی۔ وہ دین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر گزری۔

اتنے میں اسے ایک بکرے کا ماسک پہنے ہوئے آدمی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ جلے ہوئے تھے۔ اور ایک ہاتھ میں جھری اور دوسرے میں ٹوکا تھا۔ کچھ اور 2 یا تین گاڑیاں فاصلے سے پارک کی ہوئی تھیں۔ جیک اکیلا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے ولیم کی طرف بوتل جھینگی تھی۔ یہ کون ہے؟ ولیم جیک کے پاس آ کر رک گیا۔

ہائے۔۔۔۔۔ ہیلوین۔ جیک نے کہا۔
جیک سمجھ رہا تھا وہ آگے نکل جائے گا پر وہ کھڑا رہا۔ تم مجھے گھور کیوں رہے ہو؟ تم نے تو صحیح خوفناک بن کر ہیلوین کی تیاری کی ہے۔
اتنے میں جیک کی نظر ولیم کے ہاتھ پر پڑی۔
جلے ہوئے ہاتھ۔ جیک بولا۔

ارے قصاب کے بچے ہاتھوں کو کیا کیا؟ کہیں آگ میں ڈال کر۔۔۔۔۔ جیک بولتے بولتے رک گیا۔
قصاب سے فوراً اس کے ذہن میں ولیم کی یاد آگئی۔ جلے ہوئے ہاتھ کیوں ہیں وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا۔

اود گاؤ وہ بولا۔ Happy halloween

۔۔۔۔۔ ولیم نے کہا اور جھری پیٹ میں دے ماری آ۔ جیک کی چیخ نکل گئی وہ کراہ رہا تھا وہ مڑا کہ ولیم نے ٹوکا اس کے سر پر دے مارا۔

تمہیں نہیں لگتا کہ کافی دیر ہوگئی جیک کا پتہ نہیں

کہ واپس کیوں نہیں آیا۔ کوئلے بولا۔

ہاں میں دیکھ کر آتا ہوں۔ میکس بولا۔ ”میں بھی چلوں؟“

نہیں تم انجوائے کرو، میں بس 5 منٹ میں اسے لے کر آیا۔ میکس نے کہا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ میکس وین تک آیا اسے جیک کہاں چلا گیا اتنے میں میکس کی نظر زمین پر پڑی خون۔۔۔۔۔ وہ ڈرا ہوا بولا اس نے وین کا پیچھے والا دروازہ پیچھے کھسکاتے ہوئے کھولا۔

آہ وہ ڈر کے مارے چیخ پڑا۔ اتنے میں پیچھے سے زور کی چیخنے کی آواز آئی۔

ولیم بھاگتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ او شٹ۔۔۔۔۔ میکس بولا اور وین میں گھس گیا۔ اور دین کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا وہ فوراً آگے بیٹھ گیا سیٹ پھلا گئے ہوئے۔

شٹ گاڑی کی چابیاں تو کوئلے کے پاس ہیں۔
وہ خود سے مخاطب ہوا۔

ولیم غائب ہو گیا تھا۔ یہ کہاں چلا گیا؟ مجھے کوئلے کو بتانا ہوگا۔

جیک نے موبائل نکالا۔ دوسری طرف سے کوئلے نے موبائل اٹھایا۔
لڑکیاں واپس کوئلے کے پاس آ گئی تھیں۔
کوئلے میں خطرے میں ہوں۔ ولیم نے یہاں جیک کو قتل کر دیا ہے۔ میکس نے کہا۔

کیا؟ کوئلے حیرانی سے بولا۔ اتنے میں میکس کی چیخ سنائی دی۔

میکس میکس۔۔۔۔۔ پھر ساتھ ہی کوئلے کو عجیب سی آواز سنائی دی۔ Happy halloween اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ او میرے خدا۔۔۔۔۔ کوئلے بولا۔

کیا ہوا کوئلے روز نے پوچھا۔ تو کوئلے نے ساری بات بتائی۔

تو مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ ولیم ہمارے ساتھ کچھ کرے گا۔ روز نے خدشہ ظاہر کیا۔

پر ہم نے اس کا کیا لگاڑا ہے؟ کوئلے نے پوچھا۔
بچ میں پاگل ہو گیا ہے اور وہ بڑھیا بھی۔ گھوریا
بول رہی تھی کہ روز نے ٹوکا۔

”بڑھیا ٹھیک کہہ رہی تھی یہ ولیم دشمن ہے ہمارا
ہمیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“
پروہ ہمارا دشمن کیوں ہے؟ سوزی نے تنگ آ کر
پوچھا؟

یہ وہی بڑھیا بتاتے گی۔ روز نے کہا۔
ہمیں شریف کو اطلاع کرنی ہوگی۔ گھوریا نے
تجو بڑبڑائی۔

ہاں چلو کوئلے بولا اور سب نکل پڑے۔ باہر
آتے ہوئے سوزی نے خدشہ ظاہر کیا۔ اگر وہ سامنے
ہی ہوا تو ہم دین میں کیسے نہیں گے۔ جب وہ ہاں پہنچے
تو کوئلے نے روز کو اشارہ کیا روز سوزی اور گھوریا ایک کار
کے پیچھے چھپ گئیں۔ ولیم دین کے پاس کھڑا تھا۔ کوئلے
نے دین کی چابیاں روز کو دیں۔

مگر تم..... روز بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ تم
فکرت کرو..... سیدھے پولیس کی طرف جانا۔ پھر اس
کے بعد فارم ہاؤس میں..... دروازہ لاک کر دینا اندر سے
..... اوکے..... میری فکرت کرنا مجھے کچھ نہیں ہوگا.....
اور پھر کوئلے چلایا۔ اوپر کے منہ والے۔

کوئلے یہ سب باتیں کار کی ڈی کے پیچھے چھپ
کر رہا تھا۔ مگر پھر اٹھا اور تھوڑا آگے آ کر روز سے چلایا
تو ولیم اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔ کوئلے پارک کی طرف
دوبارہ بھاگ پڑا۔ ولیم بھی پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس نے
لڑکیوں کو نہ دیکھا۔ بھاگ کر روز نے کھڑے ہوتے ہوئے
کہا۔ تو گھوریا اور سوزی نے بھی دوڑ لگا دی۔ روز نے
آگے والا دروازہ کھولا۔ سوزی اور گھوریا نے پیچھے والا
درازہ کھولا تو ان دونوں کی چپیں نکل گئیں۔

جبکہ اور میکس کی لائیں پڑی ہوئی تھیں۔ گھوریا
آگے چلی گئی اور آگے روز کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سوزی بچھلی
سیٹوں پر دراز ہو گئی..... دین تیزی سے چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

کوئلے پارک کے اندر داخل ہوا اس کا ماسک
کب کا اتر چکا تھا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ ولیم بھی پارک میں
انٹر ہوا۔ کوئلے نے دیکھا کچھ دور جھولوں کی طرف ایک
پولیس والا کھڑا تھا۔

شاید یہ ابھی آیا ہو۔ ادھر۔ کوئلے نے سوچا وہ
بھاگتا اس کے پاس گیا اور بتایا کہ اس کے پیچھے قاتل لگا
ہوا ہے۔ ولیم پولیس والے کی طرف بھاگتا آیا۔ ”رکو“
پولیس والے نے پھل سامنے کی طرف کرتے ہوئے کہا
کہ اچانک ولیم نے دوسری طرف دوڑ لگا دی اور جھوم میں
گم ہو گیا۔ سب نے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ وہ غائب
ہو گیا تھا۔ ”تم ڈرو مت“ پولیس والے نے کہا اور آگے
گیا۔

ولیم اسٹال کی طرف بڑھ گیا تھا اس نے فوراً ایک
ماسک اتار لیا..... اوئے پیسے تو وہ دکان والا بولا۔ ولیم
تیزی سے نکل گیا اور رش میں گم ہو گیا اس نے ایک سائیڈ
پر جا کر بکرے والا ماسک اتارا اور آدھے چلے ہوئے
چہرے پر دوسرا ماسک پہن لیا۔ یہ کسی بھوت کا ماسک بنا
ہوا تھا سارا سفید صرف آنکھوں اور مونٹ کے گرد سیاہ
لائیں لگی ہوئی تھیں..... سب جگہ دیکھ لیا..... مگر پتہ نہیں
کہاں چلا گیا۔ اس پولیس والے نے کہا کہ کھرچ کی
آواز آئی اور پولیس والا جھٹکے کی طرح مل کر رہ گیا۔ اس
کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کیا ہوا؟ کوئلے نے پوچھا کہ پولیس والا دھم
سے نیچے گرا اس کی کمر میں چھری تھسی ہوئی تھی۔ جو ولیم
نے دور سے جھٹکتی تھی۔

اوٹ کوئلے بولا۔ ولیم بھاگتا آ رہا تھا۔ سب
لوگوں میں جھگڑتی چلی گئی تھی سب بھاگتے لگے کوئلے نے
پولیس والے کے ہاتھ سے پھل لیا اور بھاگ نکلا۔ اتنی
رش میں ولیم اسے ڈھونڈتا ہی رہا اور وہ پارک سے باہر
نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

دین تیزی سے پولیس اسٹیشن کے سامنے رکی۔
تینوں لڑکیاں باہر نکلیں اور اندر شریف کو شروع سے آخر

سب سنا ڈالا۔ کچھ دیر میں پولیس کی دو کاریں دین
کے آگے چل رہی تھیں۔

دین گھوریا چلا رہی تھی۔ کیونکہ روز دین سے اتر
گئی تھی۔ وہ بوڑھی عورت کے گھر جانے والی تھی۔

گھوریا کے ساتھ سوزی بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں سے
پال سے ہمیں فارم ہاؤس جانا چاہئے تھا۔ سوزی بولی۔
نہیں..... جب تک میں ولیم کو اپنی آنکھوں کے
سامنے مڑتا نہیں دیکھوں گی۔ مجھے یقین نہیں ملے گا۔ گھوریا
بولی۔

ویسے بھی فارم ہاؤس میں اکیلے رہنا ہمارے
لئے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ گھوریا پھر بولی۔

پولیس کی کاریں پارک کی طرف آ رہی تھیں اور
دین کی دین بھی پیچھے ہی تھی۔

اچانک پولیس کی کاریں رکیں انہوں نے بھی
ان روکی..... کوئلے آ رہا ہے گھوریا بولی اور بھی لوگ
لگ رہے تھے..... سب نے ماسک اتار دیے
تھے..... جبکہ ولیم ماسک پہنے ہوئے تھا۔

☆.....☆.....☆

بوڑھی نے دروازہ کھولا تو روز گھبرائی ہوئی اندر
آئی؟ تم؟..... بوڑھی عورت بولی۔

پائیز مجھے بتائیں وہ صرف ہمارے پیچھے ہی
ہوں پڑا ہوا ہے؟ آپ نے پہلے بھی مجھے یہاں سے
لے کر کہا تھا۔ روز نے کہا تو بوڑھی بولی پڑی۔

ولیم اپنی بیوی بچوں سے بہت پیار کرتا تھا وہ ان
کی کمری نہیں سکھاتا تھا اس بیویوں کی رات میں چھت پر
یہ جب میں نے دیکھا کہ کچھ پولیس والے آئے انہوں
نے دستک دی تو ولیم نے دروازہ کھولا۔ انہوں نے ولیم کو
بڑلایا اور اندر کھس گئے..... انہوں نے ولیم کے منہ پر
ب لگا دی اور اسے باندھ دیا۔ پھر اندر فائرنگ کی
لازیں آئیں اور ولیم کی بیوی اور دونوں بچوں کی لائیں
اس والے قہقہے ہوئے لے آئے.....

ولیم چیخ بھی نہیں سکھاتا تھا۔ پھر انہوں نے ولیم کو
کے اندر پھینکا اور آگ لگا دی۔ جب انہوں نے

ولیم کو اندر پھینکا تب اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے تھے
کیونکہ وہ اسے گھر کے اندر بھاگتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔
یعنی چھٹا چلانا اور تنگ و دو کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے
تھے۔ مگر ان کی یہی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ولیم کو آگ
تو لگ گئی تھی مگر اس نے گھر کے پچھلے خفیہ دروازے سے
نکل کر اپنی جان بچائی تھی کیونکہ اس گھر کے پیچھے ایک
ندی ہے ولیم نے اس میں جھانکنا لگائی تھی۔

جب سب لوگ قتل شادیکہ کر چلے گئے تو میں نے
خود اس ندی کے قریب جا کر ولیم کو دیکھا تھا۔ وہ ادھا جلا ہوا
تھا۔ میں اسے گھر لے آئی تھی۔ مگر وہ اس حد تک خوفناک
ثابت ہو سکتا ہے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بوڑھی بولی۔

یہ سب کارنامہ پولیس والوں نے کس کے کہنے
پر کیا تھا؟ روز نے دھکی ہو کر پوچھا۔

ایک شخص ولیم کا گھر خریدنا چاہتا تھا کیونکہ کوئی
شک نہیں کہ ولیم کا گھر اس قہقہے کا سب سے خوب صورت
اور بڑا گھر تھا..... مگر اب تو یہ مکمل تباہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ
ولیم ایک قصاب تھا پر بہت مہیر تھا۔ بادل کا بہت اچھا تھا۔
سب لوگ اس کے عالی شان بگلہ نما گھر کی تحریف کرتے
تھے۔

ایک دن میں نے ولیم کو کسی کے ساتھ لڑتے
دیکھا۔ وہ شاید ولیم کا گھر خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن ولیم کسی
صورت اپنا گھر بیچنے کو تیار نہ تھا۔ ولیم نے اس آدمی کا
گر بیان پکڑ لیا۔ اس نے اپنا گریبان چھڑوایا اور انگلی
دکھاتے ہوئے چلا گیا۔ جیسے وہ ولیم کو وارننگ دے رہا
تھا۔ پھر اسی شام کو اس آدمی نے کچھ پولیس اہلکاروں کو
ساتھ لیا ہوا تھا۔ اور دوبارہ ولیم کی ان کے ساتھ بحث
ہوئی اور پھر اسی رات کو ولیم کے گھر آگ لگ گئی تھی.....
وہ بیویوں کا دن تھا۔ جب ولیم کا اس آدمی کے ساتھ
معمولی جھگڑا ہوا تھا اور رات کو اتنا بڑا واقعہ ہو گیا.....
بوڑھی خاموش ہو گئی۔

پراس جھگڑے کا ہم سے کیا تعلق؟ روز بولی۔
تعلق ہے۔ کیا تم جانتا نہیں چاہو گی کہ وہ آدمی
کون ہے؟ بوڑھی نے کہا۔

لحد بہ لحد بدلتے حالات و واقعات، سسپنس اور خوف میں ڈوبی روداد جو پڑھنے والوں کو اپنی عمر میں جکڑے رکھے گی۔

”یار! وہ جو کہا جاتا ہے ناں کہ تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تو ہم اگر انہیں سچے دل سے تلاش کریں گے تو وہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتے۔ واقعی یہ بات بالکل صحیح تھی۔ یہ مقولہ بالکل سچ تھا۔ کہ سچے دل سے تلاش کیا جائے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ پروفیسر شیرازی تو اس زمین کی ایک عام سی مخلوق تھی۔ ہمیں ایک بہت ہی بڑے میڈیکل سنٹر سے نکلنے نظر آگئے۔ پس کیا کیوں کے سہارے چل رہے تھے۔ غالباً مصنوعی ٹانگیں لگوائیں تھیں۔ فالج نے جسم کا نچلا حصہ مفلوج کیا تھا۔ لیکن اس وقت کافی بہتر حالت میں نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اور ہم نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ ہم دونوں کو اٹھا کر اپنے سینے میں سجا لیتے۔“

”اوئے..... تم..... اوئے تم!.....“ وہ اپنی پسندیدہ بات کو ہمیشہ تین مرتبہ کہتے تھے۔ پھر وہ ہمیں کہاں پھوڑتے، اپنے ساتھ لے گئے جس عمارت میں پہنچے وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ بہت ہی عالی شان، بہت ہی شاندار، وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

”یہ میری کوٹھی ہے۔“

”پروفیسر..... آپ اتنے دولت مند کب سے تھے؟“

”یار یہاں آکر بنا ہوں۔“

”کیسے؟ کیا مطلب؟“

”اچھا مجھ سے انٹرویو لینے کی بجائے تم لوگ یہ بتاؤ..... کہ تم کب واپس آئے۔“

”صرف چار دن پہلے۔“

”کس پروگرام کے تحت آئے ہو؟“

”نہیں سر ہمارے پروگرام اب ہوتے ہی نہیں ہیں۔“

”یہاں آنے کا مقصد بتاؤ۔“

”کچھ نہیں۔ بس دل چاہا کہ اپنی سرزمین، اپنی مٹی کی خوشبو سونگھیں، تو چلے آئے یہاں پر۔“

”کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”اصل میں پروفیسر شیرازی آپ جتنا ہم لوگوں کے بارے میں جانتے ہیں اتنا بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا۔ میرا مطلب صرف اتنا سا تھا کہ ہم یہاں جو کچھ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ وہ کم از کم جرم نہیں ہے۔“

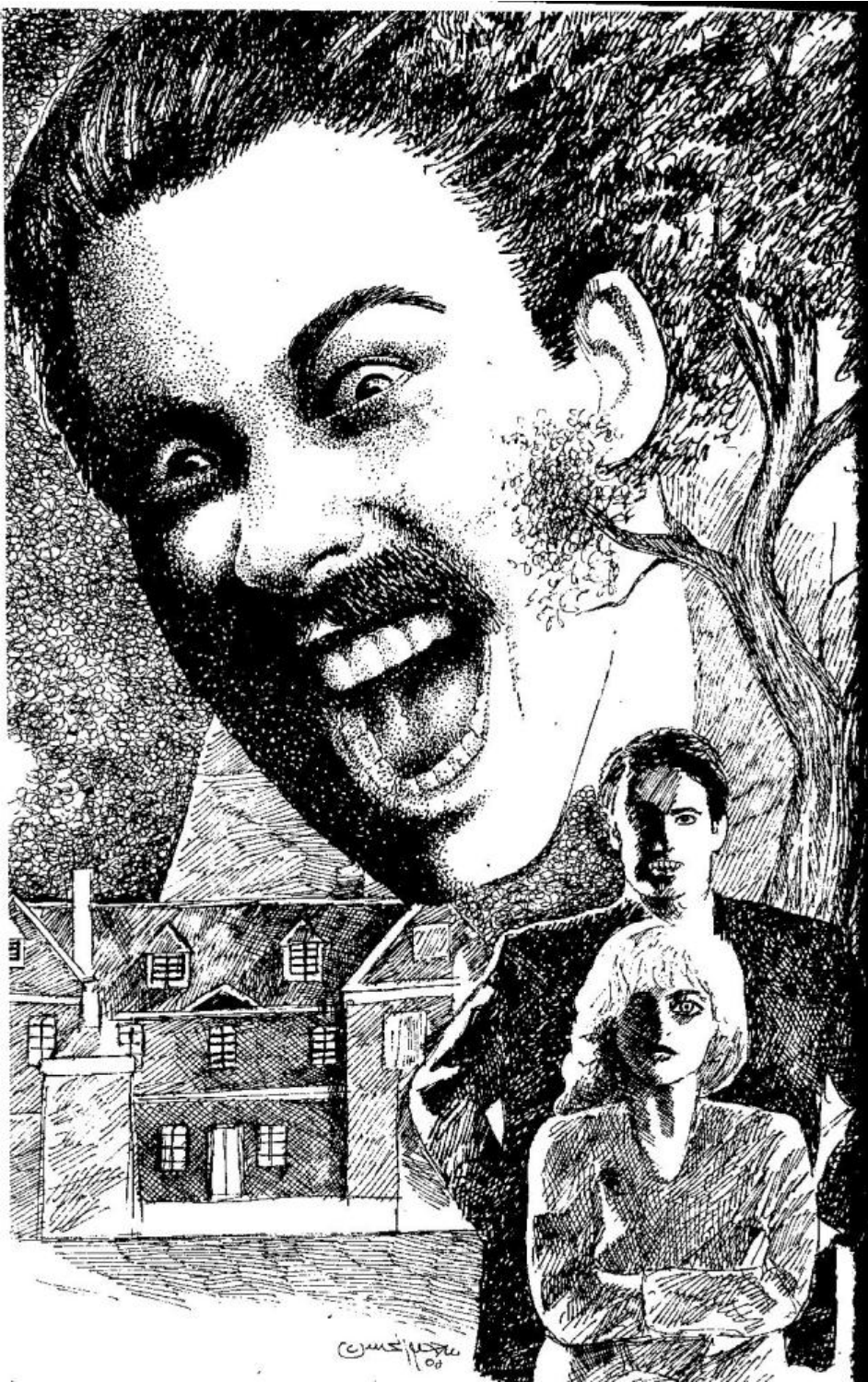
”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آئے تو تھے۔ دوسرا خیال ذہن میں لیکر مگر یہاں آنے کے بعد دل نے کہا کہ اپنی سرزمین پر جرم نہیں کرنا چاہیے بس ایسے ہی کام کیا جائے۔“

”مگڈ..... ویری مگڈ..... ٹھیک..... تو پھر میں تمہیں ایک آفر کرتا ہوں۔“

”جی.....“

”دیکھو..... میں نے ایک چھوٹی سی



آرگنائزیشن بنائی ہے۔ ایک تنظیم سمجھ لو۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں بذات خود کچھ نہیں کر رہا۔ کچھ لوگوں سے میرا رابطہ ہے۔ مجھے چھوٹے موٹے ایسے کام مل جاتے ہیں۔ جن میں میرے ٹریڈ کئے ہوئے چند افراد کو شل کرتے ہیں۔ اور ان کی تکمیل کر ڈالتے ہیں۔ مجھے انکا معاوضہ مل جاتا ہے۔

”کس طرح کے کام؟“

”جرم کے خلاف۔ جرم کے حق میں نہ کہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی مشکل کا شکار ہو گیا ہے۔ میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ میرا مطلب ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ۔ اور اس کا بھرپور معاوضہ لیتا ہوں۔“

”یہ تو پرائیویٹ جاسوسی کا ادارہ ہو گیا۔“

”جتنی بات تو یہ کہ ہمارے ملک میں پرائیویٹ جاسوسی کے لائسنس جاری نہیں ہوتے یا ان کا کوئی رواج نہیں ہے۔ مختلف طریقوں سے کچھ لوگ یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن مشکلات کا شکار ہیں۔ کیوں کہ لوگ جانتے ہی نہیں ہیں۔ البتہ میرے کچھ کلائنٹ ایسے ہیں۔ جن سے مجھے آمدنی بھی ہو جاتی ہے اور وہ میرے لئے کام بھی مہیا کرتے ہیں۔“ ناظم پاشا نے میرے طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”یارا ایک بات کہوں۔ بات بڑی زبردست ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہمارے حق میں..... پھر میں نے ناظم پاشا سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد پروفیسر شیرازی سے کہا۔

”ہمارے لئے بتائیے پروفیسر! کہ ہمارے پاس آپ کے لئے کوئی مچائش قفل ملتی ہے۔“

”مچائش ہی مچائش ہے۔ میں ان چند نامعلوم لوگوں سے تمہاری ملاقات کراؤں گا جو قطعی وقتی طور پر اس قابل نہیں ہیں کہ میرے معیار کے مطابق کام کریں۔ لیکن بہر حال میں کسی نہ کسی طرح ان سے کام چلا ہی رہا ہوں۔ البتہ میں تم دونوں پر مکمل بھروسہ کر سکتا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے تو غلط نہیں ہوگا میری ایک

دعا پوری ہوگئی ہے۔ کہ مجھے کچھ ایسے لوگ مل جائیں جو میرے مرضی کے مطابق ہوں اور وہ تم لوگ ہو۔“

”ویری گڈ..... پھر تو یوں سمجھ لیجئے کہ میں خوشی سے یہ کام کرنے کیلئے تیار ہوں۔“

”بس تو تم لوگ بھی یہ سمجھ لو کہ آج سے تم ہمارے کارکن بن گئے۔ کہاں قیام ہے؟ میں نے اپنے ہوٹل کا نام بتادیا۔ تو پروفیسر شیرازی نے کہا۔

”نیو اسے لائن..... نیو اسے لائن کے فلیٹ نمبر چھپیں، سٹائیکس، خوبصورت فلیٹ ہیں۔ آئے سائے ہیں۔ ان میں ایک تمہارے لئے اور دوسرا ناظم پاشا کے لئے۔ ہر طرح کی ضرورت کی تمام چیزیں تمہیں وہاں ملیں گی۔ آرام سے وہاں رہو۔ ٹیلی فون اور دوسری تمام چیزیں وہاں موجود ہیں۔ میں اپنا ایک آدمی تمہارے ساتھ کر دوں گا۔ وہ چھپیں ہر طرح کی سہولیات فراہم کر دے گا۔ کیا کہتے ہو؟“

”ہم دونوں اگر ایک ہی فلیٹ میں رہیں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“

”یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ایک منزل ہوتی ہے۔ ہر شخص کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اور پھر ایک دوسرے کا اچھا سا تھی بننے کے لئے ضروری ہے کہ تھوڑا سا فاصلہ رکھا جائے۔“

”ٹھیک ہے پروفیسر! اور اس طرح ہم پروفیسر کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔ ملازمت کا تو خیر کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پروفیسر نے ہمیں دنیا کی تمام سہولتیں مہیا کر دیں تھیں۔ ہمارے پاس اپنی اپنی الگ کار بھی تھی۔ اور اس کے علاوہ پروفیسر نے ہمارے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھی جمع کرا دی تھی۔ ہمیں آمدنی نہیں تھی کہ وطن میں ہماری اسطرچ پڑی ہوگی اور ہماری مشکلات کا حل اسطرچ ہمارے پاس موجود ہوگا۔ پروفیسر ہمیں باقاعدہ تربیت دینے لگا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہمیں کیا کیا کچھ کرنا ہے اور ہم بہر حال اس کے ساتھ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے کام کرنے

لگے۔ پروفیسر اعلیٰ ترین شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے یہاں بڑے تعلقات ہو چکے تھے۔ اور نجانے کس کس سے رابطے قائم کر کے وہ اپنے کام سرانجام دے رہا تھا۔ درحقیقت اس دوران اپنے وطن کو جاننے کا موقع بھی ملا تھا۔ اور ہم نے بہت سی باتیں جان لی تھیں۔ ابتدائی معاملات طے ہونے کے بعد۔ پروفیسر شیرازی نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا تھا۔

”میں نے یہاں آنے کے بعد بہت کچھ کیا ہے۔ حکومت کے ایسے بہت بڑے ارکان جو اعلیٰ ترین مہموں پر فائز ہیں اور جن کے بارے میں یہ کھل کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ بادشاہ گرہوتے ہیں۔ مجھے ان کی سرپرستی حاصل ہے۔ اب میں ان گدھے ساتھیوں کے ذریعے کئی ایسے کام کر چکا ہوں جس سے انہیں بڑے فائدے پہنچتے ہیں۔ بہت سے ملکی معاملات میں یعنی غیر ملکی سازشوں کے سلسلے میں بھی میں نے کام کیا ہے اور مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ تم لوگ یوں سمجھو کہ بہت ہی سہمہ گی کے ساتھ اپنا فرض پورا کر سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں بہت جلد ایک منصوبہ ترتیب دے رہا ہوں۔ جس میں تمہیں کام کرنا ہوگا۔

”مثلاً؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ راج گڑھ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کی ریاست ہے۔ راج گڑھ کی ریاست کی رانی، راجا، رانیوں کا دور تو خیر ختم ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو راجا اور رانیوں کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں۔ میں تم سے راج گڑھ کی مہارانی کا بعد میں تعارف کراؤں گا۔ فی الحال تم یہ سمجھ لو کہ تمہیں وقتی طور پر اس کیلئے تیار ہونا ہے۔ کہ ہم راج گڑھ میں ایک بڑے کام کا آغاز کر رہے ہیں۔“

”بڑا کام.....“

”ہاں ابھی تک مجھے جتنی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے تحت میں اسے بہت بڑا کام کہہ سکتا ہوں۔

”گڈ.....“

”پروگرام کیا ہوگا۔“

”سب سے پہلے تمہیں راج گڑھ جانا ہوگا۔“

”تہا۔“

”ہاں..... کبھی اس بات اس بات پر غور نہ کرنا کہ ناظم پاشا تمہارے ساتھ ہے یا نہیں یا ناظم پاشا کے کبھی اس مسئلے میں نہیں سوچنا چاہیے کہ تم اس کے ساتھ ہو یا نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ضرورت کے تحت سارے کام کئے جائیں گے اور ضرورت کے وقت ایک ایک مہرہ آگے بڑھایا جائے گا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“

”راج گڑھ میں تم بڑے آرام کے ساتھ جاؤ گے اور جہاں تک میرے علم میں ہے۔ میری جان میں تم سے کہہ رہا ہوں ناظر سلطان! کوشش کرنا کہ شراب تم تک نہ پہنچے۔ کیوں کہ شراب کے چند پیگ ہی تمہیں ساتوں آسمانوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔ کیا سمجھے؟“ ایسے کئی واقعات خود پروفیسر شیرازی کے علم میں تھے۔ جب میں نے شراب پی لی اور اس کے بعد نجانے کیا کیا بن گیا تھا۔ ایک بار تو خود پروفیسر شیرازی ہنستے ہنستے رہ گیا۔

انگلینڈ کے ایک شاہی خاندان کی تقریب میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور میں اس تقریب میں میں نے بہت ہی پرانی شراب کے صرف تین پیگ لئے تھے اور اس کے بعد میں نے ڈیوک اڈیمیر کو پہنچ کر دیا تھا کہ اصل ڈیوک اڈیمیر امیں ہوں۔ بڑی مشکل پیش آ گئی تھی اور بڑی مشکل سے مجھے قابو میں کیا گیا تھا۔ یہ پروفیسر کے تعلقات اور شخصیت تھے، جس نے بہت بڑے حادثے سے بچایا تھا۔ ورنہ شاید عمر بھر کی جیل میں سزا پڑتا۔

بہر حال راج گڑھ روانگی ہوئی۔ ایک مسافر بردار طیارے نے ہمیں یعنی مجھے راج گڑھ انٹرپورٹ پر اتار دیا۔ میں راج گڑھ کسٹم ہاؤس میں داخل ہوا۔ بہت ہی مختصر سامان میں میرے ساتھ تھا۔ جس میں ایک سوٹ کیکس اور ایک بریف کیس شامل تھا۔ بریف کیس مکمل

طور پر قابل اعتراض تھا۔ لیکن اسے کھولنے والے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس کی کیا اہمیت ہے۔ تاہم اس سے قبل ہی دودھل پوش آدمی اس عمارت میں میرے نزدیک پہنچ گئے۔ اور انہوں نے دوسفید کارڈ نکال کر میرے سامنے کر دیئے۔ میں نے گردن ہلائی۔ دیکھا ہی سفید کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ جس کے بارے میں پروفیسر شیرازی نے مجھے تفصیل بتادی تھی۔

”آپ کا سامان جناب ا“ ان میں سے ایک نے پوچھا اور میں نے سامان کی طرف اشارہ کر دیا۔ میرا سامان ابھی کنویز بیلٹ پر نہیں پہنچا تھا۔ ان دونوں نے آگے بڑھ کر میرا سوٹ کیس اور بریف کیس اٹھالیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر کی طرف چل پڑے۔ کسم افسران نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے میں سٹیٹ گیسٹ تھا۔ ان پورٹ کے باہر ایک لمبی، سیاہ، شاندار مرسلین کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا اور میں اس کے اندر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں افراد میرے دونوں سمت بیٹھ گئے۔ میں باہر نگاہیں دوڑانے لگا۔ درحقیقت راج گڑھ تو واقعی کوئی قدیم راج دھانی معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ شہر انتہائی جدید تھا۔ خوبصورت عمارتوں اور ہریالی کا شہر۔ کارجن سڑکوں پر بھی دونوں سمت میں بڑے خوبصورت باغات لہرا رہے تھے۔

بہر حال ایسے سرسبز علاقے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں خاموشی سے ان جگہوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ہم جس عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی ایسے علاقے کی عمارت ہے جو بس ایک گیر مصروف سی ریاست کا علاقہ ہو۔ عمارت و حصوں میں منقسم تھی۔ باہر ایک بہت وسیع لان تھا اور عمارت کے چاروں طرف درختوں کے جھنڈ لہرا رہے تھے۔ مخصوص طرز کے سفید پتھروں کی روش سے گزر کر کارپورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ یہاں چار آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے دروازہ کھولا اور ہم نیچے اتر آئے۔

کھڑے ہوئے لوگ مہمان خانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مجھے گیسٹ ونگ کی طرف لے گئے۔ عظیم الشان گیسٹ ونگ کے کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ کچھ اور لوگ بھی یہاں گیسٹ ونگ کے کمرے میں موجود تھے۔ میرا کمرہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دو ملازموں نے میرا سامان نکال کر الماریوں میں سجایا اور اپنی خدمات پیش کر دیں۔

”جناب عالی جو بھی ضرورت ہو ہم دونوں آپ کی خدمت کیلئے حاضر ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ پروفیسر شیرازی نے جو مختصر تفصیلات مجھے بتائی تھیں۔ اس کے بارے میں مختصر تفصیل یہ بھی کہہ دیا کہ بے شک ختم ہو گئی ہیں۔ لیکن اب بھی ہمارے وطن میں ایسے ایسے اعلیٰ پائے کے جاگیردار موجود ہیں۔ جو راجاؤں، اور رانیوں جیسی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ رانی ہا خاتم راج گڑھ کی حکمران تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ راج گڑھ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے ستائیس گاؤں اور ان کے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی زمینیں، رانی صاحبہ کی ملکیت ہیں۔ ہا خاتم کے شوہر راجہ گل نواز دنیا سے جا چکے ہیں۔ اور گل نواز کا خاندان راج گڑھ میں پھیلا ہوا ہے۔ بہر حال میرے ذہن میں رانی صاحبہ کا ایک تصور تھا۔ ہا خاتم ہی نے کسی خاص مسئلے میں پروفیسر شیرازی سے رابطہ قائم کیا تھا۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر شیرازی نے کہا تھا۔ کہ وقت سے پہلے تمہیں کچھ بتانا تمہاری تو ہیں ہے۔ تم راج گڑھ چلے جاؤ۔ رانی ہا خاتم خود تم سے رابطہ قائم کر کے تمہیں تفصیل بتائیں گیں۔ تمہیں وہاں صورتحال پر نگاہ رکھنی ہے۔ بہر حال اس کیلئے انہوں نے کچھ وقت بھی دیا تھا۔ مجھے اور اس گیسٹ ہاؤس میں آکر صرف یہاں کے معمولات سے متاثر ہو کر عیش و عشرت میں وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر چچی بات یہ ہے کہ پہلی بار اس تمام عرصے میں ناظم پاشا مجھ سے الگ ہوا تھا۔ یہ بھی ایک مجبوری تھی۔ کیونکہ ناظم پاشا کو کسی اور کام میں مصروف کیا

گیا تھا اور ہم لوگوں نے یہ بات بہر طور اپنے طور پر طے کر لی تھی کہ ہم پروفیسر شیرازی سے بھرپور تعاون کریں گے اور اس کی ضرورت کے مطابق ہی تمام کام پر عمل کریں گے۔ شام کا کھانا گیسٹ ہاؤس کے ایک بہت ہی وسیع ہال میں لگایا گیا۔ یہاں گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے دوسرے مہمان بھی موجود تھے۔ جب لوگوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ یہ سب بڑے سے بڑے لوگ تھے۔ میرا تعارف نادر سلطان کی حیثیت سے ہی کرایا گیا۔ ظاہر ہے نادر سلطان پورے ملک میں کوئی ایک تو تھا نہیں۔ یا اسے کسی حیدر سلطان کا بیٹا تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان تمام لوگوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ اور ان میں جو شخص مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس کا نام شاہ زیب تھا۔ تفصیلی تعارف پر مجھے معلوم ہوا کہ شاہ زیب ایڈووکیٹ ہے اور ریاست کے قانونی امور کی نگرانی کرتا ہے۔

چنانچہ رات کو دیر تک میں شاہ زیب کے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر ہم آرام کے لئے اٹھ گئے۔ دوسری صبح ناشتہ بھی ہم نے یکجا کیا۔ لیکن مہمانوں میں میں نے ایک ایسی شخصیت کو دیکھا جو میرے لئے باعث دلچسپی تھیں۔ یہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ بڑے عجیب و غریب لباس میں اور سب سے الگ تھلک، رات کے کھانے پر بھی وہ موجود تھیں اور اس وقت بھی۔ لیکن جب اس کا نام میرے سامنے لیا گیا تو میں نے خاص طور سے اسے دیکھا۔ اس کا نام میڈم زردانہ تھا۔

”یہ خاتون کیا زندگی کے آخری ایام یہاں گزارنے آئی ہیں۔“ میں نے جھک کر شاہ زیب سے کہا اور شاہ زیب مسکرایا۔

”بہت ہی زبردست عورت ہیں۔ نجانے اس نے اتنی تعلیم کیوں حاصل کی ہے۔ یوں مجھ لیجئے آپ مسٹر نادر سلطان! کہ یہ بہت ہی قابل عورت ہے۔ غیر شادی شدہ ہے اور ماہر طبقات الارض ہے۔ رانی صاحبہ نے کسی خاص ہم کے لئے انہیں طلب کیا ہے۔“ شاہ زیب نے مجھے بتایا۔

”ماہر طبقات الارض اور کنواری اور پھر اس قدر تعلیم یافتہ لیکن اپنی شکل و صورت اور حلیے سے تو یہ گورکن معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ماہر طبقات الارض میں خصوصی شیعہ یعنی قبرستان سے تعلق رکھتی ہیں۔“ شاہ زیب مسکراتا رہا۔ ریاست کے اصول کچھ بھی تھے۔ لیکن میں اپنی فطرت میں بہر حال آزاد تھا۔ فرصت کے لحاظ مجھے زندگی کے سب سے ٹھکانے معلوم ہوتے تھے۔ اور سب سے بڑی مشکل میرے لئے یہ پیدا ہو گئی تھی کہ ناظم پاشا کو مجھ سے عارضی طور پر الگ کر دیا گیا تھا۔

بہر حال دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو میں نے خاتون زردانہ کے کمرے کا رخ کیا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بالکل بیکار بیٹھنا میری فطرت کے خلاف تھا۔ اور ان کے دروازے تک پہنچ کر میں بہت سے منصوبے اپنے دل میں ترتیب دے لئے تھے۔ جب میں نے دروازے پر دستک دی تو چند لمحات بعد دروازہ کھل گیا۔ زردانہ صاحبہ ایک خوبصورت کاؤن بدن پر ڈالے ہوئے تھیں اور انہوں نے مجھے دروازے پر دیکھ کر ناک پر چشمہ درست کیا اور دروازے پر ہی کھڑے کھڑے مجھ سے بولیں۔

”جی فرمائیے۔ کیا تکلیف ہے۔“

”پیٹ کے درد کا شکار ہوں اور اندر آنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ظاہر ہے میرے اس غیر متوقع جواب سے انہیں حیرت ہوئی ہوگی۔ ان کا چشمہ ناک سے گر پڑا۔ جسے انہوں نے بڑی پھرتی سے درست کیا اور جلدی سے بولیں۔

”مذاق فرمانے آئے ہیں آپ؟“

”ظاہر ہے اس عمر میں آپ سے عشق فرمانے نہیں آسکتا۔ براہ کرم مجھے اندر آنے دیں۔“ میں نے ترکی یہ ترکی کہا۔ اور زردانہ خاتم جلدی سے ایک طرف سرک گئیں۔ ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ ان کی عمر اور مرتبے کو نظر انداز کر کے کوئی ان سے اس طرح بھی پیش آسکتا ہے۔ میرا یہ انداز ان کے لئے

اجنبی تھا۔ وہ متحیرانہ انداز میں پلٹیں اور پھر یولیں۔
”لیکن آپ کے پیٹ کے درد کا میرے کمرے سے کیا تعلق ہے۔“

”جی وہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔“ میں نے کمر پر دووں ہاتھ رکھ کر کہا۔
”سنئے میں آپ کو بدتمیزی کا حق نہیں دے سکتی۔ میں رانی صاحبہ سے شکایت کروں گی آپ کی۔ میں ان کی مہمان ہوں اور مجھے ان کے کام کیلئے یہاں آنا پڑا ہے۔ ورنہ..... ورنہ..... ورنہ۔“

”میں آپ سے معافی مانگ لوں گا۔ لیکن براہ کرم یہ بتا دیجئے کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ میرے پیٹ کا درد ٹھیک نہیں ہوگا۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔
”دیکھئے میں بہت نرم دل ہوں..... نرم طبیعت ہوں۔ میں نہیں چاہتی کی میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچے لیکن آپ جس طرح میرے ساتھ بدتمیزی کر رہے ہیں۔ اور جس طرح میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ شاید میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کیا کسی کے کمرے میں اس طرح کھس آنا اور اس طرح پریشان کرنا شرافت ہے۔“
”بالکل نہیں میڈم..... لیکن آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو تو وہ کس طرح اپنے آپ پر قابو پاسکتا ہے۔“

”براہ کرم میرے کمرے سے نکل جائیے ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“
”مجھے صرف ایک بات بتا دیجئے میں چلا جاؤں گا۔“

”جی فرمائیے، آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“ میں نے ٹھگائیے ہوئے لہجے میں کہا۔
”دیکھئے نکل جائے یہاں سے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“ اس بات پر زردانہ اپنا صبر کھو بیٹھیں اور حلق پھاڑ کر چیخیں۔

”ٹھیک ہے میں واپس چلا جاتا ہوں۔ آپ مجھے نکال دیں۔ لیکن کان کھول کر سن لو میں آپ کو

کنواری نہیں رہنے دوں گا۔ میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ میری زندگی کی طرح پیاری زردانہ۔ میری زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ آپ اس دنیا کی رنگینیوں سے دور رہ کر دنیا چھوڑ دیں۔ میں آپ کو کھر دیوں گی موت مرنے نہیں دوں گا۔“ زردانہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کی دووں مٹھیاں غصے سے بھجھ بھجھ گئیں۔ بہر حال اس سے زیادہ مناسب نہیں تھا۔

چنانچہ میں واپس پلٹ گیا۔
رانی صاحبہ کی طرف سے یہاں آنے والے مہمانوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ چنانچہ ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ ایک نوکیلی موشموں والا پہلوان ٹائپ کا آدمی میرے سامنے پہنچا اور اس نے گردن خم کر کے کہا۔

”جناب عالی! اگر سیر و سیاحت کیلئے باہر نکلتا ہوں تو میں حاضر ہوں۔“

”تم سے زیادہ خوبصورت آدمی یہاں اور کوئی نہیں ہے۔“ میں نے سوال کیا اور وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

”پپ..... پپ..... تم..... میں..... میں..... سانسیں ہوں۔ سیر و سیاحت کے لئے کھیاں موجود ہیں۔ تم..... میرا مطلب ہے..... وہ بری طرح بوکھلا گیا۔

”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں۔“
میں نے کہا۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ دل تو چاہا کہ زردانہ بیگم کو اپنی اس سیاحت میں مدعو کروں۔ لیکن ابھی ذرا جو کہ چکا تھا اس کا رد عمل دیکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ احتیاط کی۔ اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ پھر میں نے اس حسین شہر کے کچھ اور حسین مناظر دیکھے اور کافی دیر تک اس کے لواحات کی سیر کرتا رہا۔ اس دوران ذہن میں کچھ نئے منصوبے ترتیب پاتے رہتے۔ آخر کار کافی دیر تک سیر و سیاحت کرنے کے بعد واپس رانی ہما خانم کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں موجود ملازموں نے اطلاع دی کہ رات کا

کھانا رانی صاحبہ کے ساتھ کھایا جائے گا۔ پروفیسر شیرازی نے رانی ہما خانم کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ اس نے میرے دل میں ایک جنس سا پیدا کر دیا تھا کہ دیکھو یہ رانی صاحبہ ہیں کیا چیز۔ لیکن بہر حال اتنا بھی نہیں کہ میں انہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رانی صاحبہ کو ہر حالت میں خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرنا تھا۔

رات کو تمام مہمان اندرونی عمارت کی طرف چل پڑے۔ میں نے بھی ایک خوبصورت ڈزسوٹ زیب تن کیا تھا۔ ایسی دعوؤں کے آداب مجھ سے زیادہ کس کو آسکتے تھے۔ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے میں نے بھرپور کوشش کی تھی۔ بہر حال میں ہال میں داخل ہوا۔ جہاں رانی صاحبہ مہمانوں کے استقبال کیلئے موجود تھیں اور درحقیقت مجھے میری کاوشوں کا صلہ مل گیا۔ یعنی میری طرف دیکھنے والی آنکھیں پُر شوق تھیں اور عین سے بھرپور تھیں۔ خود رانی صاحبہ نے مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا اور میں نے ان کی نگاہوں میں پسندیدگی کے جذبات پائے تھے۔ وہ بلاشبہ رانی ہی لگتی تھیں۔ بلند و بالا قد و قامت کی مالک انتہائی جاذب نگاہ عمر انٹھاس یا تیس کے درمیان ہو گی۔ لیکن جسمانی موزونیت اور رکھ رکھاؤ قابل دید تھا۔ انہوں نے نہ تو لباس سے اور نہ ہی میک اپ سے اپنی عمر کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ چہرے کے تاثرات اور نہ اداؤں سے الہیز پن ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک پروقار مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے گردن خم کی اور نزدیک کھڑی ہوئی اپنی بیکٹری سے پوچھا۔

”ان کی تعریف۔“

”نادر سلطان۔ معرفت پروفیسر شیرازی۔“
رانی صاحبہ نے گردن خم کی لیکن میرے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا تھا۔ وہ گونجدار اور باٹ دار آواز مجھے یاد آگئی تھی۔ جو میں نے اس جگہ سنی تھی جہاں وہ خیمے لگے ہوئے تھے۔ اور جہاں مجھے اور ناظم یا شاہ کو ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا تھا۔ اسی آواز میں ایک ایسی کھٹک

اور گرج سی تھی کہ دونوں کی آمیزش بہت ہی خوبصورت لگتی تھی۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ رانی صاحبہ کو دیکھ کر میرے بند ذہن کا خاکہ اچانک ہی کھلا تھا۔ اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ لگتی طور پر پروفیسر شیرازی کسی خاص ہی راستے پر چل پڑا ہے۔ بہر حال مہمانوں کے استقبال کے بعد رانی صاحبہ بھی کھانے کی میز پر آگئیں۔ کھانے کی میز اسٹنڈے شاندار کھانوں سے سجی ہوئی تھی کہ دیکھ کر خود بخود ہی جھوک لگنے لگتی تھی۔

پھر کھانے کا دور شروع ہو گیا۔
”ہم جانتے ہیں کہ آپ سب حضرات ہماری خواہش پر یہاں تشریف لائے ہیں۔ لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو میری مصروفیت کے باعث انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ کل ہم آپ سے ضرورت کی بات کریں گے تاکہ وہ رسی کام ہو جائے۔ جس کیلئے آپ کو زحمت کرنا پڑی ہے۔ اور اس کے بعد آپ جب تک پسند فرمائیں یہاں قیام فرمائیں۔ مہمان خانہ آباد دیکھ کر ہمیں دلی مسرت ہوئی ہے۔ کھانے کے بعد رانی صاحبہ نے مختصر اگہا اور اس کے بعد یہ نشست برخواست ہو گئی۔ مہمان خانے سے واپس آتے ہوئے میرے ذہن میں نچانے کیا کیا خیالات رقصاں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس پر اسرار اور خطرناک ماحول میں جبکہ کل دعاوت گری کا دور دورہ تھا۔ رانی صاحبہ کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ کیا مجھے اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ صرف آواز سے صورتحال کا جائزہ لینے اور اس پر کوئی بھروسہ کر لینا ذرا عجیب سی بات ہوتی ہے۔ بہر حال میں انہیں سوچوں میں غم تھا کہ شاہ

زیب میرے پاس پہنچ گیا۔

”ہیلو..... مالی ڈائریٹر نادر سلطان آؤ..... تھوڑی دیر گئیں شجیں لگائیں گے۔ آؤ۔“ میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ شاہ زیب نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد الماری سے ایک بوتل نکالی اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”یہ رانی صاحبہ انتہائی سنجوس ہیں۔ ایک بار بھی پینے کے لئے نہیں ملی۔ کیا تم بھی اس کا شوق رکھتے ہو یا نہیں؟“

”نہیں شاہ زیب! ہرگز نہیں۔ شراب دیکھ کر ہی میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔“

”یار ایسا مت کہو۔ میں تو بڑی امید کے ساتھ تمہیں یہاں لایا تھا۔ اور تو کوئی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس میں شامل کیا جائے۔“

”ایک بہت ہی اہم شخصیت کو تم بھول رہے ہو شاہ زیب۔“

”محترمہ..... زردانہ۔ سنا ہے وہ بڑے شوق سے پہنچتی ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ یار کس کا نام لے دیا تم نے۔ عجیب وغریب خاتون ہیں۔“

”جو کچھ بھی ہیں۔ کنواری تو ہیں۔ یوں سمجھو کہ ایک ویران خانے میں کوئی تو مرس ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو یہاں کوئی دلکشی تھی۔“ میں نے پُر مذاق لہجے میں کہا۔

”مس! شاہ زیب ہنس پڑا اور پھر بولا ”بہت پُر مذاق آدمی ہو یا تم۔ کوئی اتنی سال کی بڑھاپا اگر کنواری ہو تو کیا اسے مس کہتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔“

”کچھ بھی ہو۔ اگر اس سے پوچھا جائے گا تو وہ یہ ہی کہے گی کہ مس زردانہ۔“ اس دوران شاہ زیب نے شراب کی بوتل کھول لی تھی۔ پھر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”بار تم نے بڑا مایوس کیا۔ تمہارے سینے میں تو کبھی مزہ نہیں آتا۔ لیکن دیکھو اگر کبھی پی پی ہے تو آج میرا ساتھ دے دو۔“

”شاہ زیب پلیز مجھے اس طرف متوجہ نہ کرو۔ ورنہ تم سب مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔“

”کیا مطلب؟“

”بس یار میں شراب کے چند پیگ پی کر ذہن پر قابو نہیں رکھ پاتا۔“

”ارے بس پیتا اور سو جانا۔“ شاہ زیب نے مجبور کرتے ہوئے کہا اور شراب کی بوتل کھول لی۔ گلاسوں میں ناچنی لال پری دیکھ کر میری نیت بھی خراب

ہو گئی۔ اور میں کھٹکھٹا کر شکار ہو گیا۔ پھر وہ منحوس شے مجھے اپنے قریب کھینچ لائی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے سامنے آئی ہو اور میں اسے نظر انداز کر سکا ہوں۔ ایک ماضی تھا اس کا بھی۔ بہر حال میں شاہ زیب کے نزدیک پہنچ گیا اور چھوٹی چھوٹی چمکیاں لپٹی شروع کر دیں۔ میں نے شاہ زیب سے درخواست کی تھی کہ مجھے دو تین پیگ سے زیادہ نہ دے اور اس کے بعد مجھے میرے کمرے میں پہنچا دے اور شاہ زیب نے وعدہ کر لیا تھا۔ بذات خود وہ مضبوط پینے والا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن تین پیگ کے بعد وہ رک گیا۔ البتہ میں تین پیگ پینے کے بعد ہی عجیب وغریب باتیں سوچنے لگا تھا۔ یہ رانی صاحبہ سو فیصدی وہی عورت تھی۔ جسے میں نے پابہر کی دنیا میں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں رانی وہاں کیا کر رہی تھی۔ شاہ زیب میرے صورت دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ سے بات چیت کی۔ اور شاید میرے الفاظ میں کچھ گر بڑ محسوس کر کے اس نے پتہ بند کر دیا اور بولا۔

”اب اگر تم چاہو تو میں تمہیں تمہارے کمرے تک پہنچا دوں۔“

”ہاں..... شاہ زیب یہی مناسب ہوگا۔ ورنہ کیا فائدہ کہ میں اپنے آپ کو چھوٹی محسوس کروں۔ اور تمہارے سر کو طبلہ“ میں نے ہنس کر کہا اور شاہ زیب بھی ہنسنے لگا پھر اس نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔

”تو پھر آؤ میں تمہیں تمہارے کمرے تک پہنچا دوں۔“

”ظہر و..... پہلے میں اپنا جائزہ لے لوں۔ کیا واقعی اس قدر بہک گیا ہوں کہ اپنے کمرے تک نہیں جا سکتا اور اٹھ کر اپنے پاؤں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر میں نے شاہ زیب سے کہا۔ میں تمہارا ساتھ نہ دے سکا۔ میں اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور شاہ زیب نے شکریہ کے ساتھ گردن ہلا دی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ مہمان خانے میں موجود دوسرے لوگ سوچے تھے۔ تمام کمروں میں تقریباً تار بکی پھیل چکی تھی۔ میں بھی اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ راستے

میں میں نے سوچا کہ رانی صاحبہ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ کیا میں اتنا ہی عام انسان ہوں کہ مجھے بھی دوسرے عام لوگوں کے ساتھ سمجھایا جائے۔ یہ تو یقین ہے۔ سراسر تو یقین۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے یہ مہمان خانہ چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن پھر پروفیسر شیرازی۔

”ہوں..... ایسی تھی..... اس کی کیا گھبتا ہے وہ اپنے آپ کو معذور کہیں کا۔“ میں نے فضا میں گھونسا چلایا اور میری نگاہ ایک دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ جس کے اندر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ”واہ..... یہ کمرہ تو مرس زردانہ کا ہے۔“ میں نے سوچا اور بڑے مست انداز میں آگے بڑھ کر مرس زردانہ کے دروازے پر دستک دینے لگا۔

”کون ہے۔ آ جاؤ۔“ بوڑھی کی آواز سنائی دی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ بڑی بی ایک آرام دہ کرسی پر دراز پھیل لیپ جلائے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر عجیب سے انداز میں کتاب نیچے رکھ دی۔

چند ہی لمحوں کے بعد ان کا منہ تمہیرانہ انداز میں کھل گیا۔ میں نے بڑے ادب سے گردن خم کی اور وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”آپ..... اس طرح..... اور اس وقت میرے کمرے میں.....“

”ایک بہت بڑی جمہوری یہاں کھینچ لائی ہے۔“ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”جی فرمائیے۔“

”میں جانا چاہتا ہوں کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔“ میں نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھئے!..... آپ اپنی اور میری عمر کا تجزیہ کریں اور پھر ایک بات آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ میں کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتی۔ آپ کو اس بد نظیری کی سزا دینے پر آؤں تو لینے کے دینے پڑ جائیں آپ کو۔ اس لئے آپ عمر کے فرق سے میرا احترام کریں میں نہیں چاہتی کہ میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔“

”محبت عمر کا فرق نہیں دیکھتی۔ مس زردانہ..... جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے مجھے اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ میں آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ مس زردانہ! خدا کے واسطے میرا دل نہ توڑ دے۔“ میں نے بڑی عاجزی سے کہا اور زردانہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

”گیٹ آؤٹ.....“ میں کہتی ہوں نکل جاؤ۔ تم اپنی شاندار شخصیت کے باوجود ایک گھٹیا انسان معلوم ہوتے ہو۔ نکل جاؤ۔“

”آپ مجھ سے شادی کا وعدہ کر لیں میں نکل جاؤں گا۔ ورنہ اسی جگہ آپ کے دروازے پر خود کشی کر لوں گا اور پھر یہ سمجھ لو کہ کیا ہوگا۔ مجھے سچا عاشق قرار دیا جائے گا۔ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا وغیرہ کے ساتھ ساتھ میرے اور آپ کے قصے بھی زبان زد عام ہوں گے۔ میری محبت قبول کر لیجئے۔“

”میں کہتی ہوں نکل جاؤ یہاں سے“ زردانہ حلق پھاڑ کر چیخی اور اس نے ایک گلدان اٹھالیا۔

”مار ڈالئے..... مار ڈالئے میں تو خود ہی مرنا چاہتا ہوں۔“ میں زمین پر بیٹھ گیا اور وہ بے چاری پریشانی سے ہانپنے لگی۔ پھر گلدان رکھ کر میرے قریب آگئی اور نرم لہجے میں بولی۔

”تو تم مجھے چاہتے ہو۔“

”دل و جان سے“ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کھڑے ہو جاؤ“ وہ بولی اور میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”مجھے پیار کر دو..... مجھے چومو.....“ یہ الفاظ کہہ کر اس نے مجھے شاید آزمائش میں ڈالا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مذاق کا بھرم یہاں آ کر ٹوٹ جائے گا۔ لیکن بد بخت کو معلوم نہیں تھا کہ میرے ذہن پر اس وقت شراب حاوی ہے۔ میں نے وہی کیا جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ اپنی ذہانت، کاشکار ہو گئی اور میری اس حرکت نے اسے پاگل کر دیا۔ وہ بے تحاشہ مجھے سینے لگی۔ رات کا وقت تھا۔ مہمان خانے کے ملازمین بھی مہمانوں سے آخری ضرورت پوچھنے کے بعد سو نہ چلے گئے

تھے۔ ورنہ ایک اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ بمشکل تمام اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر نکالا تھا۔ لیکن میرے ذہن پر اس کا بھوت سوار تھا۔ نجانے کب تک میں اس کے دروازے پر کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ اور پھر مایوس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میرے ذہن میں نجانے کیا کیا خیال آرہے تھے اور پھر اسی طرح آنسو بہاتے بہاتے میں سو گیا۔ دوسری صبح جب جاگا تو رات کا واقعات ذہن میں موجود تھے۔ ایک دم ہی مجھے احساس ہوا کہ شراب رات کو اپنے گل کھلا چکی ہے۔ دوسرے لمحے اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگا۔ بری طرح مسل کر مسل کر ہونٹ دھوئے۔ کجنت شاہ زیب کی ایسی جیسی منع کیا تھا میں نے کہ مجھے شراب نہ پلائے۔ لیکن جو کچھ ہو بہت برا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زردانہ سے رات کی حرکت کی معافی مانگوں گا۔

لیکن ناشتے کے کمرے میں سب موجود تھے۔ مگر وہ نظر نہیں آئی۔

”زردانہ کہاں ہے.....؟“ میں نے شاہ زیب سے پوچھا۔

”سنا ہے صبح ہی صبح چلی گئیں۔“

”سامان سمیت۔“

”ہاں..... ملازموں نے بتایا کہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔“

”اوہ..... میرے خدا۔“ میں نے آنسوؤں سے گردن ہلائی۔

”کیوں کوئی خاص بات ہوئی کیا؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”نہیں بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ روتی تھی پیچاری کہ دم سے۔ کم از کم اس ویرانے میں ایک بس تو تھی۔“ میں نے شاہ زیب کو ٹال دیا اور سر جھکا کر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ دن کو تقریباً دس بجے ہا خانم کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ میں تیار ہو کر اس ملازم کے ساتھ چل پڑا جو مجھے بلائے آیا تھا۔

خوبی کے اندرونی حصے میں رانی ہا خانم ایک

شاندار کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے اندر جا کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔ چہرے پر محنت کا وہی عالم تھا۔ جو میں نے پچھلی رات دیکھا تھا۔ بلاشبہ اس عورت کو حسین ترین عورت کہا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے چہرے سے ذہانت کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ ایک پُر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مجھے پیشے کی پیشکش کی اور میں بیٹھ گیا۔

”پر وگرام تو میرا یہ تھا کہ میں آج مہمان خانے میں موجود تمام مہمانوں سے ملاقات کروں۔ لیکن میں نے اس معذرت کر لی ہے اور صرف آپ کو زحمت دی ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ہا خانم مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

”آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے مجھے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کیا آپ کو اپنی یادداشت پر اتنا ہی بھروسہ ہے۔“

”جی ہاں۔ مجھے یقین ہے۔“ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ الفاظ مجھے اس وقت نہیں کہنے چاہیے تھے۔ میں نے جواب دیا اور ہا خانم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں میں بھی اس برجستہ جھوٹ پر آپ سے معافی چاہتی ہوں۔“

”جی.....“ میں نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

”آپ کا خیال درست تھا۔ میں کچھ عرصہ پہلے ملک سے باہر لٹی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں وہاں جس انداز سے گئی تھی۔ وہ ایسا تھا کہ قریب سے قریب کا شخص بھی مجھے نہ پہچان سکے۔ میں اس وقت آپ کی بات سے صرف اسی لئے انحراف کیا تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ دوسروں کو یہ بات معلوم ہو۔“

”میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔“

”چھوڑیں..... ویسے آپ کی شخصیت میرے لئے بھی حیران کن ہے۔ یقین کریں کہ میں سوچ بھی

نہیں سکتی تھی کہ پروفیسر شیرازی کے ادارے میں آپ جیسا کوئی شخص بھی موجود ہوگا۔ ویسے آپ وہاں کس سلسلے میں گئے ہوتے تھے۔“

”میں دنیا کے بہت سے ملک دیکھ چکا ہوں۔ کافی آوارہ گردی کی ہے میں نے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہر حال چلے چھوڑیے۔ میں آپس سے اپنے مطلب کی بات کروں گی ویسے آپ نے ہماری ایک معزز مہمان کو ناراض کر دیا۔“ وہ بولی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں نہیں سمجھا۔“ میں نے کہا اور ہا خانم نے ایک سفید کاغذ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔ میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ یہ پرچہ تھا جو پیچاری زردانہ کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

”خانم..... انتہائی بد دل ہو کر جا رہی ہوں۔ آپ کے مہمان خانے میں لوگوں کے معیار کا کوئی تعین نہیں ہے۔ ہر طرح کے لوگ یہاں آ سکتے ہیں۔ یہاں موجود ایک شخص میرے لئے درد سبب بن گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ایک کھلنڈ رافض ہے اور محض وقت گزاری کے لئے وہ مجھے تختہ مشق بنا رہا ہے لیکن کیا یہ میری تو بین نہیں ہے کہ اس نے مجھے سے اظہار عشق کر کے میرے جذبات مجروح کئے ہیں۔ مجھے آنسوؤں سے کہ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

زردانہ،

”جی“ میں نے پرچہ بند کر کے سنجیدہ نگاہوں سے ہا خانم کو دیکھا۔

میں نہیں جانتی کہ آپ مس زردانہ سے اظہار عشق میں کہاں تک مخلص ہیں۔

بہر حال وہ آپ کو ٹھکرا کر چلی گئی ہیں۔

”بس۔ کچھ ایسی ہی ذاتی سی بات ہے۔“

”ایک بات بتائیے۔“

”جی۔“

”پروفیسر شیرازی نے آپ کو کوئی تعارفی خط وغیرہ دیا ہے۔“

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی.....“ میں نے اپنی جیب سے وہ لفاظی نکال کر ہا خانم کی جانب بڑھا دیا جو خاص طور سے پروفیسر شیرازی نے مجھے دیا تھا۔ لفاظی کا کاغذ نکال کر اس نے اسے با آواز بلند پڑھا۔ پروفیسر شیرازی نے میرے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہا خانم نے اسے دیکھا اور بولیں۔

”اصل میں مجھے سوال کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن ذاتی طور پر میں آپ سے بے تکلفی سے بات کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے۔“

”ضرور۔“

”آپ اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہیں۔“

”اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔“

”ہوں“ آپ کے گفتگو کرنے کا انداز بڑا انھوں

ہے۔ مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔ جو سامنے والے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے بالکل کھرے کھرے لہجے میں گفتگو کریں۔ اب مجھے آپ یہ بتائیے کہ آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں۔“

”بہت کچھ۔ جس کی آپ کو ضرورت ہو۔ پہلے تو میں یہ جانا چاہوں گا کہ آپ پروفیسر شیرازی سے کیا چاہتی ہیں۔ یہ بات تو آپ بھی جانتی ہیں مگر ہم لوگ ایسے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں جن کے سلسلے میں نہ تو پولیس سے مدد لی جاسکتی ہے اور نہ ایسے ذاتی لوگوں سے جن سے بہت سے معاملات ہوتے ہیں۔“

”ایک بات اور بتائیے آپ مسٹر نادر سلطان! اگر کوئی ذاتی راز آپ کو دے دیا جائے۔ تو کیا آپ اس کے محافظ ہوتے ہیں۔“

”پروفیسر شیرازی یہی کہتے ہیں کہ ان سے رجوع کرنے والے ان پر اعتماد کر کے ہی ان سے کام لیتے ہیں۔“

”اور معافی چاہتی ہوں کہ اگر میرے دشمن آپ کو خریدنا چاہیں تو.....؟“

”بہن نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہن نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہن نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہن نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہن نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہن نہیں کہتے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہر حال اب میں آپ سے بے تکلفی سے بات کروں گی۔ اور اس کی پہلی شکل یہ کہ میں تمہیں آپ نہیں کہوں گی۔ تمہاری شخصیت اتنی متاثر کن ہے کہ تم سے کسی گھٹیا پن کی توقع نہ کی جاسکتی۔ مجھے خود کسی ایسے ہمدرد سا بھی کی ضرورت ہے۔ جس سے میں انتہائی بے تکلفی سے اپنے دل کا حال بیان کر سکوں۔ ایک اتنی بڑی ذمہ داری کو اٹھانا اتنا مشکل کام ہے کہ انسان پس کر رہ جائے۔ تم لوگ مجھے بڑے بڑے محترم ناموں سے خطاب کرتے ہو۔ رانی کہتے ہو مجھے اور میرا دل یہ چاہتا ہے کہ جب مجھے کوئی رانی کہے تو میں اس کے منہ پر تختہ رسید کر دوں۔ رانی کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے۔ مجھ جیسی مجبور اور بے کس عورت کو نام سے خطاب کرے۔ اور مجھ سے یہ ساری ذمہ داریاں لے لے۔

بڑی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کی بھی۔ دنیا کی نگاہوں میں ہم کچھ ہوتے ہی۔ اور اپنے جذبات اور کیفیات میں کچھ اور۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“

”ایک بات مجھے اور بتا دو۔“

”جی فرمائیے۔“

”اگر کسی طور میرا تم سے اختلاف ہو جائے اور تم پسند نہ کرو اس بات کو جو میں تم سے چاہتی ہوں۔ تو کیا ایسی صورت میں تم میرے نقصان دہ ہو سکتے ہو۔“

”دیکھئے کوئی بھی سلسلہ شروع کرنے سے پہلے۔ ہمیں تمام معاملات پر بات چیت کر لینا ہوگی۔ اس کے بعد کسی اختلاف کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ آپ بھروسہ کر لیں کہ آپ کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

”بہت بہت شکریہ۔ کیا اس کام کے معاوضے کی بات بھی تم سے ہی کرنا ہوگی۔“

”میرا خیال ہے نہیں، میں معاوضے وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اس کا فیصلہ پروفیسر شیرازی ہی کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ بہر حال تم یہ سمجھ لو کہ میں منہ مانگا معاوضہ دوں گی اور جس انداز میں تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ اس کے لئے میں ذاتی طور پر تم سے ایک بات کہوں۔ کہ اس میں تمہاری شخصیت کا بہت بڑا دخل ہے۔ پروفیسر شیرازی ایک قابل اعتماد آدمی ہے اس کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہیں مجھے لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اگر انہوں نے کوئی دوسرا آدمی بھیجا ہوتا تو شاید میں اتنی بے تکلفی سے اسے اپنا راز دار نہ بناتی۔ میں تمہیں تھوڑی سی تفصیل بتا دوں۔ مجھے ہما خانم کہا جاتا ہے۔ بلکہ رانی ہما خانم کہا جاتا ہے اور راج گڑھ میں، میں بہت بڑی حیثیت کی مالک ہوں۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ میرا اصل نام ہما خانم نہیں ہے۔ بلکہ میرا اصل نام بھجلا..... بھجلا ماہ روز..... مسٹر ماہ روز کے بارے میں تم نے کچھ سنا ہو یا نہ سنا ہو۔ وہ راج گڑھ میں بڑی با اثر شخصیت تھے۔ اور اپنی زندگی میں ہر شخص کے پسندیدہ رہے تھے۔ میں ان کی دوسری بیوہ ہوں۔ اپنی پہلی بیوی کی وفات کے طویل عرصے بعد انہوں نے مجھے سے شادی کی۔ یہ طویل عرصہ انہوں نے تنہائی میں گزارا اور ان کے نام کے ساتھ کوئی ایسی غلاظت شامل نہ ہوئی کہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے۔ یا ان پر انگشت بازی کرتے۔ مجھ سے ملاقات ایک مخصوص جگہ ہوئی تھی۔ جس کی پستی میں جانا غیر مناسب سی بات ہے۔ اور نہ یہ بات اس کام میں معاون ہو سکتی ہے۔

میرا خاندان بھی معززین میں شمار ہوتا ہے۔ میں بذات خود بھی اتنی چھوٹی شخصیت کی مالک نہیں ہوں کہ لوگ یہ سوچتے کہ مجھے اچانک ایک بڑی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جاگیر دار صاحب نے مجھ سے شادی کی اور ہم دونوں نے بہت ہی پرست زندگی گزاری ان کے دو بچے ہیں۔ ان میں ایک شاہ دل اور دوسری ان کی بیٹی امینہ ہے۔ سترہ سال کی عمر میں امینہ پر فاج کا حملہ ہوا اور وہ بیچاری دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئی۔ یہ صرف ڈیڑھ سال قبل کی بات ہے۔ اس کے علاوہ شاہ دل سادہ طبیعت اور مذہبی انسان ہے۔ اس کے مذہبی

امور میں کسی نے اس کے رجحان پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ خود ماہ روز اسے اسی لئے پسند کرتے تھے۔ کہ وہ ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔

دونوں بچے میرے لئے بھی ہمیشہ پسندیدہ رہے۔ اور میں نے بھی ان سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا حالانکہ امینہ سے حد بندی ہے اتنی حدی کہ بعض اوقات اس کی ضد اس کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے اور خاص طور سے ماہ روز کی موت کے بعد تو میں نے خاص طور سے ان کا خیال رکھا۔ اور اس کی ان بے جا ضدوں کو بھی گوارا کیا جو بعض اوقات ناقابل قبول ہوا کرتی ہیں رہا ہے چارہ شاہ دل تو وہ سیدھا سادہ ایک دل انسان ہے اس نے بھی کسی کیلئے درد سہنے کی کوشش نہیں کی اس لئے زندگی گزارنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں تھا سارے حالات مناسب طور سے چل رہے تھے لیکن پچھلے تین چار ماہ سے حالات میں کچھ گڑبڑ ہوئی زمینوں کے مگران پریشان ہیں ان کا کہنا ہے ہاریوں کو بہکا جا رہا ہے اور ان کو ہاریوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا جا رہا ہے اس کے علاوہ بھی بے ارم مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور میرے خیال سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں باقاعدہ ایک مشن کام کر رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسے تقریباً سات ماہ پیشتر یعنی جاگیر دار صاحب کی موت کے بعد تقریباً دو سال کے بعد منظم بنانے پر سوال اٹھایا گیا تھا۔ اور سوال یہ تھا کہ جاگیر کی مگرانی کیا مناسب طور پر ایک عورت کر سکتی ہے۔ سوال اٹھانے والوں میں ہمارے قرب و جوار کے بڑے بڑے چودھری تھے۔ جس وقت میرا پاس یہ سوال پہنچا تو میں نے ان سب کو طلب کیا اور پوچھا کہ ماہ روز صاحب کی موت کے بعد جاگیر کے امور میں کون سی مشکل پیش آ گئی ہے۔ جس کی بنا پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ خاتم جاگیر دار صاحب کی موت کے بعد ان کا حج وارت شاہ دل ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر یہ بات ہے اور شاہ دل یہ فتنہ

داری سنبھالنے پر تیار ہوں تو انہیں میں بہت ساری ذمہ داریاں سونپ سکتی ہوں۔ لیکن ابھی میں ان کو اس قابل نہیں پاتی کہ وہ پوری پوری ذمہ داریوں کے ساتھ جاگیر اور زمینوں کے امور چلا سکیں۔ اس کے علاوہ جاگیر دار صاحب کی وصیت یہ ہی تھی کہ میں ان بچوں کا خیال رکھوں۔ ابھی یہ اس قابل نہیں ہیں کہ فتنے داریوں کے بوجھ کو مناسب طریقے سے اٹھا سکیں۔

چنانچہ میں اپنی زمینوں کی اور اپنی دور رس پیملی ہوئی جائیداد کی خود مگرانی کر سکتی ہوں۔ جاگیر دار صاحب نے اپنی زندگی میں مجھے اس قابل کر دیا تھا کہ میں جاگیر کے تمام مسائل کو سمجھ سکوں۔ اور پھر ان کی وصیت کے مطابق مجھے تازہ زندگی یہ سارا نظام چلانا ہے۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے یہ سارے کام کر رہی تھی لیکن یہ نئی الجھنیں میرے لئے پریشان کن ہیں۔ میں نے انتہائی خلوص کے ساتھ یہ کوشش کی تھی کہ ان دونوں بچوں کے گفتگو کر دوں۔ ان سے پوچھوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ دونوں معصوم ہیں۔ اور یوں لگتا ہے۔ جیسے ان تمام معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کے بعد یہ احساس میرے لئے پریشان کن ہو گیا۔ کہ آخر وہ کون لوگ ہیں۔ جو میرے خلاف یہ فضاء پیدا کر رہے ہیں۔ ہما خانم نے چند لمحے توقف کیا۔ تو میں نے سوال کر ڈالا۔

”لیکن ایک بات بتائیے کیا آپ کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔“ اس سوال پر ہما خانم کے چہرے پر ایک بدلی ہوئی کیفیت نظر آئی۔ پھر اس نے سر داور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جاگیر دار صاحب سے میری شادی، میری پسند اور میری مرضی کی نہیں تھی۔ بلکہ ایک ذاتی مسئلے میں میرے والدین اس کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد البتہ ان سے میرا کوئی اختلاف نہیں رہا۔ لیکن میری اور ان کی عمر میں کافی فرق تھا۔“

”اولاد کی بات ادھوری رہ گئی۔“

”نہیں پوری ہو گئی ہے۔ میری کوئی اولاد

نہیں ہے۔“ ہما خانم نے جواب دیا اور میری کھوپڑی ایک لمحے کے لئے گھوم سی گئی۔ پھر میں نے کہا۔
”بہر حال آپ ان لوگوں کے خلاف تحفظ چاہتی ہیں۔ جو آپ کے خلاف یہ حالات پیدا کر رہے ہیں۔“

”جہاں تک تحفظ کی بات ہے تو میں خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔ میرے ارد گرد میرے محافظ پھیلے ہوئے ہیں اور خاص طور سے اس وقت سے وہ لوگ بڑے مستعد ہو گئے ہیں۔ جب سے میری رات کی تارکیوں میں ایک خواب گاہ کے نزدیک ایک مشتبہ شخص نظر آتا ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ لیکن وہ شخص اتنا پھر تپتا اور چالاک ہے کہ میرے محافظوں کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ وہ عمارت ہی میں کم ہو جاتا ہے۔ اور تم یہ بات جانتے ہو کہ سانپ کا آستین میں ہونا سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“

”آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ لیکن آپ یقیناً یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کے دشمن یقیناً آپ کی زندگی بھی لینا چاہتے ہیں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے کہ میرے خلاف سازش کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتی۔“

”مگر ایک بات اور بتائیے۔ اس سلسلے میں تو حکومت بھی آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ کیونکہ آپ اس وصیت کے مطابق اس تمام جائیداد کی واحد نگران اور وارث ہیں۔ اور چند روزے دار یوں کے علاوہ آپ پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں اپنے دشمنوں میں کس کا نام لوں۔ اگر بے گناہ لوگوں کو چھٹائی ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔ اور ممکن ہے اس کے باوجود بھی میری انجمنیں برقرار رہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان لوگوں کی نفرت کچھ اور بڑھ جائے گی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اصل دشمن کی شناخت ہو جائے۔ اور اس کے لئے ہی مجھے پروفیسر شیرازی سے رابطہ کرنا پڑا ہے۔“
میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر تک خاموش

رہا اور اس کے بعد میں نے کہا۔

”پروفیسر شیرازی نے مجھ پر اعتماد کر کے مجھے یہاں پر بھیجا ہے اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے بارے میں آپ پروفیسر شیرازی سے بات کر کے مجھے اس سلسلے میں متنبہ کر دیں۔“

”میں تمہیں ایسے ہی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ بلکہ تم باقاعدہ میرے یہاں کے کوئی عہدے دار ہو گے۔ یہ کام میں اس لئے کہہ رہی ہوں تاکہ تمہارے اختیارات وسیع تر ہوں۔“

”یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات آپ پروفیسر شیرازی سے طے کر لیں گیں۔“

”اس کے علاوہ تمہاری کوئی اور شرط۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ فی الحال کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ میں پروفیسر شیرازی سے کچھ باتیں ضرور کروں گا۔“

”ہاں یہ کام تو تمہیں کرنا ہی ہے۔ تاکہ میرے اور پروفیسر شیرازی کے درمیان دوسرے معاملات بھی طے ہو جائیں۔ اور کوئی ایسی بات جو تم کہنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اپنے خاص مشیر کی حیثیت سے دوسروں سے متعارف کراؤں گی۔ تاکہ تمہارا ایک مقام بن جائے اس کے علاوہ میں تمہاری رہائش کا بندوبست بھی کرائے دیتی ہوں۔ تاکہ تم اپنی اصل حیثیت سے سب کے سامنے آ سکو۔“ کافی دیر تک میرے اور اس کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ اور اسے بعد میں اس کے پاس سے باہر نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اور ناظم پاشا نے شمار ایسے اچھے ہوئے مسائل پر کام کر چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کے لئے ہم نے بڑے بڑے خطرناک کام سرانجام دیے تھے۔ لیکن یہ کام کم از کم میرے لئے بہت زیادہ باعث دلچسپی تھا۔ میں نے دل میں ایک اور فیصلہ بھی کیا تھا۔ یہاں پر کسی نے مہمان کا آنا کوئی اہم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مہمان خانہ کھلا ہوا تھا۔ تجلیلہ ماہ روز کے بارے میں مجھے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ

نہایت فراخ دل عورت ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ وہاں کیا کر رہی تھی۔ وہ معاملات بھی نہایت سراسر اترتے۔ جن سے میرا اور ناظم پاشا کا واسطہ پرچکا تھا۔ بہر حال وہ خود بھی ایک پُر اسرار اور باعمل عورت تھی وہ لوگ کون تھے جو وہاں اس کے ساتھ کا کر رہے تھے یہ ساری باتیں آہستہ آہستہ ہی سامنے آئیں گیں۔ ذہنی طور پر میں نے اس کام کو خوشی سے قبول کر لیا تھا لیکن دل میں یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ کسی بھی شکل میں یہی ناظم پاشا کو کم از کم اپنے مددگار کی حیثیت سے ضرور بلا لوں گا۔ اس کے بغیر جیسا کہ میں نے کہا کہ میں اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔ بے شک وہ میری ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوا تھا لیکن ہم دونوں کے درمیان کچھ ایسی کجگت ہوئی تھی۔ کہ اب اس کے بغیر میں کوئی کام خوشی سے کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد میرے لئے لازمی ہو گیا کہ میں اس عمارت کا بھرپور جائزہ لے لوں۔ میں نے اب ذرا دوسرے انداز میں یہاں کا جائزہ لیا۔ کسی بہرونی جگہ سے ہما خانم کی خواب گاہ پہنچنے کا براہ راست کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہر جگہ محافظوں سے مدد بھیڑ ہو جانے کا خطرہ رہتا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک ملازمہ کج اشارہ کیا اور وہ ہرے نزدیک آ گئی۔ میں اس سے کہا۔ ”شہزادہ شاہ لہ سے کہا ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں جناب۔“

”براہ کرم مجھے ان کا کمرہ بتا دو۔“ میں نے کہا ملازمہ نے ادب سے گردن جھکا دی۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے دور سے اشارہ کیا اور میں ان کا شکر یہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکل آیا۔ میں نے اس طرح اپنا رخ بدل لیا۔ جس طرح اس رخ متوجہ ہی نہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے ان سکے۔ یہ شخص جو باہر نکلا تھا پائیلٹ تھا اور اچھے لمبے چوڑے بدن کا مالک۔ کچھ دیر توقف کے میں نے شاہ دل کے کمرے کی طرف رخ کیا اور اس

کے دروازے پر دستک دی۔ ”تشریف لائیے۔“ اندر سے ایک آواز سنائی دی اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا لیکن اس کے اندر سجاوٹ معمولی تھی۔ ایک طرف تخت بچھا ہوا تھا۔ جس پر جائے نماز بچھی ہوئی تھی اور بیچ بھی رکھے ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر ایک نوجوان خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور یا آوا بلند سلام کیا۔ جس کا جواب دیکر میں آگے بڑھا اور میں نے کہا۔

”آپ کو تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں جناب۔“

”آئیے۔۔۔۔۔ آئیے تشریف رکھئے۔ میں آپ سے ناواقف ہوں۔“ جی ہاں۔۔۔۔۔ میں آپ کے نئے خادموں میں سے ایک ہوں۔ ہما خانم نے مجھے صرف دو روز پہلے ملازمت دی ہے۔“

”خوب۔ کیا عہدہ ہے آپ کا؟“

”اندرونی امور کا محافظ ہوں۔ یعنی کیرفیکر۔“
”یعنی یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آپ ہم خانم کے ذاتی محافظ ہیں۔“

”ایسی کوئی ذمہ داری انہوں نے میرے سپرد نہیں کی۔ لیکن ایسا ہے۔ ویسے معاف کیجئے گا۔ آپ کو کوئی اختلاف ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بنیادی اختلاف۔“ شاہ دل نے صاف لہجے میں کہا اور میں چونک پڑا۔

”آپ کے مرتبے کو مدد نگاہ رکھتے ہوئے مجھے یہ جرأت نہیں ہوتی۔ شہزادہ صاحب کہ میں آپ کے اس اختلاف کی وجہ پوچھوں لیکن یہ سوال میرے ذہن میں ضرور ابھرا ہے کہ وہ بنیادی اختلاف کیا ہے؟“

”تکلفات رہنے دیجئے۔ کل آپ کو یہ اختیار بھی مل سکتا ہے کہ آپ ہم سے قانونی طور پر رسالات کریں۔“

ہماری حیثیت ہی کیا لے۔ اس عمارت میں۔ صرف ہی کہ والد حضور کبھی ہیں بیٹا سمجھتے اور کہتے تھے۔ اب نہ ہم ان کا چھوڑا ہوا قرض ہیں۔ جو ہمیشہ دوسروں کیلئے بوجھ ہوتا ہے۔ بنیادی الکٹاف یہ ہے کہ انسان وہ بنیاد ختم کر

دے جو اختلاف کی وجہ بن جاتی ہے بہتر سلوک دشمن کو دوست بنا دیتا ہے۔ ہم تو ویسے بھی بے حیثیت لوگ ہیں۔“

”کیا ہما خانم کا سلوک آپ کے ساتھ اچھا نہیں ہے؟“

”جسے دشمن سمجھا جائے اس کے ساتھ سلوک میں فرق آتی جاتا ہے لیکن دشمن سمجھے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“

”کاش!..... میں جان سکتا..... کاش!.....“

”انسان ہمیشہ زندگی کے بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہے۔ وہ جو کچھ ہوتا ہے اس پر قانع نہیں رہتا۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ اس سے اس کی حیثیت چھین نہ جائے۔ حالانکہ موت کی پہلی کسی بھی وقت دم چھین لیتی ہے۔ ہما خانم کو خوف ہے کہ ہم دونوں بہن بھائی کسی نہ کی وقت ان سے یہ سب کچھ چھین لیں گے۔ چنانچہ وہ ہم سے ہماری زندگی اور آزادی چھین لینا چاہتی ہیں۔ میری بہن کے ساتھ۔ میری اپناج بہن کے ساتھ انکا جو رویہ ہے خدا کی قسم خدا ان سے اس کا حساب ضرور لے گا۔“

میں سناٹے میں آ گیا۔ یہ تو کوئی اور ہی کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جو مجھے آزمائش میں ڈال سکتی ہے۔ اگر ہما خانم کے ذہن میں یہ بات ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف ایک جال بن رہی ہوں ایک ایسا جال جس میں وہ دونوں پھنس جائیں۔ بہر حال یہ معاملات ابھی غور طلب تھے۔ میں تو ابتدائی اقدامات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شاہ دل سے گفتگو نے مجھے حیران ضرور کر دیا تھا۔

”بہر حال سب کے پاس ایک سہارا ہوتا ہے۔ اور وہ سہارا اللہ کا ہوتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ہماری ضرورت مدد کرے گا۔“

”میں شرمندہ ہوں جناب کہ میرے سوالات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے۔ میرے پہلے محدود ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس عظیم الشان عمارت کے اہم امور کی نگرانی کروں۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذمہ

داری میرے سپرد نہیں کی گئی۔ تاہم، شہزادہ کی حیثیت سے آپ بھی اس گھر کے سربراہوں میں سے ایک ہیں۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور موعظ دیجئے گا اور پھر اس حیثیت سے نہ کسی انسانیت کے رشتے سے میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔“

”شکریہ..... ہم خدا پر قناعت کرنے والوں میں سے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اگر ہم مجرم نہیں ہیں تو وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ شاہ دل نے کہا۔ کچھ دیر میں اس کے پاس رُک کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ لیکن ذہن میں بہت سے خیالات رقصاں تھے۔ پروفیسر شیرازی نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی۔ وہ ایک کاروباری اور کمرشل ذمہ داری تھی۔ لیکن باقی سارے معاملات کیلئے میں انسان بھی تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے اور پاشا نے ہمیشہ اپنا ایک موقف رکھا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ہم جرم کی دنیا سے متعلق ہو گئے تھے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم انسانوں کو نقصان پہنچاتے رہیں۔ پھر میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہما خانم کے برابر والے کمرے میں پہنچ گیا۔

یہ کمرہ میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ میرے اور ہما خانم کے کمرے کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ اس دیوار میں ایک بڑا روشندان تھا۔ جو بلندی پر ضرور تھا لیکن وہاں پر پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ یہ روشندان مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ بہر حال ابھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ شاہ دل سے ملاقات کر کے میں کافی الجھ گیا تھا۔ میں ان واقعات کو دہری نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پروفیسر شیرازی نے ہمارا خانم سے رابطہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اس کا معاوضہ مل رہا تھا۔ لیکن میں اور ناظم پاشا اپنی پسند اور اپنی مرضی کے قائل تھے۔ میں ان واقعات پر غور کرنے لگا۔ ہما خانم جاگیردار کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے دو بچے جو جوان تھے۔ لڑکی مفلوج اور بیٹا مولوی صفت۔ شاہ دل کا خیال تھا کہ ہما خانم ان دونوں کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔

تاکہ کسی وقت وہ اس کے لئے دوسرے بہن جائیں۔ اور وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ اس کے دشمن ہیں۔ بے شک یہ ایک دوراندیشی تھی۔ لیکن اس الزام میں تھوڑا سا مجھول تھا۔ مثلاً ہارپوں اور دوسرے لوگوں کی بغاوت، اگر یہ ہما خانم کی سازش ہوتی۔ تو وہ کم از کم اپنے خلاف بغاوت کی بنیاد نہ ڈالتی۔ کیونکہ یہ اسے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ نمبر دو یہ بات کہ پولیس افسروں کی امداد زیادہ موثر ہوتی۔ کیونکہ وہ انہیں مجرم قرار دے کر قانون کے حوالے کر سکتی تھی۔

کسی ایسے شخص کو اتنی بھاری رقم دے کر صرف یہ معلوم کرانے کی کوشش نہ کرتی کہ اس کا مجرم کون ہے اور پھر ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ وہ شخص جو شاہ دل کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ کوئی اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ شاہ دل اندر سے غلط ہے یا پھر ہما خانم۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاہ دل نے مجھے غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال بڑی محنت سے کام کرنا تھا۔ کافی دیر تک میں اس سلسلے میں غور و خوض کرتا رہا۔ اور پھر میں نے ایک پروگرام ترتیب دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بعض اوقات بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اس پروگرام کو ذہن میں ترتیب دیتا رہا اور آخر کار دوسری صبح میں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خاص طور سے ایک ملازمہ کو تاڑا۔ جو میرے کام کی ہو سکتی تھی۔ غالباً اسے میری ہی خدمت پر معمور کیا گیا تھا۔ پھر وہ آئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

”تمہارا نام کیا ہے بی بی۔“

”شری..... جناب“

”نام تو بہت ہی اچھا ہے۔“

”شکریہ سرکار۔“

”کیا سرکار..... بابا میں تمہاری طرح اس گھر کا ملازم ہوں۔ تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ مجھے یہاں نوکری مل گئی ہے۔“

”سرکار آپ کی نوکری تو بہت بڑی ہے۔ کہاں

ہم..... کہاں آپ۔“

”ایک بات ہوں..... برا تو نہیں مانو گی۔“

”نہیں سرکار۔“

”پھر سرکار..... مجھی میرا نام نادر ہے۔ تم مجھے

نادر کہہ لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔“

”ارے سرکار جان چلی جائے گی ہماری۔“

”تم یقین کرو..... تم ملازمہ تو لگتی ہی نہیں ہو۔

مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ تم کسی اچھے گھر کی لڑکی ہو اور

کچھ برے حالات کا شکار ہو کر یہاں نوکری کر رہی ہو۔“

میری ہر بات شریا کے دل کو لگ رہی تھی۔ اس نے آہستہ

سے کہا۔

”اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا سرکار۔ اللہ نے جو

جسے بنادیا..... بس۔“

”مجھے افسوس ہوا، شریا تم اتنی خوبصورت ہو کہ

میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“ میں نے کہا اور دوسری جانب

رُخ پھیر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے طرف

دیکھے گی اور یہ ہو۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی اور میں

نے پلٹ کر گردن ہلائی۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ آپ نے ہمیں

اس قابل سمجھا۔“ وہ بولی۔

”کتنے عرصے سے یہاں ہو؟“

”سرکار ہم تو بڑے ہی یہاں ہوئے ہیں۔“

اس کا مطلب ہے کہ تمہارے ماں باپ اور

دوسرے لوگ بھی یہاں ہی رہتے ہیں۔“

”جی سرکار ماں بچہ سب یہاں ہی رہتے ہیں جہاں

مالی کا کام کرتا ہے اور ہم یہاں رہتے ہیں جہاں

دوسرے نوکر رہتے ہیں۔ ہم بھی اس گھر کے چھوٹے

موٹے کام کرتے رہتے ہیں۔“

”شریادیکھو! امت ماننا میری بات کا۔ تمہیں

کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔ تم مجھے بڑی اچھی لگی

ہو۔ اور ہاں۔ کسی غلط بات کو اپنے ذہن میں جگہ مت

دینا۔ تمہارے اچھے لگنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں

کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں۔“

”سرکار آپ تو بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے

ہوئی نگاہوں سے پہلی بار مجھے اور پھر دروازے کو دیکھا۔
”آپ سے ملے آئے ہیں۔“ ایک ملازمہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ“ میں نے ان دونوں سے کہا۔ اور وہ دونوں ہچکچائی ہوئی باہر نکل گئیں۔ تب میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ایندھ کے سبب ہوئے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ اس پر شاید تشدد بھی ہوتا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی کرسی پیچھے کھسکا رہی تھی۔

”میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنے آیا ہوں، شہزادی ایندھ۔“
”کک..... کیسی معلومات؟“

”اصل میں یہاں میں کچھ کام کر رہا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہاں کس طرح کی تکلیف ہوئی ہے۔ آپ اطمینان رکھیے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ سے مکمل تحقیقات میرے ذمہ داری ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ہما خانم آپ کے ساتھ بہت سخت سلوک کرتی ہیں۔“

”نن..... سن نہیں..... وہ تو بہت اچھی ہیں۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”لیکن آپ کے بھائی شاہ دل نے آپ کے لئے یہ ہی سب کچھ کہا ہے۔“

”میں نہیں جانتی وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خانم کے مخالف ہی ہیں اور مجھے بھی پسند نہیں کرتے۔ مجھے وہ خانم کی نگاہوں سے گرانا چاہتے ہی۔ براہ کرم ان کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ میں نے کہا۔“

”اگر یہ بات ہے تو انہوں نے آپ کو دوسروں سے الگ تھلک کیوں رکھا ہے۔“

”مم..... مم..... میں خود لوگوں سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جب میں لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تو پھر لوگوں کا ساتھ کیوں حاصل کروں۔“ ایندھ کی آواز میں بے حد اداسی تھی۔

خونفاک کہانیاں 183 اپریل 2018ء

”اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جناب۔“ ایک بھورے رنگ کے آدمی نے جو بہت چست و جالاک تھا معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔

”مجھے نہیں معلوم ہے کہ میرا یہاں عہدہ کیا ہے۔ تم میرے ماتحتوں میں شمار ہوتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سرکار ہمیں اطلاع دے دی گئی ہے کہ یہاں کی نگرانی کے لئے نادر صاحب کو عہدہ دیا گیا ہے۔ مگر ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ایک دفعہ آپ کے اختیارات معلوم کر لیں۔“ اس نے جب سے موبائل فون نکالا اور کسی سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ حصہ بھی خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ یہاں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ دو ملازمین ایک حوض کے کنارے بیٹھیں تھیں۔

مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش تھے۔ میں نے اشارے سے انہیں اپنے قریب بلایا اور وہ دونوں میرے قریب پہنچ گئیں۔

”ایندھ صاحبہ کہاں ہیں؟“
”آرام کر رہی ہیں۔ لیکن آپ.....؟“
”میرا نام نادر سلطان ہے۔ شاید میرے بارے میں تم لوگوں کو کبھی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ میں ایندھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

”خانم سے اجازت لیتا ضروری ہے۔“
”تم لوگ جانتی ہو کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی شخص یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور پھر بولیں۔ ”آئیے“ وہ دونوں مجھے لیکر ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے اشارہ کیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

ایک لڑکی اپا بچوں والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔

اتنی حسین لڑکی کی نگاہ تک نہ ٹھہرے۔ چہرے پر ایسی مصیبت اور اداسی تھی کہ دل بے اختیار ڈولنے لگے۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی

”سرکار خانم جی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتیں۔“

”ایندھ کے ساتھ۔“

”ہاں“ اس نے کہا اور اچانک ہی خوفزدہ ہو گئی۔

”اللہ کے واسطے سرکار ہم سے ایسی باتیں نہ پوچھیں۔ جن سے ہماری زندگی خطرے میں پڑ جائے۔“

”دیکھو شریا میں نے تمہیں اچھا انسان سمجھ کر یہ سب باتیں پوچھی ہیں۔ اگر میں تمہیں اچھا نہ سمجھتا تو میں تم سے کوئی بات بھی نہ کرتا۔ کیا میں تمہارے خیال میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ جو باتیں میرے اور تمہارے درمیان ہو رہی ہیں۔ ہمیشہ میرے اور تمہارے درمیان ہی رہیں گی۔ اگر یہ محسوس کرو کہ میں نے کسی کو کچھ بتایا ہے تو آئندہ مجھ سے کبھی بات بھی نہ کرنا۔“

”نہیں سرکار۔ ہم تو آپ کی باندی ہیں۔“
”تو پھر مجھے بتاؤ کہ خانم ایندھ بی بی سے کیا سلوک کرتی ہیں۔“

”سرکار ایندھ بی بی تو قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی ہیں۔ اس حصے میں رہتی ہیں جہاں دوسرے لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ بے چاری معذور ہیں۔ کوئی بھی جشن ہو۔ ایندھ بی بی کو اس میں نہیں بلایا جاتا۔ کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں ہے انہیں۔ یہ

کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ معذور ہیں۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خانم جی انہیں مارتی تک ہیں۔“ شریا نے کہا اور گردن جھکا لی۔

اور میں پُر خیال انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ ہر قدم ایک نئی آنکھ سے دوچار کر رہا تھا۔ بہر حال شریا چلی گئی اور میں آئندہ اقدام کے بارے میں غور کرنے لگا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اب ایندھ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلے میں بھی میری مدد شریا نے ہی کی تھی۔ اور جب میں وہاں پہنچا تو ایک مخصوص جگہ مجھے روک دیا گیا۔

خونفاک کہانیاں 182 اپریل 2018ء

”ہیں۔ بڑی مہربانی ہے آپ کی۔“

”لو یہ رکھ لو.....“ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”نہیں سرکار۔ بس آپ نے ہم سے اتنی ہمدردی محبت سے بات کر لی۔ یہ ہمارے لئے بہت کافی ہے۔ پیسوں سے کیا ہوتا ہے۔“

”میں نے غلط تو نہیں کہا تھا ناں شریا کہ تم ایک اچھی انسان ہو۔ ویسے تم یقیناً وفادار ساتھی بھی ہو گی۔ میں تم سے ایک بات کہوں۔ آجکل خانم کچھ پریشان ہیں۔“

”ہاں..... سرکار ہم یہیں تو رہتے ہیں سارا دن۔ اور ہم خانم جی کی خدمت میں ہر وقت رہتے ہیں۔ بے شک وہ آجکل پریشان ہیں۔ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر ہم تو ایک غریب نوکر ہیں۔“
”پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ کیا شہزادہ شاہ دل کی مخالفت سے وہ پریشان ہیں۔“

”ہم تو نوکر ہیں سرکار..... ہمیں ان باتوں کا کیا معلوم..... ہمیں ان باتوں کا کیا پتہ..... ویسے شہزادہ صاحب بھی بڑے سیدھے سادھے آدمی ہیں۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ کوئی برائی دیکھی نہیں ہے ہم نے ان میں۔ ہماری طرف تو آج تک نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہر ایک سے نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔“

”اور وہ بی بی۔ کیا نام ہے ان کا۔“

”آپ ایندھ بی بی کی بات تو نہیں کر رہے سرکار۔“

”ہاں..... وہی۔“

”ارے سرکار ان کی تو بات ہی نہ کریں دیکھ کر آنسو آتے ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ وہ بھی لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی ماں پر مٹی ہیں اور ایک بات کہیں آپ سے سرکار، کہنے کو دل چاہتا ہے۔ آپ نے اتنی محبت سے بات کی ہے۔“

”کہو شریا..... میں نے کہا ناں کہ میں تمہیں بڑا اپنا اپنا سمجھتا ہوں۔“



تمہارے گھر میں تو ہوائی مخلوق کا ایک سونامی آیا ہوا ہے۔ یہ دیکھو ادھر بیٹھے ہیں کچھ ادھر تہماری کپڑوں والی الماری سے سر نکال کر نش رہے ہیں اور وہ ادھر ڈانٹنگ کر سبوں پر برا بھلا ہیں۔

گی۔ کرب و درد کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ ابھری اور اس کے ساتھ ہی کھٹی کھٹی آواز نکلی۔

”فرحان.....“

نجانے اس کی اس آواز میں کیا تھا، کہ دوسرے کمرے میں اسی فنکشن پر جانے کے لئے تیار ہونے والا ناٹی کی ٹاٹ لگاتا ہوا ادھر بھاگ آیا۔

”کیا ہوا صوفیہ.....“ اس نے ایک نظر اس کی طرف اور دوسری بیڈ پر بکھرے کپڑوں پر ڈالنے ہوئے پوچھا۔

”یہ دیکھو..... دیکھو ادھر..... یہ میرے سارے کپڑے کسی نے جلا ڈالے ہیں ذرا سوکھ کر دیکھو.....“

ایک چیخ ہی تو نکل گئی تھی اس کی..... بات تھی ہی اسکی..... اس نے حیرانی سے پورا اٹیچی الٹ دیا تھا..... اب وہ پاگلوں کی طرح کپڑوں کے ہر ایک جوڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے تین چار بہترین جوڑوں کے عین درمیان کرکٹ کی گیند جتنے سوراخ ہو چکے تھے سراسم کی کے عالم میں وہ ان کپڑوں کو کھولتی اور پھر بیڈ پر پھینک دیتی پھر اٹھا کر انکی سوختی، تازہ جلنے کی بدبو ان کپڑوں سے سک رہی تھی اس کے یہ کپڑے کم قیمتی تو نہ تھے مگر نقصان دہ پھر نقصان ہی ہوتا ہے اس کے دکھ اور کرب میں اضافہ ہو چلا تھا کہ اب وہ فنکشن میں کیا پنہن کر جائے

ہوں۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ میں دشمنوں میں گری ہوئی ہوں۔“

میں کوشش کر رہا ہوں کہ جلد از جلد آپ کے دشمنوں کو بے نقاب کر دوں۔ میں نے آج شاہ دل صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔“

”شاہ دل بالکل بے ضرر ہے۔ خاموش طبیعت انسان۔ زیادہ تر الجھا ہوا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ہمیں اپنے لئے نقصان دہ سمجھتا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ کچھ دوسرے لوگ اسے اکسارے ہوں۔ انسان بہت کمزور چیز ہوتا ہے۔ کون جانے کون کب بدل جائے اور کیا سوچنے لگے۔“

”میں اپنی جلدی تو اس عمارت کے اس ماحول سے واقف نہیں ہو سکتا۔ آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں شاہ دل پر شبہ نہیں کرتی۔ لیکن تم جو بھی مجھ سے پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو۔ تم نے اس سے ملاقات کی تھی۔“

”ہاں۔ مجھے بھی وہ ایک سیدھا سادھا انسان معلوم ہوا۔ اس سے آپ کے بارے میں کافی بات چیت کی اسنے آپ کے خلاف کوئی بات نہیں کی البتہ ایک بات کا اظہار ضرور کیا؟“

”کیا.....؟“ خانم نے پوچھا۔

”اس کا خیال ہے کہ آپ کا سلوک امینہ کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے غور سے خانم کی شکل دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر غمناک تاثر پھیل گیا۔

”ممکن ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں ڈال دی گئی ہو۔ حالانکہ اس بچی سے مجھے جتنی ہمدردی ہے۔ میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میں نے اس کی بیماری کا علاج کرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر مفلوج ہو چکی ہے۔ حالانکہ اس کی شریانوں میں خون کی گردش رواں ہے اور پھر میں نہیں جانتی کہ شاہ دل مجھے اس کا دشمن کیوں سمجھتا ہے۔“ (جاری ہے)

آپ کا علاج کیوں نہیں کرایا گیا۔“

”بہت کرایا گیا ہے۔ مگر قدرت کو منظور نہیں ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں۔ میری ٹانگیں ٹھیک ہیں۔ مگر میں کیا کروں میں نفسیاتی بیمار ہوں۔ میں کمزوری نہیں ہو سکتی۔“

”یہ آپ کے ماتھے پر چوٹ کیسے لگی ہے۔“

”کرسی سے گر پڑی ہوں۔ اکثر کرتی رہتی ہوں۔ بس اسی لئے میں لوگوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتی ہوں۔“

”تو آپ کو ہما خانم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”ہاں..... مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ بھائی جان کو اس طرح کی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ پتہ نہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر میں امینہ سے بات کرتا رہا۔ اس کے بعد میں اس کے پاس اٹھ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا کہ تیسرا کردار بھی کافی الجھا ہوا ہے اور پھر میں دینی طور پر خاصا الجھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کو ایک اور ملازمہ نے مجھے خانم کی طرف سے دعوت دی۔

”وہ کھانے کی کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ کھانے کی میز پر ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ خانم نے گردن ہلا کر مجھے خوش آمدید کہا تھا۔

”تم بہت جامد زیب انسان ہو۔ ہر لباس میں شاندار نظر آتے ہو۔ میں کل دیر تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔ شخصیت کو ستوارہ ضرور جاتا ہے۔ قدرتی جاذبیت کا بھی ایک الگ مقام ہوتا ہے۔“

”شکریہ خانم“ میں نے گردن تم کر کے کہا۔

”اچھا چھوڑو..... تم یہ بتاؤ کہ تم نے کوئی کام کیا۔“

”جی“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں..... اتنا مختصر جواب نہ دو۔ میں اس سلسلے میں کتنی بے چین ہوں تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔ میرے لئے یہ تمام جاگیر کی ذمہ داریاں سنبھالنا ایک مشکل کام ہے۔ میں اپنے لئے امن کی فضا کی طالب

ایسا لگتا ہے جیسے انہیں ابھی ابھی کسی نے جلایا ہو۔۔۔۔۔ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی ہے جو مسلسل مجھ پر جادو کر رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے اور۔۔۔۔۔ تم اسے آج تک میرا وہم بتاتے رہے ہو۔۔۔۔۔ اب مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔ کہ میں کیا پاؤں کر جاؤں گی۔۔۔۔۔ مجھے خوف آنے لگا ہے۔۔۔۔۔ وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔

”حوصلہ کرو۔۔۔۔۔ حوصلہ۔۔۔۔۔ تم اب کوئی اور کپڑے پہن لو۔۔۔۔۔ ایک سے ایک بڑھیلے سوٹ رکھے ہیں تمہارے پاس۔“ فرحان نے فکرمند ہوتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

”مگر اس کا کیا ہوگا۔۔۔۔۔ ابھی کچھ روز پہلے میں نے کپڑے دھو کر چھت پر ڈالے تو کیلے کپڑوں کو آگ لگ گئی تھی وہ تو مجھے جلد پہن چلا گیا تھا ورنہ سب آگ میں جل جاتے۔“ صوفیہ نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے صبح ہونے پر کچھ کرتے ہیں مگر اب تو تم تیار ہو جاؤ۔“

”لیکن اب تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ میں اس گھر میں مزید نہیں رہنا چاہتی۔۔۔۔۔ غضب خدا کا۔۔۔۔۔ یہ ساری واردات صرف میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہی ہے۔ کیا دوسرے اس گھر میں موجود نہیں ہیں۔“

”تو کیا تم بھی ہو کہ کوئی گھر کا فرد ہے۔۔۔۔۔ جو تمہارے ساتھ یہ شرارت کر رہا ہے۔“ فرحان نے ٹائی کی گرہ درست بیٹھائی۔

”لگتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ گھر میں ایسا کوئی ہے جسے میرے ساتھ دشمنی ہے۔“ صوفیہ نے غصے اور کرب کے ملے جلے تاثرات میں جواب دیا۔

”معیبیت یہی ہے جو انٹیلی جنس میں کسی کو دوشی بھی تو نہیں قرار دیا جاسکتا کس پر انکی انٹیلی جنس کس پر الزام دھرو گی۔“ فرحان جو مشترکہ خاندانی نظام کو بچاتا آ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ دادا کی اس جائیداد کا کسی طور پر بٹاؤ ہو۔ وہ ایک اچھی فرم میں بہترین پوسٹ پر کام کرتا تھا اور اس کی تنخواہ اس قدر تھی

کہ اپنے اخراجات کے علاوہ نہ صرف وہ بہت کچھ بچا لیتا تھا بلکہ اس سے گھر کے دوسرے افراد کی ضروریات پر بھی خرچ کر ڈالتا تھا۔

وہ تین بھائی تھے اور سب کی شادیاں اس کے والدین کی زندگی میں ہی ہو چکی تھیں فرحان سب سے بڑا تھا گھر میں اس قدر گنجائش تو موجود تھی کہ وہ سب اپنی اپنی ٹیبل کے ساتھ آسانی سے رہ سکتے تھے مگر باوجود اس کے کہ اس کے دوسرے بھائی اس قدر نہ کماتے تھے پھر بھی وہ اپنی موروثی جائیداد کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ اور ان کی نظریں فرحان کی دولت پر تھی یا منتظر تھے کہ وہ اس مکان کو بیچ کر انہیں حصہ دے دے۔ یا پھر اس مکان کو خود رکھ کر انہیں کہیں دوسرا مکان لے دے۔ مگر فرحان ابھی اتنی ہمت نہ کر پا رہا تھا۔ اس لئے وہ خاموش تھا مگر عورتیں اور زیادہ برتن اکٹھے ہوں تو وہ کھٹکتے رہتے ہیں اور عورتیں ایک دوسرے سے بات بہ بات جھگڑتی راتی ہیں۔

اس لئے صوفیہ کو بھی اس بات پر یقین ہو چلا تھا کہ اسے تنگ کرنے کے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور کپڑوں کو جلانے کی واردات میں بھی انکی لوگوں کا ہاتھ ہے جبکہ فرحان اس پر یقین نہ رکھتا تھا۔

آج رات بھی جب وہ کسی فنکشن پر جانے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ تب صوفیہ پر اس بات کا انکشاف ہوا اس کے کپڑوں کے عین درمیان کرکٹ کی گیند جتنی جگہ جلی ہوئی تھی تب ہی تو اس نے شو بچا دیا تھا۔

فرحان نے اسے مطمئن تو کر دیا مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس بات کا کس طرح کوئی لگا جائے کہ اس سارے حادثے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

جیسے جیسے وہ فنکشن تو بھٹک آئے مگر واپسی پر بھی صوفیہ کے ذہن کی سوئی وہیں انکی ہوئی تھی۔

”فرحان۔۔۔۔۔ میں نے پہلے واقعہ کے بعد کیا سے اس کی کوئی لگانے کی کوشش کی تھی اپنی ایک

کے ہمراہ میں فوری بابا کے پاس گئی تھی بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے اس نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ گھر ہی کا کوئی فرد ہے جو شرارت کر رہا ہے مجھے تو یہ تمہاری بھابھی فریدہ کا کیا دھرا لگتا ہے بڑے جادوگر اس کے قبضہ میں ہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا اب بہت تھکاؤٹ ہے سو رہا ہوں۔“ فرحان نے صوفیہ کی بات کانٹے ہوئے کہا اور سو رہا۔

اب تو یہ روزانہ کا معمول بن گیا تھا فرحان جب بھی ڈیوٹی سے واپس آتا تو روز کوئی نہ کوئی نئی بات سننے کو ملتی۔ فرحان کی تشویش بھی بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا تھا کہ وہ کسی عامل سے مل سکے اپنے ایک دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے اپنے طور پر اس کا حل بتایا بلکہ رشید اس کا دوست اور اس کے دفتر میں کام کرنے والا ساتھی تھا۔

وہ اسے ایک بزرگ کے پاس لے گیا تھا یہ ایک تنگ و تاریک کوٹری تھی بڑی ہی گندی جگہ جہاں ایک ہی چارپائی چھپی تھی اور اس کے پیچھے کسی گندی تالی سے نکل کر آیا ہوا پانی سے شرابور کتا بیٹھا تھا کمرے کے ایک کونے میں لوہے کے اسٹینڈ پر رکھا میلا پھیلا مٹکا رکھا تھا۔

بابا نیچے فرش پر کچھو کی چٹائی بچھائے بیٹھا جس کے سونے لگا رہا تھا فرحان کو بڑی کراہیت سی محسوس ہوئی مگر اس کے ساتھی رشید نے اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا۔

انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر بابا نے اپنی بڑی بڑی غلائی لیکن نشتے سے بو جھل اٹھیں انہیں ان کی طرف دیکھا وہ دونوں خاموشی سے اس کے قریب بیٹھ گئے۔

”کیوں آئے ہو۔۔۔۔۔؟“ نشتے سے بو جھل آواز نے پوچھا۔

”باباجی۔۔۔۔۔ یہ میرے دوست فرحان ہیں ان کے گھر میں کچھ عرصہ سے بڑا نقصان ہو رہا ہے کچھ

کپڑے جل جاتے ہیں کبھی گھر کا دوسرا نقصان ہو جاتا ہے بڑے پریشان ہیں۔“ رشید نے تعارف کرایا۔

”اگلے روز تو کمال ہی ہو گیا۔۔۔۔۔ میں نے دفتر سے تنخواہ لی تو عید قریب ہونے کی وجہ سے آفس والوں نے دس دس کے نوٹوں کی نئی گڈی دے دی۔ جب میں گھر آیا تو میری بیگم باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھی اس نے دوسرے پیسے پکڑ کر اپنی جیبی پرس میں ڈال لئے مگر نئے نوٹوں کی گڈی قریب ہی رکھ لی۔ میں بھی ادھر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد بیگم بولی۔

”فرحان۔۔۔۔۔ نئے نوٹوں کی گڈی تم نے اٹھائی۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔“ میں نے اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”کہاں رکھ دی میں نے۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ارد گرد تمام جگہ دیکھ ڈالی مگر نوٹوں کی گڈی کا نہ ملنا تھا اور نہ ملی۔

”مذاق نہ کرو فرحان۔۔۔۔۔“ اس نے رنج ہو کر کہا۔

”سچ کہہ رہا ہوں جانی۔۔۔۔۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مذاق کرنے کی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”ابھی میں نے تمہارے سامنے یہاں رکھی تھی۔“ اس نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

تب مجھے بھی حیرانی ہوئی۔۔۔۔۔ مگر گڈی کہیں نہ ملی۔ فرحان نے بابا کو بتایا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ بابا نے خمیر لہجے میں جواب دیا۔ اور پھر چوکیا چراغ کو سامنے رکھ کر اس کی بیٹیوں کو جلایا اور خود اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اس کے قریب رکھے تانبے کے گھڑے پر سوئیوں سے ساز بجانا شروع کر دیا سادگی کے جیسے تیز ہوتی جا رہی تھی اس کا جاپ بھی اتنا ہی تیز ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دونوں خاموشی کے ساتھ اس کے سامنے دم سادھے اس کا تماشا دیکھ رہے تھے چند لمحوں

بعد چار پائی کے نیچے بیٹھا کتا رونے کے انداز میں چیخ اٹھا۔

”ہاں..... تو آگئے ہو..... دیکھو اس بالک کو کیا تکلیف ہے بہت مصیبت میں ہے اس کی پریشانی کیا ہے.....“ اس نے ایک ان دیکھی قوت سے سوال کیا۔

”کیا کہا..... کسی گھروالے کی شرارت ہے..... جادو کا اثر ہے..... کون کرتا ہے تعویذ.....“ ایک بار پھر پوچھا گیا۔

”ہوں..... ایک عورت اور ایک مرد..... دونوں ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“

”کہاں سے یہ سب کرواتے ہیں..... دوبارہ سوال کیا گیا۔

”نہم پاروالے بابا سے..... اس کا تو ذکر کرو..... یہ سب علم کے زور سے ہو رہا ہے تو اس گورو کو.....“ بابے نے تذکرہ کی سفارش کی۔

”کچھ دیر کے بعد وہ پھر سے بولا۔

”ہوں..... کر دیا اوپائے..... دوبارہ نقصان تو نہ ہوگا..... دیکھو اگر ان پر کیا ہوا جادو ختم کرنا ہو تو.....“ اس نے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں تعویذ تو میں دے رہا ہوں..... اس سے فائدہ ہو جائے گا..... ٹھیک ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے ساز بجانا اور پڑھنا بند کر دیا اب وہ براہ راست ان سے مخاطب تھا۔

”سن لیا آپ نے بڑا سخت عمل کرا رکھا ہے تمہارے گھر کی ایک عورت ہے اور اس کے ساتھ ایک مرد..... دونوں سے تم بڑی محبت کرتے ہو۔ مگر ان کی نظریں تمہاری دولت پر لگی ہوئی ہیں وہ تمہیں برباد کر دیتا چاہتی ہے حد کرتی ہے تمہاری امارت سے جلتی ہے تمہارے رہن سہن کے انداز سے یہ تعویذ لے لو..... اور اسے قبرستان میں کسی پرانی قبر میں دبا دینا بہتر ہو جائے گا۔“

شک وشبہ اور دوسوے کی چار اوڑھ سے وہ اور اس

کا ساتھی رشید باہر نکلے تو ایک بھاری رقم فرحان کی جیب سے نکل کر بابے کی مٹھی میں جا چکی تھی اور اس کی مٹھی میں ایک تعویذ آ گیا تھا جسے وہ کسی پرانی قبر میں دفن کرنے کا سوچ رہا تھا۔

”اسے کسی قبرستان میں جا کر پرانی قبر میں دبا دینا۔“ رشید بولا۔

”یار میں نے بھی یہ کام نہیں کیا..... تم چلو ناں میرے ساتھ۔“ فرحان کا خوف باہر نکلا تو رشید ہنس دیا۔

”اچھا یار چلو..... تم بھی کیا یاد کھو گے۔“ وہ دونوں ایک قبرستان میں آگئے گرمیوں کی سائیں سائیں کرنی دوپہر وہ پرانی قبر ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ ایک قبر سے انہیں کسی مردے کی کھوپڑی نظر آئی فرحان نے آگے چلتے ہوئے رشید کے کندھے کو زور سے پکڑ لیا۔

”کیا ہوا؟“ رشید نے رک کر پوچھا۔

”وہ دیکھ رہے ہو..... قبر سے مردے کی کھوپڑی ہمیں دیکھ رہی ہے۔“ فرحان نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

”بہت ڈر پوک ہو..... کسی کہتے یا دوسرے جانور کا کارنامہ ہوگا۔ چلو آگے آؤ.....“ رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

پھر ایک پرانی سی قبر کے پاس جا کر وہ رک گئے۔ ایک بڑا سوراخ اس قبر کے پہلو میں نکلا ہوا تھوچے کہیں دور تک جا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے.....“ فرحان نے ڈرے لہجے میں پھر سے پوچھا۔

”جو ہوں کی کارگیری ہے.....“ رشید نے اسے گھیسٹ لیا اور پھر تھوڑی سی جگہ کی نوکیلے پتھر سے کھود کر اس میں تعویذ دبا دیا اور باہر آگئے۔

لیکن اس کے گھر میں رونما ہونے والے واقعات ختم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی بیوی کا شک بڑھتا چلا گیا اور اب وہ خود ان چکروں

میں بڑچکا تھا کہ جو نئی اسے وقت ملتا اور جہاں اسے کسی بچپنے بزرگ یا بابے کا پتہ چلتا وہ وہاں پہنچ جاتا۔

اب اس کی بھابیوں اور اس کی بیوی کے درمیان اس بات پر جھڑپیں بھی ہونے لگیں تھیں عمران اس کے چھوٹے بھائی کی بیوی رضیہ بڑی منہ پھٹ گئی اس نے تو باتوں باتوں میں ایک بار نہیں کئی بار یہ کہا تھا۔

”جن کے پاس زیادہ دولت ہوگی وافر چیزیں ہوں گی وہی کم ہوں گے چوری چکاری بھی تو انہی کی ہوگی نہ ہمارے پاس فالو دولت ہے اور نہ ضرورت سے بڑھ کر چیزیں۔“

رات کو گھر آئے فرحان کو صوفیہ نے یہ بات بتائی تو وہ بے جا رگی سے ہنس دیا۔

”صوفیہ بات تو اس کی بھی ٹھیک ہے۔“ فرحان بولا۔

”لو اور سنو..... برسوں جو تم نے اپنے لاڈلے جنید کو ریل گاڑی کا کھلونا لا کر دیا تھا وہ جو بیٹری سیل سے چلتا تھا وہ اس سے چھت پر کھیل رہا تھا..... اور میں نیچے کام میں مصروف تھی کسی کام سے اوپر چھت ہو گئی تو جنید گرمیوں کی اس سخت دھوپ میں وہ اکیلا چھت پر بیٹھا اس کے ساتھ کھیل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی کئے جا رہا تھا۔“

”جنید..... میں نے آواز دی۔ تو وہ ایک طرح سے چونک اٹھا۔

”جی ماما.....“ ڈرے لہجے میں وہ بولا۔

”کس سے باتیں کر رہے ہو۔ اور کس کے ساتھ کھیل رہے ہو۔“

”وہ میں..... اپنے دوست کے ساتھ۔“

”کہاں ہے..... مجھے تو یہاں تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آ رہا۔“

”یہ تو بیٹھا ہے میرے ساتھ۔“ جنید نے اشارہ کیا اور پھر بڑبڑایا۔

”اچھا ماما ہمیں پریشان نہ کرو..... ورنہ میرا دوست بھاگ جائے گا اور پھر میں کس کے ساتھ کھیلوں

نایاب فراری اپنے بیڈروم میں چھپا دی

امریکہ میں ایک شخص نے اپنی 1969ء ماڈل کی نایاب فراری کار کو محفوظ کرنے کا انوکھا طریقہ استعمال کرتے ہوئے اسے اپنے اپارٹمنٹ کے ایک بیڈروم میں کھڑا کر دیا اور تیس سال بعد اس نے اپنی اس کار کا انکشاف کیا ہے بتایا گیا ہے لاس انجلس کے رہائشی شخص جس نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا ہے کہ اس نے 1959ء ماڈل کی فراری کار 1975ء میں کسی سے خریدی اور اٹھ سال تک اسے چلاتا رہا پھر اسے اپنے اپارٹمنٹ کے ایک بیڈروم میں کھڑا کر دیا تاکہ وہ محفوظ رہ سکے اور اب وہ اسے فروخت کرنا چاہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس کی یہ کار 7 لاکھ 50 ہزار ڈالر میں فروخت ہو سکتی ہے کیونکہ وہاں برس اسی طرح کی ایک گاڑی بیس میں 7 لاکھ 15 ہزار ڈالر میں بک چکی ہے۔

(محبت علی - دریاحان)

گا.....“ جنید نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....“ میں نے تلخی سے ڈرے انداز میں کہا۔

”اچھا دوست..... کل ملیں گے..... اوکے بابے.....“ یہ کہہ کر جنید نے الوداعی انداز میں ہاتھ کا اشارہ کیا اور میرے ساتھ نیچے آ گیا۔

”اور وہ تمہارا کھلونا کدھر ہے.....“ میں نے اسے زبردستی کھینچے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو میں نے اپنے دوست کو دے دیا ہے۔“ جنید نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے ہاتھ واقعی خالی تھے اور کھلونا بھی کہیں موجود نہ تھا۔ فرحان خدا کے لئے کچھ کرو..... ورنہ ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔“ صوفیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”کہاں ہے جنید.....“ فرحان نے تشویش
 بھرے لہجے میں پوچھا۔
 ”سوچا ہے.....“ فرحان میں بہت پریشان
 ہوں..... خدا کے لئے کچھ تو کرو۔“
 ”بڑی عجیب بات ہے کہیں یہ ساری شرارتیں
 وہی لوگ تو نہیں کرتے جن کا الزام ہم دوسروں پر
 لگاتے ہیں۔“ فرحان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
 ”میں نہیں جانتی..... مگر مجھے جنید کی طرف سے
 بڑی فکر ہو رہی ہے۔“ صوفی نے فکر مند لہجے میں بتایا۔
 ”یہ اس کے لئے ایک نئی بات تھی ساری رات
 وہ سوچتا رہا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے اس کے
 تدارک کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا بہت ضروری تھا۔
 اگلے روز اتوار تھا اس لئے اسے آفس سے چھٹی
 تھی اس نے جنید کو بلا کر پوچھا جنید نے اسے بات کی
 تصدیق کی کہ وہ ٹھیک نامی جن کے ساتھ کھیلا ہے۔
 ہوئی۔“ فرحان نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”ہاں..... میں اور میرے دوست اکثر اسکول
 کے لان میں لگے درختوں کے قریب خالی بیڑی میں
 کھیلتے ہیں ایک دن اتفاق سے کوئی دوست ادھر نہیں آیا
 تو میں اکیلا ان درختوں کے پاس پہنچ گیا پہلے تو وہ جگہ
 خالی تھی مگر اچانک وہاں میرا ہم عمر ایک اور لڑکا مجھے
 نظر آیا میں نے سمجھا قریمی آبادی کا کوئی لڑکا ہوگا وہ
 میرے قریب آکر بولا۔“
 ”دوستی کرو گے.....“ اس نے اپنا ہاتھ آگے
 بڑھایا۔
 ”مجھے وہ اچھا لگا چنانچہ میں نے بھی اس کے
 ہاتھ پر اپنا توڑکھ دیا اور اپنا تعارف کرایا اس نے میرے
 تعارف کروانے پر اپنا نام ٹھیک بتایا اور اپنی رہائش
 قریمی آبادی بتائی یہ اسی وقت سے میرا دوست ہے
 اور میری اجازت سے ہی میرے گھر آنے لگا ہے
 آہستہ آہستہ جب ہماری دوستی کچی ہو گئی تو اس نے
 اپنا اصل نام بتایا کہ اس کا تعلق انسانوں سے نہیں لیکن

مجھے اس سے کیا غرض..... وہ میرا دوست تھا.....
 اور میں جب بھی اکیلا ہوتا ہوں تو وہ میرے ساتھ کھیلنے
 آ جاتا ہے چونکہ اس کا نام مشکل تھا اس لئے میں اسے
 یاسین کہتا ہوں.....“ یہ عجیب و غریب کہانی سن کر ایک
 بار تو فرحان پر کچھ سی طاری ہوئی۔
 ”تو کیا تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا۔“
 ”کیوں ڈر کر بات کا..... وہ میرا دوست ہے
 ہم ایک دوسرے کے ساتھ تجھے تحائف بھی تبدیل
 کرتے رہتے ہیں وہ جو ریل گاڑی کا کھلونا آپ نے
 لا کر دیا تھا اسے پسند آ گیا میں نے اسے دے
 دیا ہے۔“ جنید نے ایسے کہا جیسے اس کے لئے یہ بات
 کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔
 ”مگر پھر بھی جتنا..... وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائے
 مجھے ڈر لگتا ہے۔“ فرحان نے ڈرے ہوئے لہجے میں
 کہا۔
 ”اس پر جنید نے دیا بات آئی مٹی ہو گئی ان ہی
 دنوں کی بات ہے فرحان ڈیوٹی سے واپس لوٹا تو صوفیہ
 کا مزاج پہلے سے کچھ بدلا بدلا سا تھا رات کھانے
 پر اس نے فرحان کو بتایا۔
 ”آج خالدہ ایذا کی تھیں۔“
 ”کون خالدہ امینہ؟“ فرحان نے استفسار کیا۔
 ”ارے تم نہیں جانتے..... وہ ادھر کچھلی گلیوں
 میں رہتی ہیں بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہو کر اپنے
 والدین کے گھر آ گئی تھیں والدین فوت ہوئے
 تو ایک بزرگ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ
 بزرگ بھی وفات پا گئے مگر کچھوں کو قرآن پڑھانی
 ہیں آج وہ آئیں تو آتے ہی حیرانی سے کہنے لگیں۔
 ”ارے بیٹی..... اپنے گھر کی طرف دھیان
 دو۔“
 ”خالدہ کیا بات ہوئی گھر گزرتی تو مجھے لے بیٹھی
 ہے اور تم کہہ رہی ہو گھر کی طرف دھیان دوں۔“ میں
 نے حیرانی سے جواب دیا تو وہ ہنس کر بولیں۔
 ”ارے نہیں میں یہ نہیں کہتی..... میرا مطلب

کچھ اور ہے تمہارے گھر میں تو ہوائی مخلوق کا ایک
 سونا میا ہوا ہے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”میں کچھ بھی نہیں.....“ میں نے حیرانی سے
 پوچھا۔
 ”کیا تمہارے گھر میں نقصان نہیں ہوتا..... میرا
 مطلب ہے اشیاء گم نہیں ہوتیں روپے پیسے کا نقصان
 نہیں ہوتا.....“ انہوں نے استفسار کیا۔
 ”بہت ہوتا ہے.....“ میں نے ان کی باتوں میں
 دلچسپی لی۔
 ”بہت زیادہ ہوتا ہے..... یہ دیکھو ادھر بیٹھے ہیں
 کچھ ادھر تمہاری کپڑوں والی الماری سے سر نکال کر ہنس
 رہے ہیں اور وہ ادھر ڈانٹنگ کر سیوں پر برا بھلاں ہیں
 اور کچھ ادھر صحن اور دوسرے کمروں میں دھناتے
 پھر رہے ہیں۔“ اس نے اس طرح سے کنشری کی کہ
 ایک بار تو میرا دل دھل گیا۔
 ”خالدہ اس کا کچھ کرو..... تم ہی کچھ کرو..... ہم
 تو بے حد تنگ آ چکے ہیں۔“ میں نے کچھ حوصلہ پاتے
 ہوئے جواب دیا۔
 ”اے لڑکی..... میں صرف دیکھ سکتی ہوں.....
 میں کوئی عامل تھوڑی ہوں جوان کو بھگا دوں کسی عامل
 سے رابطہ کرو..... جی میں تو ان کی تمہارے گھر میں
 یلغار دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں..... ہوائی مخلوق کا
 سونا میا لگ رہا ہے تمہارے گھر میں.....“ یہ کہہ کر انہوں
 نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔
 ”وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں..... مگر میں اسی
 وقت سے پریشان ہوں۔“
 ”ہوں..... مجھے بھی ایسا ہی لگتا تھا مگر تمہارے
 غصے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا..... میں نے اپنے
 ایک دوستا قیوں سے کہہ رکھا ہے شاید وہ اس بارے
 میں کچھ کر پائیں میرے ایک دوست کے جاننے والے
 سندھ میں رہتے ہیں ان سے رابطہ بھی ہوا ہے
 ہو سکتا ہے وہ چند روز تک آجائیں۔“
 اس رات فرحان کورات میں بھی ایسی مخلوق

دکھائی دی وہ کبھی اسے ڈراتے اور کبھی مختلف روپ
 دھار کر اسے تنگ کرتے وہ ساری رات نہ ہو سکا تھا صبح
 اٹھ کر اس نے اس کا ذکر صوفیہ سے تو نہ کیا البتہ وہ
 اندر ہی اندر سے خوف زدہ ضرور رہا۔
 اس نے دفتر میں اپنے اس ساتھی سے بھی اس
 بات کا ذکر کیا تو اس نے اسے تسلی دی کہ وہ یوم
 آزادی کی تعطیل میں ادھر آیا ہے۔
 14 اگست کا دن آنے میں دو روز باقی تھے۔
 اوریہ وقت صوفیہ اور فرحان دونوں کے لئے
 گزارنا بہت مشکل ہو رہا تھا پھر وہ لمحہ بھی آن
 پہنچا۔ تعطیل کی وجہ سے وہ گھر میں موجود تھا جب اس
 کے ساتھی مشتاق نے اسے موبائل پر کال کر کے بتایا کہ
 سندھ سے آنے والا عامل اس کے پاس پہنچ گیا ہے
 اسے وہ لے کر کب آئے۔
 ”میں گھر پر ہی ہوں تم اسے لے آؤ۔“ فرحان
 نے جوابا کہا۔
 ”دوپہر کا وقت تھا..... جب مشتاق اسے لے
 کر آ گیا..... فرحان نے اسے بیٹھک میں بیٹھایا
 اور صوفیہ کے ساتھ فرحان بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔
 آنے والا تقریباً 25/30 سالہ نوجوان تھا۔
 ”یہ منزل ہیں سندھ میں رہتے ہیں انہیں میں
 نے تمہارے گھر کے سارے حالات بتائے
 ہیں۔“ مشتاق نے تمہید باندھی۔
 ”کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔“ منزل نے
 پوچھا۔
 ”کئی ماہ سے..... بہت سے لوگوں کو دکھایا
 مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی..... کے مصداق
 افادہ نہیں ہوا۔“ فرحان نے رک رک کر بتایا۔
 ”ہوں..... اصل میں..... میرا علم اس کی کاٹ
 ضرورت کر دے گا مگر میرے ساتھ المیہ یہ ہے کہ میں
 اس مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا..... اس
 کے لئے مجھے ایسے شخص کی یا سچے بچی کی ضرورت ہوگی
 جو حضرات میں میری مدد کر سکے۔“ منزل نے

شیطانی عمل

ایس اتیاز احمد - کراچی



ایک بار اس کی محبت کی عزت کو پامال کیا تو کیا دوسری بار وہ خود اپنی محبت کو رسوا کر دے۔
فیصلہ کر کے وہ دوبارہ خالہ کے پاس آیا۔ ”خالہ میں کل رابعہ سے نکاح کر لوں گا۔“

سیح صاحب کرن کی طرح چمکتے اور آن واحد میں مایوسی کے اندھیرے چھٹ جاتے۔ سیح سیح الدین کا جہاں سارے محلے والے احترام کرتے وہاں ایک بے ادب بھی تھا۔ صاحب کو کھانا دینا تو دور کی بات گھاس بھی نہ ڈالتا اور وہ بے ادب تھا۔
سیح صاحب کا سلیم پڑوسی تھا۔ سر سے پیر تک شیطان، سیح صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ نہ پڑھا ہوتا تو وہ یقیناً سلیم کو انسان کے بجائے سچ کچ کا شیطان سمجھتے۔ جو شاید ان کے امتحان کے لئے اترا تھا۔ سیح صاحب کو جتنی خدا سے محبت تھی، اتنی ہی سلیم سے نفرت تھی۔ سیح صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ

سمیع الدین کی آوازیں جانتے ایسی کون سی کشش تھی کہ بڑے سے بڑا گناہ گار بھی اگر دو چار بار سیح صاحب کی آوازیں سے تو ساری عمر گناہ کی طرف رخ نہ کرے۔ محلے کے مرد، عورتیں، بچے بوڑھے سب سیح صاحب کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آخر لوگ ان کی عزت کیوں نہ کرتے؟ وہ لوگوں کو ایسے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے۔ ان میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرتے۔ تین وقت کا ایچھے سے اچھا کھانا، سیح صاحب کو محلے کے لوگوں سے پابندی سے ملتا رہتا۔ سیح الدین محلے والوں کے لئے ہر مسئلے کا حل تھے۔ کوئی مذہبی مسئلہ ہو یا دنیاوی معاملہ

خوفناک کہانیاں 193 اپریل 2018ء

”کہو..... کیا ہو رہا ہے اب.....“ منزل نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔
”ہر طرف کئے کئے لوگ پڑے ہیں خون سے زمین لال ہو رہی ہے مجھے خوف آ رہا ہے میں چلتی ہوں.....“ امینہ نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔
”توبہ ہے بابا..... توبہ ہے..... یہ لڑائی تو اب جنگ میں تبدیل ہونے لگی ہے میں اپنے گھر میں رات اکیلی ہوتی ہوں میں تو ان سے جھگڑ نہیں سکتی ہو سکتا ہے یہ مجھے تنگ کریں کیونکہ میں نے ہی ان کی نشاندہی کی تھی۔“ امینہ بانی نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔
منزل نے بھی دوبارہ سے اپنے ساتھیوں کو بلانے کا عمل شروع کر دیا تھا۔
”مجھے افسوس ہے کہ مجھے راہ میں اپنا عمل روکنا پڑا ہوں لگتا ہے جیسے اس گھر میں سونامی اتر آیا ہے..... یہ جگہ گنتی ہے کسی زمانے میں شمشان گھاٹ رہا ہو..... کیونکہ بقول اس عورت کے..... اس قدر ہوائی مخلوق جن میں مردوں کے علاوہ عورتوں، بچوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے میں نے نہ پہلے کسی جگہ سنی اور نہ ہی دیکھی ہے۔“ منزل نے فارغ ہوتے ہوئے بتایا۔
”تو اب کیا ہوگا.....“ صوفیہ نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔
”سونامی اگر ایک بار اتر جائے تو دیر بعد ہی پلٹے گا..... ان میں سے بے شمار کو میرے ساتھیوں نے قتل کر ڈالا ہے اور دوسرے یہ جگہ چھوڑ گئے ہیں امید ہے اب آپ کو دوبارہ اس بات کی شکایت نہ ہوگی اور نہ ہی یہ دوبارہ شرارتیں کریں گے۔“ منزل نے حوصلہ دلایا۔
اور پھر منزل چلا گیا اور جاتے جاتے ایک بہت بڑی رقم بھی لے گیا..... اس کے بعد اس گھر میں بھی افادہ ہو گیا مگر سونامی اتر جائے تو کیا اس کے نقصانات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔
صوفیہ اور فرحان ابھی تک اسی ڈر میں مبتلا ہیں۔ کہ نہ جانے پھر سے سونامی آجائے۔

☆☆

جواب دیا۔
”یہ ٹھیک رہے گا..... آپ اسے بلوائیں وہ دیکھ کر مجھے بتائی رہیں گی اور میں بہتر طور پر انہیں یہاں سے بھگا دوں گا۔“ منزل بولا۔
تب صوفیہ نے چند کو بھگا کر امینہ بانی کو بلوالیا۔
وہ آ کر ان کے نزدیک بیٹھی تھی..... مگر اس کی نظریں بڑی تشویش اور حیرانی سے ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔
”کیا آپ دیکھ سکتی ہیں.....“ منزل نے پوچھا۔
”بہت کچھ دیکھ رہی ہوں.....“ امینہ نے جواب دیا۔
”پھر میں ان کو بھگانے کے لئے یا ان کا صفایا کرنے کا عمل کرتا ہوں آپ دیکھ کر مجھے بتائی رہیں۔“ منزل نے یہ کہہ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ساتھ وہ پوچھتا چلا جا رہا تھا۔
”آپ دیکھ رہی ہیں میرے کچھ حواری ادھر سے آ رہے ہیں۔“ منزل نے پوچھا۔
”ہاں..... کچھ لوگ آ رہے ہیں..... مسلسل آتے جا رہے ہیں اور اب اس گھر میں پہلے سے موجود لوگوں سے ان کی ہاتھ پائی شروع ہو چکی ہے۔“
یوں لگ رہا تھا جیسے اس بھینک ٹھیل پر امینہ رواں تبصرہ کر رہی ہو منزل تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سے سوال کرتا جا رہا تھا۔
امینہ بانی نے بتایا کہ اب دونوں اطراف سے بڑھ بڑھ کر محلے ہو رہے ہیں کچھ لوگ کاٹ رہے ہیں اور کچھ کٹ کر گر رہے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی تعداد میں کمی نہیں ہو رہی..... شاید اب امینہ بھی خوف زدہ ہونے لگی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر مردنی سی چھانے لگی تھی۔
باقی سارے بڑی پریشانی سے خاموش بیٹھے تھے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ دونوں کیا کر رہے ہیں منزل کسی ماہر کی طرح اپنی افواج کو لڑا رہا تھا مگر امینہ بانی کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

خوفناک کہانیاں 192 اپریل 2018ء

دروازے پر جاتے کینوں کی خیریت دریافت کرتے ان کے مسائل دلچسپی سے سنتے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی مدد کرتے۔ پیر کے روز بھی وہ حسب مول نظر کی نماز پڑھ کر محلے میں داخل ہوئے تو ان کی نظر گھریلو سامان سے بھری سوزوکی پر پڑی۔ وہ لپک کر محلے میں داخل ہوئے۔ سوزوکی پر رکھا ہوا سامان مالکان کی زبوں حالی کو پکار پکار کر عریاں کر رہا تھا۔ مسیح صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ سامان کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے۔ بلکہ دو خواتین ہیں۔ جن میں ایک بچی عمر کی عورت تھی اور ایک کم عمر لڑکی جس کا اچھوتا حسن آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ مسیح صاحب فوراً آگے بڑھے۔ ”خاتون! کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ دونوں خواتین نے ایک ساتھ مڑ کر فوراً ان کی طرف دیکھا۔ ”جی ہاں! بڑی مہربانی، آپ ذرا یہ الماری محلے کے لڑکوں سے پکڑوا کر اندر رکھو ادیں۔“

”پائل پائل۔“ مسیح صاحب نے جلدی سے کہا اور تیزی سے مڑ گئے۔ چند سیکنڈ بعد جب وہ وارد ہوئے تو ان کے ساتھ دو صحت مند لڑکے تھے۔ دونوں لڑکوں نے خواتین کو سلام کیا۔ سوزوکی والے کی مدد سے الماری اتروائی اور گھر کے اندر لے گئے۔ جس وقت لڑکے الماری اندر لے جا رہے تھے، مسیح صاحب کی نظر سلیم پر پڑی وہ خدمت کے جذبہ میں بھول بیٹھے کہ سلیم ان کا اڑی دشمن ہے۔

”ارے سلیم بیٹا اور ہر آتا؟“

سلیم نے مڑ کر ان کو تیز نگاہوں سے دیکھا لیکن بغیر کچھ کہے آگے آ گیا۔ ”بیٹا ذرا گاڑی سے صندوق اتار کر اس گھر میں پہنچا دو۔“ انہوں نے انگلی سے سامنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا، دراصل گاڑی آگے نہیں جاسکتی راستہ تنگ ہے۔ پھر دیکھو تو صرف دو خواتین ہیں سارے سامان کے ساتھ، پتہ نہیں کیا آفت آن پڑی کہ کوئی بھی مرد ساتھ نہیں ہے

اور پتہ نہیں کوئی مرد ہے بھی یا نہیں بھر بھی بے چاریاں تنہا دنیا کے دکھ اٹھا رہی ہیں۔ آپ ہی آپ بڑبڑا کر مسیح صاحب نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا سلیم اپنی جگہ کھڑا ہے اور اس کی نگاہ سامان کے ساتھ آنے والی لڑکی پر لگی ہے۔ یہ دیکھ کر مسیح صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لاحول ولاقوتہ میاں لوگ واقعی سچ کہتے ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں صندوق اندر پہنچا دے اور تو کس شیطانی دھندے سے لگا ہے۔ سلیم نے گردن گھما کر دیکھا اور بازاری مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا۔

”ارے مسیح الدین نظریں GOD کی تعریف کر رہی تھیں۔ خدا کی قسم کیا حسن ابراہ۔“ شہنشاہک پڑ گئی اور رہا صندوق تو یہ مسیح صاحب ان حسن زادی کے طفیل ابھی گھر میں پہنچا۔ تم تو جانتے ہو کہ سلیم پھوٹ میں کسی کام بھی کام نہیں کرتا۔ پر ایک نظر نے ساری مزدوری دے دی اللہ قسم۔ سلیم نے بازاری مسکراہٹ ہونٹوں پر سمجھا کر ایک آنکھ دبا کر مسیح صاحب کو عامیانہ سا اشارہ کیا اور صندوق اندر پہنچا کر یہ جاوہ جا۔ ”لاحول ولاقوتہ“ کہتے ہوئے مسیح صاحب تیزی سے خواتین کے پاس گئے اور جلدی سے معذرت کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”دیکھئے برانہ مانے گا۔ اس کم بخت لے لکھنے کی باتوں کا یہ سارا حملہ شریلوں کا ہے یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ سارا حملہ خاندان کی طرح رہتا ہے۔ آپ جس وقت“ ابھی مسیح صاحب کی بات ادھوری ہی تھی کہ محلے کی کئی خواتین اندر داخل ہوئیں علیک علیک کے بعد پڑوس کی چوکی اماں حسب عادت مردانہ آواز میں مخاطب ہوئی۔

”اے اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا پڑوس آباد ہوا۔ کم سے کم اب رونق تو لگی رہے گی۔ کیا نام ہے، بہن تمہارا؟ کہاں سے آئی ہو کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟“ انہوں نے گہری نظروں سے کم عمر لڑکی کی طرف دیکھتے

ہوئے پتہ عمر کی خاتون سے سوال کیا۔ عورت دکھ سے مخاطب ہوئی۔

”جی میرا نام روزی ہے اور یہ میری بیٹی ریٹا ہے۔ میرے شوہر مائیکل کا پچھلے برس انتقال ہو گیا۔ جب تک وہ زندہ رہے ہم خوش و خرم تھے دوستوں رشتہ داروں کی کوئی کمی نہ تھی ان کی آنکھیں کیا بند ہوئیں ایک ایک کر کے سارے سگی ساتھی تنہا کر گئے۔ جمع پونجی ختم ہوئی تو مکان بیچ ڈالا، آخر کب تک وہ سرمایہ سہارا دیتا۔ آج کل کراہ کے مکان بھی ایک عذاب ہیں، سلائی کر کے اتکا کماگیتی ہوں کہ ہم ماں بیٹی کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔“ بات ختم کر کے جب انہوں نے تمام لوگوں پر نگاہ ڈالی تو آٹھ دس خواتین میں سے اب وہاں پر صرف دو چار خواتین ہی بچی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی بے زاری کے آثار نمایاں تھے۔ البتہ مسیح صاحب ہمہ تن گوش تھے۔ باقی خواتین دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے صرف اس لئے اپنے گھر چلی گئیں کہ ایک غیر مذہب کی عورت کے ساتھ بیٹھ کر وہ کیوں جہنم خریدیں۔ جب کہ ان میں سے کچھ عورتوں کا خیال تھا کہ ایسے گھر پر خرا کی مار ہوتی ہے جہاں کوئی مرد نہ ہو۔ بھلا مرد کے بغیر بھی گھر میں رونق ہوتی ہے۔ جب رات گئے تک میاں بیوی کے بچھڑنے کی آواز نہ آئے، دو چار برتن نہ ٹوٹیں اور بیوی کے جسم پر صبح پڑوس کی عورتوں کو نیل نظر نہ آئے تو کوئی زندگی بھی ہے۔ جب تھوڑی دیر میں محلے کی باقی خواتین بھی اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو ریٹا نے ماں کو آواز لگائی۔

”امی گھر کا غسل خانہ تو بالکل بدترین صورت حال پیش کر رہا ہے۔“

بیٹی کی آواز پر جب روزی نے جا کر دیکھا تو سچی جگہ جگہ کافی نے نہ صرف غسل خانہ کو بلکہ اس سے حق باور بھی خانہ کو بھی سیل زدہ کر دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہم ابھی مل کر اس گھر کو کاویں گے۔“ ماں نے ایک عزم کے ساتھ بیٹی کو

مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ ریٹا نے ماں کے خیال سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ دو کمروں کے مکان کی صفائی ٹائم ہی کتنا لیتی ہے۔ چار گھنٹے میں سارا مکان صاف ہو گیا۔ دونوں نے ایک نظر سارے گھر پر ڈالی کہ کہیں کچھ باقی تو نہیں رہ گیا۔ مگر کون کون سا صاف ہو چکا تھا۔ اب رات کے آٹھ بج رہے تھے، گرمیوں میں یہ وقت کچھ اتنا اندھیرا نہیں لاتا۔ مگر دونوں تھک کر اتنا چور ہو چکی تھیں کہ ان کی ہمت نہیں تھی کہ باہر جا کر کچھ کھانے کا انتظام کریں دونوں نے ایسے ہی رات بسر کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد ریٹا نے ماں کو آواز لگائی امی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

”اگر کھو تو چائے بنالوں؟“ اس بات پر ماں نے خاموشی اختیار کر لی، شاید سوچ رہی تھیں کہ خالی چائے سے کیا گزارا ہوگا اگر چائے ابھی بنا بھی لی تو صبح کہاں سے چائے بنائیں گے، ڈبے میں صرف ایک وقت کی چائے کی پتی پڑی تھی۔ جس وقت وہ پرانا مکان خالی کر رہی تھی وہاں آس پاس کی عورتوں پر ان کے سلائی کے پیسے آتے تھے مگر سب نے مختلف دنوں کا وعدہ کر کے ان کو ٹال دیا تھا۔ البتہ بے بی کی ماں نے بیگم روزی کے بڑے اصرار پر کہا تھا کہ وہ شام کو بے بی کو پاس سے اس کی سلائی کے پچاس روپے لے کر رکشیں کی اور کل وہ آ کر لے جائے۔ محلے کی خواتین کے رویہ سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کسی سے بھی مدد کی توقع رکھنا فضول ہے۔ آنے والی خواتین میں سے ایک خاتون بڑے روکھے انداز میں کہتے ہوئے ابھی تھیں۔

”چلو بھئی! شمشوں کے ابا کہتے ہیں، کافروں سے دوستی سے بہتر مسلمانوں کی دشمنی ہے۔“

گوڈ بہتر کرے ان مسیح صاحب کا جنہوں نے فوراً کہا تھا۔

”اری کم عقل یہ اہل کتاب ہیں اور اہل

کتاب کافر نہیں ہوتے۔“ جس پر اس عورت نے ناک سگود کر کہا۔

”معاف کرنا مسیح صاحب ہم نے بزرگوں سے سنا ہے اور خود کو بھی دیکھا ہے جسائی زیادہ تر کم ہوتے ہیں اور اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ کم ترلوں سے دوستی کریں۔“ جس پر مسیح صاحب نے ان کو عالمانہ لہجہ دیا دس بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ بھوک کی وجہ سے دونوں ہی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آواز سن کر روزی نے بستر سے اٹھنا چاہا۔

”ظہور۔“ ماں نے اس کو روکتے ہوئے کہا رات کا ٹائم ہے بیٹی اور پھر حملہ بھی نیا ہے میں دیکھتی ہوں، روزی نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک آٹھ لوسال کا لڑکا کھڑا تھا۔ بیگم روزی کو دیکھ کر جلدی سے بولا۔

”یہ کھانا ہے مسیح صاحب نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس کو بڑوس ہونے کے ناتے اپنا حق سمجھیں۔“ دونوں ماں بیٹی جس وقت کھانا کھاتے ہوئے مسیح صاحب کو دعا میں دے رہی تھیں مسیح صاحب بھی ان کے خیالوں میں گم تھے۔

”امی مسیح صاحب بڑے نیک آدمی ہیں۔ دیکھئے تو ہمارا کتنا خیال ہے ان کو اور امی سچ مجھے تو نیند بھی نہیں آتی۔“ کھانے کے بغیر ریتانے جلدی جلدی کھانا کھاتے ہوئے مسیح صاحب کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ ہاں یہ تو ہے ماں نے صرف اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ کھانا کھانے کے بعد نہ جانے کس وقت باتیں کرتے کرتے دونوں ماں بیٹی سو گئیں۔

ادھر مسیح صاحب کی آج برسوں بعد نیند اڑ گئی تھی۔ مسیح صاحب رات بھر خدا کی تعریف کرتے رہے کہ اس خدا نے ریتا کو کس قدر خوب صورت بنایا تھا۔ خیالات بیکٹنے لگے تو انہوں نے جلدی سے ”لا حول“ پڑھی۔ اور پھر خود ہی بڑبڑائے کسی بندے کی کیا مجال کہ وہ خوب صورت بن جائے اور کسی دوسرے بندے کی کیا مجال کہ وہ اس کی رضا کے بغیر اس خوب صورتی کی تعریف کرے اور پھر ریتا کی

تعریف تو خدا کی تعریف ہے، کسی عورت کی تعریف ہرگز نہیں۔ وہ تو اس مصر کی تعریف تھی جس نے زمین ہ بلا کی خوب صورتی بکھیری دی تھی۔ اس طرح وہ پیدا ہوتی ہوئی بحرمانہ سوچ کو جائز ٹھہرانے کی دل ہی دل میں کوشش کرتے رہے۔ گو کہ مسیح صاحب نے دو چار بار ہی کن اکھیوں سے ریتا کو دیکھا تھا۔ لیکن بلا کا حسن ان کی نگاہوں میں چھا گیا تھا۔ کشادہ پیشانی کے نیچے گہری ہنر آکھیں۔

ذرا نیچے خوب صورت ناک، ذرا اور نیچے خوب صورت ہونٹ، ذرا اور نیچے خوب صورت گردن اور ذرا..... اور..... نیچے..... یہاں سے آگے مسیح صاحب سے سوچا نہ گیا اور ان کا سانس دھونکی کی طرح چلنے لگا۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد وہ دعا میں رہنا.....

صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔ انہوں نے اپنے نادان دل کو ڈانٹا۔ اور چورنگا ہوں سے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی ان کے خیالات سے واقف تو نہیں ہو گیا۔ مگر کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا صرف ان کا دل ریتا کے حسن سے روشن تھا۔

دوسری طرف سلیم بھی جاگ رہا تھا۔ ریتا ہا، بار اس کے خیالوں میں جھم جھم کرتی جاتی اور وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اور خدا سے دعا کرتا۔ ”اے خدا تو جانتا ہے، میرا دل پاک ہے سلیم دنیا میں بڑے سے بڑے بد معاش اور بڑے سے بڑے شریف سے نہیں ڈرا۔ سلیم اگر ڈرا ہے، تو صرف کسی کنواری کی عزت سے ڈرا ہے اے پاک ذات اس حسن کی دیوی کو ہمیشہ پاک رکھنا اس کی عزت کی حفاظت کرنا۔

سلیم نے بھی کسی لڑکی پر بری نگاہ نہیں ڈالی اس نے ریتا پر بھی ایک عام نظر ڈالی تھی۔ مگر اس کا حسن اس کی نگاہوں میں بس گیا تھا۔ دل بار بار کہتا سلیم یہ تیرے لئے دنیا میں آئی ہے۔ یا اللہ تو جانتا ہے میں بہت برا آدمی ہوں۔ اے مالک مجھے برا رہنے دے اے اچھی لڑکی کی خواہش میرے دل میں مت

ڈال۔

دعا مانگتے مانگتے سلیم کی آنکھوں سے زار زار موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے کی آواز کے ساتھ ہی سلیم نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد روزی نے بیٹی کو آواز لگائی۔ ریتا دروازہ اندر سے بند کر لو میں ذرا سلائی کے پیسے لے آؤں۔ اور خبردار کوئی بھی آئے دروازہ مت کھولنا ابھی وہ دروازے سے باہر قدم نکال ہی رہی تھی کہ ان کو مسیح صاحب نظر آئے جن کا رخ ان کے ہی کمر کی طرف تھا۔ روزی نے دروازہ پر رک کر مسیح صاحب کے قریب پہنچنے کا انتظار کیا۔ سلام دعا کے بعد روزی نے رات کے کھانے کے لئے مسیح کا شکریہ ادا کیا تو مسیح صاحب دل میں بڑے حیران ہوئے اور ان کی نظر جیسے ہی دروازہ کے اندر کھڑی ریتا پر پڑی وہ حیرانگی کو بھول بھال کر اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔

وقت جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی سے گزر جاتا ہے روزی کو اس محلے میں آئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے اور اس دوران وہی محلے والے جو کتر اکر گزر گئے تھے روزی اور ریتا کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ محلے کی کوئی خوشی اور غمی ان کے بغیر ادھوری سمجھتی جاتی اور اس اہمیت کے لئے دونوں ماں بیٹی مسیح صاحب کی شکر گزار تھیں۔ جن کی کوششوں سے محلے والوں نے نہ صرف یہ کہ ان کو قبول کر لیا تھا بلکہ ان سے محبت بھی کرنے لگے تھے۔ ایک اعتماد ان کو اس محلے میں مل گیا۔ مگر اس اعتماد میں شک کا بال سلیم کی ذات تھی وہ اب سلیم سے خوفزدہ رہتی تھیں۔ ان کو صرف سلیم سے کسی نہ کسی خطرہ کا خوف لگا ہی رہتا اور پھر کچھ دنوں سے وہ اپنی بیٹی ریتا میں بھی بڑی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔

ریتا اب گھوم پھر کر سلیم کے تذکرہ کو اپنی باتوں میں ضرور لاتی اور سلیم بھی جہاں بھی ریتا کو دیکھتا پتھر کا

بت بن جاتا۔ ابھی کل شام ہی کو جب وہ سامنے گھر سے نکلی تو سلیم اور ریتا ایک دوسرے کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ریتا نے جیسے ہی ماں کی آہٹ محسوس کی تیزی سے اندر چلی گئی اور سلیم نے بھی پیٹھ موڑ لی۔ اور یہ اس طرح کے دوسرے واقعات نے روزی کو بیٹی کی طرف سے کافی فکر مند کر رکھا تھا۔

چھ ماہ میں روزی پر مسیح صاحب کی قربت نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ان کے تبلیغ کے انداز اور رویہ نے روزی کو تنجیدگی سے مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ مسیح صاحب سے وہ پہلے ہی کئی دین کی کتابیں لے کر پڑھ چکی تھی۔ اسلام ان کو تمام مذاہب سے افضل لگا، جہاں زندگی کا ہر مسئلہ سلجھا ہوا تھا۔

آخر ایک دن حتمی فیصلہ کر کے انہوں نے اپنے گھر ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا اور اسی تقریب میں مسیح صاحب کے ہاتھوں دونوں ماں بیٹی مسلمان ہو گئیں۔ محلے والوں نے اس خوشی پر روزی کو جس کا نام زینہ اور ریتا کو جس کا نیا اسلامی نام رابعہ رکھا گیا بار پہنائے۔ اس واقعہ کے بعد مسیح صاحب لوگوں کی نظر میں کچھ اور بڑی بزرگ ہستی بن گئے۔ تقریب کے اختتام پر مسیح صاحب اب رابعہ (ریتا) سے مسلمان ہونے کے ناطے اور زیادہ قربت محسوس کر رہے تھے۔

جس وقت دروازے پر دستک ہوئی رابعہ قرآن شریف یاد کر رہی تھی ایک ایک حرف اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ شیریں آواز دروازے سے کان لگائے سلیم کے دل میں ایک بے قراری پیدا کر رہی تھی۔ سلیم کو چاروں طرف نور ہی نور نظر آ رہا تھا۔ وہ گنا گار زار زار معافی کے لئے آنسو بہا رہا تھا کہ اچانک نگاہ مسیح صاحب پر پڑی جو رابعہ کی طرف آ رہے تھے۔

سلیم ایک کونے میں ہو گیا۔ دستک سن کر رابعہ نے دروازہ کھولا اور خوش ہو کر بولی مسیح صاحب میں نے سبق یاد کر لیا ہے۔

کیا ماں ہے گھر پر ہیں؟

بھیا نک عاشق



”کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جب ان کے پاس تھوڑا بہت علم آ جاتا ہے تو وہ خود کو دوسروں سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ خدا نے انہیں کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے“

”چھوڑ دو مجھے..... خدا کے لئے جانے..... ہا..... آ..... چھوڑ دو.....“
نازک حسین لڑکی زمین پر لیٹی زنجیروں سے بندھی رہی تھی۔

”کوئی ہاتھ میں بڑی دھار والی کپھاڑی لئے ہاتھ جب قریب پہنچا تو لڑکی مکمل طور پر سہم چکی تھی شاید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس شیطان نے کپھاڑی کی فضا میں بلند کی اور زور سے کپھاڑی اس کی ٹانگ بے ماری..... ٹانگ کٹ گئی..... لڑکی کسی بنی پانی کی سطح کی طرح تڑپ رہی تھی مگر وہ مضبوط زنجیروں قید تھی۔ ہاتھ دوبارہ ہوا میں بلند ہوئے اور جسم کے

خوفناک کہانیاں [199] اپریل 2018ء

نہیں سمجھ صاحب وہ سلائی کے کپڑے دینے لگی ہیں آپ اندر آ جائیں۔

اس دوران سلیم وہاں سے سیدھا مسجد کی طرف چلا آیا اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ساری عمر اسی طرح بیٹھا رہے اور روتا رہے لیکن اس کو بہت سے کام کرنے تھے اس نے سنا تھا کہ سیکینہ کی شادی کے لئے اس کے باپ کو کسی سے بھی رقم نہیں مل رہی ہے۔ لہذا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ چوری کرے گا اور رقم سیکینہ کے گھر ضرور پہنچائے گا اس کی شادی وقت پر ضرور ہوگی۔

مسجد سے نکل کر وہ دوبارہ گلی میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ سید صاحب پر پڑی وہ راہجہ کے گھر سے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں نکلے۔ سارا جسم پسینہ سے شرابور تھا ہمیشہ سر پر موجود ٹوپی غائب تھی اور وہ تیز تیز گلی پار کر گئے۔

سلیم نے انجانے خدشہ کے تحت تیزی سے راہجہ کے دروازے پر پہنچ کر تین بار ہولے ہولے سے دستک دی مگر جواب نہ ملا مایوس ہو کر وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ دو چار روز بعد ہی سلیم کی مصروفیات دوبارہ عود آئیں۔ جگہ جگہ چوریاں کرنا اور رقم کو سیکینہ کے گھر میں پہنچانے میں وہ اتنا مصروف ہوا کہ اس کو پتہ ہی نہیں چلا اور تین ماہ گزر گئے۔

راہجہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اس کو بار بار سید صاحب کا راہجہ کے گھر سے گھبرا کر نکلتا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر ایک روز یہ کبھی بھی سلجھ گئی۔ وہ محلے سے گنتگنا تا گزر رہا تھا، آج صبح اس نے راہجہ کو دیکھا تھا۔ وہ کمزور لگ رہی تھی۔ مگر اتنی خوب صورت تھی جب بھی راہجہ پر نظر پڑتی ایک نور کی ٹھنڈک اس کے دل میں اتر جاتی۔ ابھی وہ راہجہ کے گھر کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ راہجہ کی امی زربینہ نے دروازہ کھولا اس پر نگاہ پڑتے ہی آواز دی۔

سلیم اندر آؤ، سلیم ایک دم گھبرا گیا۔ اس طویل عرصہ میں یہ پہلا اتفاق کہ راہجہ کی امی نے نہ صرف یہ کہ اس کو آواز دی بلکہ گھر کے اندر بھی بلا لیا، ڈرتے

☆☆

خوفناک کہانیاں [198] اپریل 2018ء

رانا شہریار نے اسے خرید لیا اور پھر اس گھر کا آخری فرد
حنا شہریار جو نشاء حسینہ کے نام سے مشہور ہے۔ ایک
سپر ماڈل ہے جس کے جلوؤں سے دیکھنے والا مست
نحوہ ہو جاتا ہے۔

گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اس کے ساتھ اس
کی والدہ بھی تھی مگر وہ چار سال پہلے ایک کار ایکسیڈنٹ
میں ماری گئی۔ اس کے پیچھے گاڑی میں کچھ لوگ اس کا
تغائب کر رہے تھے حنا شہریار کی باعث گاڑی ایک
ٹرک سے ٹکرائی اب اس حویلی کی اکلوتی وارث حنا
شہریار عرف نشاء حسینہ ہے جو بچپن میں ہی شہر آ گئی تھی
اور دوبارہ کبھی حویلی کو پلٹ کر نہ دیکھا۔

☆.....☆.....☆
کانٹیل راشد جو حویلی کو چیک کر کے آیا تھا
اور پھر یہ تمام معلومات اس نے اپنے سینئر ”انسپیکٹر سجاد“
کو فراہم کیں۔ دراصل ایک دن پہلے حویلی میں کسی
لڑکی کا بے دردی سے قتل ہو گیا تھا اور اس کیس کو انسپکٹر
سجاد ہینڈل کر رہا تھا انسپیکٹر سجاد نے راشد کو کچھ ضروری
ہدایات دی اور کہا لڑکے کے بعد فوری طور پر پہلے حویلی
اور پھر نشاء حسینہ کے گھر روانہ ہونا ہے۔

انسپیکٹر سجاد دوپہر 3 بجے کانٹیل راشد اور اس
کے ہمراہ دوکانٹیل ودیگر سامان کے حویلی کے اندر قتل
والی جگہ موجود تھا۔ قتل والی جگہ کی سفید چوٹے سے
خاص حد بندی کی گئی تھی۔

”قتل کرنے سے پہلے لڑکی کو تشدد کا نشانہ
بنایا گیا۔ اور پھر اس کے بعد زخمیوں سے باندھا گیا
اور لوہے کی کسی تیز دھار آلے سے بے دردی کے
ساتھ قتل کیا گیا۔“ انسپیکٹر سجاد نے پوسٹ مارٹم بمعہ قتل
والی جگہ کو دیکھتے ہوئے قتل کی نوعیت کا جائزہ لیتے
ہوئے کہا۔

اس کے بعد حویلی کے دیگر کمروں کا جائزہ لیا گیا
اور چھوٹے موٹے دھنکس کا جائزہ لیا گیا اب گاڑی کا
رخ شہر کی جانب تھا اور شہر پہنچنے کے بعد نشاء سے
ملاقات کرنا تھی۔

”انسپیکٹر سجاد جو اس سالہ اچھے قد و قامت کا مالک
ایک خوب رو حسین جوان تھا اور اس وقت وہ اپنے تین
عدد کانٹیل کے ہمراہ نشاء کے بنگلے میں موجود تھا۔

”نشاء آپ آخر بچپن کے بعد اب تک اپنے
آبائی گاؤں کی حویلی میں واپس کیوں نہیں گئی۔“ انسپکٹر
سجاد نے نشاء سے دعا و سلام کے بعد پہلا سوال پوچھا۔
”مجھے آگے بڑھنا اچھا لگتا ہے اور بچپن سے
مجھے پرانی چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں آپ کے
اس پرانے سوال کا اتنا ہی جواب دینا چاہوں گی
جو میڈیا والے مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہیں۔“ نشاء نے
اپنے مخصوص مفروضہ انداز میں جواب دیا۔

”مجھے قتل کا علم ہو چکا ہے جس نے بھی یہ کیا، غلط
کیا اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ اسے ضرور
سزا دلوائیں گے مگر ان سب سے پہلے یہی کہ آپ
جو سوالات مجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کچھ
پتہ چاہیں گے۔“ نشاء نے کہا۔
”تو شکس.....“ انسپیکٹر سجاد نے کہا۔

”میرا دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ کیا کوئی آپ کی
حویلی خریدنا چاہتا ہے مگر آپ اسے بیچنے پر راضی
نہیں۔“ انسپیکٹر سجاد نے کہا۔
”ارے..... میں تو شکر کروں..... جان چھوٹے
اس منحوس حویلی سے میری..... اس کی وجہ سے میڈیا
والے ہاتھ دھوکر میرے پیچھے پڑے ہوئے
ہیں۔“ نشاء نے کہا۔

”وہ حویلی شروع سے ہی منحوس ہے جب
میرے والد صاحب رانا شہریار نے خریدی تو اس کے
بعد ان کی دشمنی ملک فیہم انجم سے ہو گئی۔ دشمنی کی وجہ
سے دونوں طرف سے جانوں کے نقصان دے دیئے گئے
پھر میں اور میری والدہ دونوں شہر آ گئے اور جب میں
نے ماڈلنگ میں قدم رکھا تو شو بزنس کی دنیا میں میرا
ایک مقام بن گیا سو مجھے بلیک میل کیا جانے لگا جس کی
وجہ سے میری والدہ ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئیں خبر
میں نے بلیک میل کرنے والوں کو قانونی طور پر سزا

لوادی اب میں خود یہ چاہتی تھی کہ یہ حویلی کسی طرح
بیک جائے مگر پھر اس معصوم لڑکی ”درنا یاب“
کا قتل..... وہ میری اسٹوڈنٹ تھی اور میں اسے بہت
جلد ماڈلنگ کی دنیا میں لانے والی تھی..... مگر..... اس
کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی..... پھر بھی..... پتا
نہیں میرے ساتھ ہی کیوں..... بچپن سے لے کر آج
تک جس کو اپنا بنایا، جس کو اپنا سمجھا وہی کیوں دور چلا
جاتا ہے..... کہنے کو تو سپر ماڈل ہوں لاکھوں فین ہیں
میرے، ہزاروں چاہنے والے مگر پھر بھی اس ہجوم میں
میرا کامیابی کا سفر طے کر رہی ہوں..... نشاء کی
”منحوس“ میں آسو آگئے۔

”نہیں میڈم میرا مقصد آپ کو ہرگز دیکھ کرنا
میں تھا..... پلیز میڈم آپ دیدہ نہ ہو.....“ انسپیکٹر سجاد
نے نشاء کو تشدد دیتے ہوئے کہا اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔
”آپ ایک ایماندار اور اپنے فرض سے لگاؤ
کئے والے انسپکٹر ہیں ورنہ آج کل کے پولیس انسپکٹر
..... یہ کہہ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں میں جتنی عزت آپ کی
رہتا ہوں اس سے کہیں زیادہ میرے دل میں آپ کے
بے عزت ہے۔ خیر خدا آپ کو صبر جمیل عطا کرے اب
میں چلنا چاہتی..... لیکن کیس کے سلسلے میں آپ سے
بات ہوتی رہے گی۔“ انسپیکٹر سجاد نے کہا۔
”ارے..... رکھیں نا..... رات کا کھانا اگٹھے
لیتے۔“

”نہیں..... اس کی کوئی ضرورت نہیں..... ویسے
آپ نے ہمارے ساتھ اتنا تعاون کیا..... بہت
..... اور کیس کے سلسلے میں دوبارہ ضرور ملاقات
..... سوئیکسٹ ٹائم۔“

”کیا ماڈل ہے..... سپر ماڈل کم..... اور کسی
(حساس ادارے) کی انسپیکٹر زیادہ لگتی ہے
..... اور چہروں کو تو پڑھتے دیکھا تھا..... یہ
..... لوگوں کے ذہن بھی پڑھتی ہے..... تھینک
..... کہیں سچ میں ذہن نہیں پڑھ لیا ورنہ اس

بار تو لائف ٹائم سپینڈ ہو جاتا بہر حال کچھ بھی ہو.....
خوب جے گی محفل جب مل بیٹھیں گے دو..... ایک
انسپیکٹر دوسری سپر ماڈل۔“ گھر سے باہر گاڑی کے
قریب تینوں کانٹیل انسپیکٹر سجاد کا ویٹ کر رہے تھے
پھر وہ روانہ ہو گئے۔

”اس کے بعد انسپیکٹر سجاد نے کانٹیل راشد
کو ہدایت دی کہ وہ اپنے ساتھ دو، تین کانٹیل اور لے
کر جائے اور حویلی سے متعلق اور معلومات اکٹھی
کرے۔ نیز پتا چلائے کہ ملک فیہم انجم کے خاندان میں
کون کون اب باقی ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ابھی تک
حویلی کو حاصل کرنے کی جستجو میں ہے..... اور یہ تمام
سازش ان ہی نے کرائی ہو.....؟“

☆.....☆.....☆
انسپیکٹر سجاد ٹھیک 8 بجے آفس میں موجود تھا.....
اس کی شروع سے ہی عادت تھی کہ ٹائم کی پابندی کرتا
اور وقت سے پہلے آفس پہنچ جاتا۔ ٹیلی فون کی بیل بجی۔
”ہیلو..... انسپیکٹر سجاد اسپیکنگ۔“

”جی سر میں کانٹیل زیدی بات کر رہا ہوں کل
شام کو آپ نے جس لڑکی کی تلاش کا کہا تھا اس کا ٹھکانہ
مل گیا ہے۔ دراصل اسے دوپہر 2 بجے کالج سے چھٹی
کے بعد گھر آتے ہوئے راستے میں اغوا کر لیا گیا تھا۔
میں نے پتا چلا لیا ہے ریلوے اسٹیشن کے پرانے سرکاری
کوآرٹروں میں سے ایک کوآرٹر میں اسے قید کیا ہوا ہے یہ
کوآرٹر اب ناقابل استعمال ہیں اور کافی شکستہ حالت میں
ہیں۔ حکومت اسے بہت جلد تیار کرنے والی تھی پر کسی
وجہ سے روک دیا گیا لڑکی کے گھر والوں سے 20 لاکھ کی
مانگ کی گئی ہے آپ نفری بھیجیں تاکہ ریڈ کی جاسکے
ویسے زیادہ بندوں کی ضرورت نہیں..... یہ سنیں، چار ہیں
مگر لڑکی کی سیلفی زیادہ ضروری ہے۔“

”زیدی its ok تم واپس آ جاؤ..... انہیں
میں اکیلا ہی ہینڈل کروں گا اور ایسا سبق سکھاؤں گا کہ
پھر اس علاقے میں کوئی بھی کسی کو بھی اغوا کرنے سے
پہلے انسپیکٹر سجاد کو یاد کر کے ضرور خود کو کوٹے گا۔“

”لیکن سر آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“
”انسپکٹر سجاد خطروں سے زیادہ خطرناک ہے
”Understand...
”Yes Sir”

سے بھی نہیں ملے گے۔“ دوسرے گراںمیل شخص نے کہا۔
 ”میں تو ایسا تم دونوں ہو..... انخوار کرنا تو ذہنک
 سے آتا نہیں اور ملے پولیس اسٹیشن سے پنگا لینے۔“
 ”میرا نام اسٹیشن چاراس لئے نہیں کہ میں خود ڈر
 کر جھک جاؤں میں تم جیسوں کو اپنے پاؤں میں
 جھکانے آیا ہوں۔“

”کہا تھا ناں..... میرا نام انپکٹر سجاد اس لئے نہیں کہ میں خود ڈر کر جھک جاؤں..... میں تم جیسوں کو اپنے پاؤں میں جھکانے آیا ہوں..... نادان تھا جو میری بات نہیں مانا۔ اگر مانی ہوتی تو ابھی زندہ ہوتا۔“ کسی نے پیچھے سے زور سے انپکٹر سجاد کے سر میں لٹھی رسید کی..... لٹھی اتنی قوت سے باری گئی تھی کہ وہ سر کے ساتھ ٹکرانے کے بعد ٹوٹ گئی تھی..... انپکٹر نیچے گرا..... چوتھا اور آخری شخص پیچھے موجود تھا۔ ”اب تجھے پتا چلے گا کہ ڈر اور خطرہ کیا ہوتا ہے..... انپکٹر۔“ چوتھے شخص نے کہا۔

موتی وہ فوراً اپنے ہمراہ دو کاشیبل لے کر سٹی اسپتال روانہ ہو گیا۔

سٹی اسپتال پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ کاشیبل راشد واقعی ہی میں شدید زخمی حالت میں تھا بہر حال بروقت علاج معالجہ کی وجہ سے وہ خطرے سے باہر تھا۔

”راشد یہ کیسے ہوا۔“ انجیکٹر سجاد نے کہا۔

”ان باتوں میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ کوئی ایک ڈیڑھ برس میں کتنی ہی حسین اور نوجوان لڑکیاں عورتیں، کال گرلز، ماڈلز اور طوائف پراسرار طور پر غائب، لاپتہ اور گم ہوتی رہی کچھ کا تو نام و نشان اور سراغ نہیں ملا۔ اور جو بھی اغوا ہوئیں وہ بھی اغوا ہوئیں جب وہ اپنے اپنے کام میں مشغور ہو چکی تھیں اور جو ملی وہ مردہ نہایت بھانک حالت میں حویلی کے اندر یا باہر۔۔۔ اس کے متعلق طرح طرح کے قصے اور کہانیاں مشہور ہیں۔۔۔ کسی بدروح، چڑیل کا قصہ بکواس اور من گھڑت ہے۔۔۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سب کے پیچھے کوئی شیطان صفت شخص پس پردہ موجود ہے۔“ انسپکٹر سجاد اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنے سینئر اے ایس پی اسلم یار خان کو کیس کے متعلق بتا رہا تھا۔

”لیکن وہ صرف نہایت حسین، پرکشش دو شیرازوں چاہے وہ طوائف ہوں، سپر ماڈل یا لڑکیاں انہیں ہی کیوں اغوا کرتا ہے؟ کیا کوئی خاص بات۔۔۔ ہاں بھئی کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟ سمجھے۔ انسپکٹر سجاد۔“ اے ایس پی اسلم یار خان نے کہا۔

”Yes Sir“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔
”اب جاؤ۔۔۔ اور کیس کو حل کر کے ہی مجھے اپنی شکل دکھانا۔۔۔ تمہیں اندازہ ہے۔۔۔ کہ میڈیا والے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں، میں تمہیں تین دن کا ٹائم دے رہا ہوں۔۔۔ اس کے بعد یہ کیس تم سے لے لیا جائے گا۔“ Understand

”Yes Sir“ اور انسپکٹر سجاد واپس اپنے آفس آ گیا۔

ایک بار پھر انسپکٹر کے موبائل کی بیل بجی۔
”ہیلو۔۔۔ انسپکٹر سجاد اسپیکنگ۔“

”کیسے ہو دوست۔۔۔؟ یہ آواز توسنی ہی ہوگی۔“

انسپکٹر سجاد کے چہرے پر مسکراہٹ قہقہے کرنے لگی۔
”میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اپنی سٹا میرے

یار۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔ یار طاہر آج کل تیری بڑی یاد آتی ہے پہلے تو تمام کیسز حل کر کے حل کرتے تھے پر اب۔۔۔“ انسپکٹر سجاد نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”Its ok“ تمہیں بتا تو چل چکا ہوگا کہ میرا ٹرانسفر دوبارہ تمہارے قہارے ہو گیا ہے۔۔۔ میں راستے میں ہوں۔۔۔ بس پہنچ گیا۔۔۔ ویسے پہنچنا تو مجھے صبح 9 بجے تھا لیکن لیٹ آنا اور صبح آنا میری فطرت میں ہے۔“ طاہر نے کہا۔

ابھی وہ دونوں موبائل پر باتیں کر رہے تھے کہ اے ایس پی آئی طاہر انسپکٹر سجاد کے آفس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ انسپکٹر سجاد کو بھی اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی پلٹا۔۔۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے یہ دونوں ایک انسپکٹر اور دوسرا اے ایس پی آئی ہونے کے علاوہ بچپن کے دوست تھے دونوں کی دوستی بہت گہری تھی۔

اس کے بعد انسپکٹر سجاد نے اے ایس پی آئی طاہر کو حسین لڑکیوں کے قتل کے متعلق بتایا۔۔۔ اور کاٹھیل راشد کے زخمی ہونے کے متعلق۔۔۔ اور یہ بھی بتایا کہ معلومات کے مطابق اب ملک فہیم انجم کے خاندان کا کوئی فرد اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اے ایس پی آئی طاہر اور انسپکٹر سجاد دونوں اس بات اکتفا نہیں کر رہے تھے اب بقول ان دونوں کہ وہ اکیلے پوری فوج کے برابر ہیں۔۔۔ کیونکہ جب وہ دونوں ایک ہو کر کام کرتے تو پھر۔۔۔ سفید دودھ سے سفید بال تک نکال لیتے۔۔۔ وہ دونوں دوستوں کی طرح رچے تھے کبھی ایک دوسرے کو سینئر، جو نیئر ہونے کا احساس نہیں دلاتے۔

رات کو اے ایس پی آئی طاہر اور انسپکٹر سجاد جیمز اور ٹی شرٹ میں ملبوس جنگلاتی علاقے کی طرف بلیک پاراڈو میں رواں دواں تھے بلیک پاراڈو جس سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی وہ آگے جا کر تین حصوں میں تقسیم ہو کر سامنے تاریک جنگل کے سینے میں پیوست ہو رہی تھی۔ چار سو میٹر سناٹے کا راج تھا۔ مگر جوں جوں پاراڈو جنگل کی طرف بڑھ رہی تھی اس کی تیز

رفتاری کی وجہ سے ایک زنائے دارا وار رفتہ رفتہ جنگل کی خاموشی میں ہل چل پیدا کر رہی تھی۔ جنگل میں سے ایک کچا راستہ اس قاتلہ حویلی تک جاتا تھا جس پر بے با آسانی گاڑی جاسکتی تھی طاہر نے گاڑی سیدھی حویلی کے سامنے کھڑی کی اور پھر وہ دونوں باہر آ گئے۔

دونوں کے ہاتھوں میں ریو اور موجود تھے اور وہ آہستہ آہستہ حویلی کے صدر دروازے کی جانب بڑھے دونوں نے ایک ایک ہاتھ سے صدر دروازے کا ایک، ایک پٹ کھولا اور اندر داخل ہو گئے ہر سوراخ کی کاراج تھا۔ مگر چاند کی ہلکی چاندنی میں توڑا بہت دکھائی دے رہا تھا وہ صحن سے گزر کر کمروں کی ایک لمبی قطار کے سامنے کھڑے تھے۔ درمیان میں راستہ تھا اور دونوں طرف کمرے تھے عین راستے کے درمیان میں انہوں نے ایک چھوٹی سی چنگاری دیکھی وہ دونوں تیزی سے چنگاری کی جانب بڑھے۔۔۔ جب پاس جا کر دیکھا تو وہ ایک سلاک ہوا سگریٹ تھا۔ جس میں ابھی توڑی چنگاری باقی تھی وہ دونوں الرٹ ہو گئے۔ سگریٹ اپورٹڈ براڈ انٹر فیشل اسموکنگ ون کلاس کا تھا۔ سگریٹ آسنے سامنے دو کمروں کے درمیان گرا ہوا تھا وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے کیونکہ سگریٹ اس کمرے کے زیادہ نزدیک تھا مگر اندر سوائے تھا تاریک کے کچھ نہ تھا انہوں نے ٹارچ سے جائزہ لیا اور فوراً سامنے کے کمرے میں داخل ہوئے اس کمرے میں بھی کچھ نہ تھا پھر انہوں نے تیزی سے تمام کمرے چیک کئے۔ مگر کوئی سوراخ نہ ملا۔

”پھر یہ سگریٹ۔۔۔ آخر کوئی تو یہاں آیا تھا۔“ انسپکٹر سجاد نے اے ایس پی آئی طاہر سے کہا۔
ابھی وہ واپس پلٹے ہی تھے کہ حویلی سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر واپس راوند ہو گئیں کہ۔۔۔ پیچھے سے۔۔۔ ہا۔۔۔ کی آوازیں آنے لگی۔۔۔ اور یہ آوازیں عین اسی کمرے سے آ رہی تھیں جس کے باہر سگریٹ پڑا ہوا تھا وہ دونوں ایک لمحے میں پلٹے

اور ریو اور سیدھے کمرے کے دروازے پر تان کر کمرے کی جانب بڑھے اس سے پہلے کہ وہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچے۔۔۔ دروازہ ٹوٹ کر سامنے کے کمرے کے دروازے سے جا لگا۔۔۔ کسی نے اندر سے زوردارا ت رسید کی۔

”او۔۔۔ میرے۔۔۔ خدایا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا۔۔۔ اتنی حسین۔۔۔ اور اتنی بھیاں۔۔۔ اے ایس پی آئی طاہر نے انسپکٹر سجاد سے کہا۔

”اپنے حواس پر قابو پاؤ۔۔۔ یہ معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اسی نے کاٹھیل راشد کو شدید زخمی کر دیا تھا۔۔۔ میں نے تمہیں ان دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔۔۔ یہ بہت طاقت ور ہے۔“ انسپکٹر سجاد نے اے ایس پی آئی طاہر سے کہا۔

لڑکی بھیاں تک حالت میں کسی بھیاں تک قاتل سے کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے منہ سے سرخ جھاگ نما خون ٹپک رہا تھا۔۔۔ کپڑے چند ایک جگہ سے بچے ہوئے تھے اور وہاں زخم تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ ہاتھوں کے ناخن لمبے نوکیلے ہو چکے تھے۔ بال بکھرے ہوئے۔۔۔ مگر ان سب کے باوجود۔۔۔ وہ بلا کی حسین تھی۔۔۔ نہایت ہی حسین و شیزہ۔ اب دونوں اسے اور وہ ان دونوں کو گھور رہی تھی۔ جیسے حملے کے لئے خود کو تیار کر رہی ہو۔

”لڑکی خرائی۔۔۔ اور تیزی سے دوڑی۔۔۔ طاہر نے گولی چلا دی۔۔۔ گولی سیدھی اس کے سر میں لگی۔ لڑکی ہوا میں اچھل اور زمین پر گری۔۔۔ مگر اس کی غراہٹ قائم تھی۔۔۔ اور وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھتی۔۔۔ انسپکٹر سجاد نے پہلے ایک سر میں اور پھر دوسری اس کے دل کے مقام پر ماری۔۔۔ اب وہ وہاں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ انہوں نے گاڑی سے کچھ چھوٹے پلاسٹک کورنگالے اور انہیں پھاڑ کر لڑکی کو ان میں لپیٹ دیا۔۔۔ اور پھر گاڑی تھانے کی طرف رواں کر دی۔ تھانے پہنچنے کے بعد لڑکی کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا اب

انتظار پوسٹ مارٹم رپورٹ کا تھا جو کہ صبح آنی تھی۔

☆ ☆ ☆

انسپکٹر سجاد اپنے آفس میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے ٹیبل پر اس بلیک فائل صف خونی آدم خور کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑی تھی۔ اور سامنے کی کرسی پر اے ایس آئی طاہر بیٹھا پوسٹ مارٹم فائل کو تک رہا تھا۔

”یار کھولیں اس رپورٹ کی فائل کو۔“ اے ایس آئی طاہر نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ چلو کھولتے ہیں۔ آخر چیک تو کریں کہ۔۔۔۔۔ وہ لڑکی اتنی خوشنور کیسے اور کیوں ہو گئی۔؟“ انسپکٹر سجاد نے کہا۔ انسپکٹر سجاد نے رپورٹ کی فائل کھولی اور پھر دونوں اسے پڑھنے لگے۔

”Zombies۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔ ایسی بیماری ہے جو کتوں کے کانٹے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر انسان کی سوچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر اسے کچھ یاد رہتا ہے۔۔۔۔۔ تو وہ صرف۔۔۔۔۔ خون گوشت دوسروں کو کاٹتا۔ انہیں اپنا شکار بناتا۔ یہ کتے کے کانٹے کے بعد بروقت طبی علاج نہ کروانے کی وجہ سے جنم لیتی ہے اور اس سے پہلے جتنی اموات ہوئی تھیں جن کی لاشیں حویلی کے اندر یا باہر سے ملی ان پر موجود نشان اسی لڑکی کے ہاتھوں اور دونوں کے تھے۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ اسی نے دنیا بآب قاتل بھی کیا تھا۔ یہ باتیں اس پوسٹ مارٹم رپورٹ سے صاف ظاہر ہیں۔“ انسپکٹر سجاد نے اے ایس آئی طاہر سے کہا۔

”گروہو جاشروع۔۔۔۔۔ ارے ہمیں کیا۔۔۔۔۔ کیس حل ہو گیا۔۔۔۔۔ اب اس حویلی میں کوئی لاش، کوئی موت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ چلو آؤ۔۔۔۔۔ اے ایس آئی صاحب کو بتاتے ہیں“ طاہر نے سجاد کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

اے ایس آئی اسلم یارخان نے دونوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے گریڈ بڑھانے کے لئے اپنے

سینئرز سے بات کرنے کے لئے میٹنگ کا انتظام کیا لیکن اس سے پہلے اے ایس آئی نے میڈیا کو بلا دیا اور کیس کے متعلق انفارمیشن دی۔

اس بات کا علم نشا کو بھی ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ سو اس نے انسپکٹر سجاد کو کال کی۔۔۔۔۔ وہ اس کی بے حد شکر گزار ہو رہی تھی جبکہ انسپکٹر سجاد کا کہنا تھا کہ اس نے تو بس اپنا فرض نبھایا ہے مگر نشا نے اس کو ہر صورت رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ جس کے لئے انسپکٹر سجاد کا دل نہ کر سکا۔

انسپکٹر سجاد دس بجے نشا کے گھر موجود تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اتنی بڑی عظیم شہرت کی مالک سپر ماڈل آج رات دس بجے کچن میں موجود خود کھانا تیار کر رہی تھی۔ اور اس نے تمام لوگوں کو شام سے ہی چھٹی دے دی تھی۔ یہاں تک کہ۔۔۔۔۔ مین گیٹ کھولا۔۔۔۔۔ تو صحن کے سر اے کو دیکھ کر انسپکٹر سجاد کی جودت جواب دے گئی تھی لیکن پھر اس نے خود کو سنہیال لیا گاڑی سے نکلنے کے بعد رسی ہیلو۔۔۔۔۔ ہائے کے بعد وہ اسے گھر کے اندر لے گئی۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد گھر کے اندر داخل ہونے تک اس مخصوص مختصر راستے کو کافی محنت سے آراستہ کیا گیا تھا اور کمرے کی آرائشی کا جواب نہیں تھا۔

”مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ آپ جیسی عظیم شہرت یافتہ سپر ماڈل نے ایک انسپکٹر کے لئے آج خود اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا ہے۔۔۔۔۔ تکلف کیا آپ نے۔۔۔۔۔ آپ اتنی آزاد طبع ہیں پھر بھی۔۔۔۔۔ اتنا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔ کسی نوکر سے کہہ دیا ہوتا۔“ انسپکٹر سجاد نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد ٹیبل پر پڑے قیمتی برتنوں میں موجود کھانے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”آپ ایک آزاد شخص ہیں اور ویسے بھی جو کام آپ نے ہمارے لئے کیا ہے اس کا اشارہ اس کی آثار حنا دیکھ کر جان بوجھتا تو بنتا ہے اور ویسے بھی بچی بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ سے بات کرنے کا دل کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بس ایسے ہی۔“ نشا نے کہا۔

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ لیکن

پھر بھی کبھی کبھی وہ کرسی سے اٹھ کر ڈیش آگے کر دیتی۔ ”یہ چیک کر لیں۔۔۔۔۔ ہاں یہ بھی کھالیں۔۔۔۔۔ میں نے خاص آپ کے لئے بنائی ہے۔“ اور انسپکٹر سجاد حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس حسین پاکرہ کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا کہ۔۔۔۔۔ سجاد۔۔۔۔۔ اتنی عزت تو بھی۔۔۔۔۔ اپنے گھروالوں نے نہیں دی تھی مجھے کے سینئرز نے بھی اور یہ اتنی خوب صورت لڑکی مجھے پلوں پر بیٹھا رہی ہے۔ اصل میں سجاد کو بھی زندگی میں اتنی ہی خوب صورت اور ذہین لڑکی کی تلاش تھی جو اس کی زندگی میں آئے اور پھر اس کی زندگی مٹھی، کسی سوئیٹ کی طرح ہو جائے کیونکہ اب وہ بھی اس دنیا میں نشا کی طرح اکیلا ہی تھا اب وہ چاہتا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لے۔ کیونکہ یہ قدرت کا قانون ہے کہ کوئی انسان ساری زندگی اکیلا نہیں رہ سکتا اسے ہر لمحے ہر بل کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی زندگی میں رنگ بھر دے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ اور حویلی کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ انسپکٹر سجاد بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح اس آدم خور کا خاتمہ کیا۔ اور وہ کتنی باندھے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کئے اس کی آواز کے سحر میں کوئی ہوئی تھی کہ اچانک انسپکٹر سجاد نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”نشاجی کدھر گم ہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں میں تو بس غور سے آپ کی باتیں سن رہی ہوں۔۔۔۔۔ اصل میں جب کسی کو اس جیسا کوئی دوست مل جائے نا جو اسے سمجھ سکے تو پھر دوست یہی کہتا ہے۔۔۔۔۔ اوئے کدھر گم ہو۔۔۔۔۔ مجھے کھور کھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔ میں اصل میں اتنی بھیڑ کے ہوتے ہوئے بھی تجلیہ کی شکار تھی۔ شوبز کی دنیا میں ہر کوئی بس اپنے فائدے کی خاطر دوسروں سے تعلقات رکھتا اور بناؤنی مسکرانہ۔۔۔۔۔ بس یہ معمول ہے اور جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔۔۔۔۔ میں اندر

سے جاگ گئی ہوں۔۔۔۔۔ سب کچھ۔۔۔۔۔ سب کچھ اچھا سا لگنے لگا ہے۔“ نشا نے کہا۔

”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں نا۔۔۔۔۔ کہ ہم دونوں اس تفاوت کو مٹا دیں۔“

”کیا۔۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ میں ایسا ویسا تھوڑی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔۔۔۔۔ پلیز ذرا کھل کر کہو نا۔۔۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے کہا۔۔۔۔۔ ذرا پھر سے کہو۔۔۔۔۔ اب وہ کرسی پر سے اٹھی اور انسپکٹر سجاد کی کرسی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔“

”وہ۔۔۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ انسپکٹر صاحب پولیس۔“

”وہ۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر آپ نے کھانا بنایا تھا۔۔۔۔۔ وہ بہت لذیذ تھا۔“

”وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔۔۔۔۔ پلیز آپ وہ پولیس نا۔۔۔۔۔ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کہہ رہے تھے وہ کیا تفاوت؟“

انسپکٹر مکمل طور پر ذرا ہوا تھا وہ بھی صرف ایک لڑکی سے جو کبھی اکیلا دشمنوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے تھا۔۔۔۔۔ آج ایک لڑکی کے سامنے خود کو اتنا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

”اصل میں بات یہ ہے۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کو دوست بنایا ہی نہیں۔۔۔۔۔ کاش آپ یہاں ہم دونوں کے ساتھ ایک تیسرا ہوتا۔۔۔۔۔ تو وہ ضرور میری بات آپ کو سمجھا پاتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ تیسرا کون۔۔۔۔۔؟“

”ارے۔۔۔۔۔ تیسرا میرا بچپن کا دوست اے ایس آئی طاہر اور کون۔۔۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔۔۔ جو بات آپ مجھے سمجھانا نہیں رہے وہ آپ کی طرف سے آپ کا دوست مجھے سمجھتا۔۔۔۔۔“

بدھو۔“

”کیوں نہیں ایسا کروں..... کہ سیدھی اے ایس آئی طاہر کے پاس چلی جاؤں..... وہ آپ سے بہتر سمجھا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ پارٹ ٹائم میٹھیٹک کا ٹیچر ہے..... اور لگتا ہے..... آپ کو میٹھیٹک آتا ہی نہیں ہے۔“

”ارے نہیں..... نہیں..... ایسا کچھ نہیں ہے..... میٹھیٹک کہاں سے ہم دونوں کے بیچ میں آ گیا۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں..... کہ اس وقت ہم دونوں کے بیچ میں طاہر کہاں سے آ گیا۔“

”لگتا ہے آپ سے کچھ نہیں ہوگا..... میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں.....“ وہ تیزی سے اٹھی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

”کمرے میں بیٹھ کر وہ بیڈ کے قریب کھڑی تھی..... کہ اسے احساس ہوا انیکٹر سجاد اس کے پیچھے ہی کھڑا ہے۔“

وہ چلتی..... وہ واقعی وہیں موجود تھا۔

”میرے ساتھ بھی پہلے ایسا نہیں ہوا..... بہر حال اب بتا ہی دیتا ہوں..... ہمیں یہ فاصلے اب مٹا دینا چاہئے.....“ اور پھر اس نے جھٹ سے اس کے ہونٹوں پر ایک بوسہ دے دیا۔

”میں بھی تو یہی چاہتی ہوں..... ناں.....“

”جواب میں اس نے بھی اسے ایک بوسہ دے دیا۔“

”انیکٹر سجاد تھوڑا آگے بڑھا اور نشانے اسے کار سے پکڑ کر..... خود کو بیڈ پر گرالیا۔ اور وہ دونوں گناہوں کی دلدل میں دھستے چلے گئے۔“

”مجھ کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی کی وجہ سے نشا جاگ اٹھی اس نے سجاد کی جانب دیکھا وہ بھی بیدار ہو چکا تھا دونوں فریٹش ہوئے اور اس کے بعد ناشتہ کیا اور ساتھ ہی دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔“

”نشا رات کو جو کچھ بھی ہوا میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا..... بس ہو گیا۔“ انیکٹر سجاد نے سب کے

جوں کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”Its ok۔ اس میں میرا بھی برابر کا قصور ہے جو کچھ ہوا ہم دونوں کی مرضی سے ہوا۔“ نشانے بریڈ پر جام لگاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں شادی کر لینی چاہئیں کیونکہ یہی دستور العمل ہے۔“ سجاد نے کہا۔

”میں بھی تو یہی چاہتی ہوں..... اور ویسے بھی اس نشا سے تھک چکی ہوں..... میرا اصل نام حنا شہریار ہے اور اب مجھے حنا سجاد بننا ہے۔ تم مجھے نام دو گے نا..... میں اب شو بیز کی دنیا کو خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔“

”میں تو تمہیں اپنا چکا ہوں..... بس اب صرف دنیا والوں کو بتانا ہے۔“ سجاد نے کہا۔

اس کے بعد وہ آفس روانہ ہو گیا جہاں پر پہلے سے ہی اس کا جگری دوست اے ایس آئی طاہر انتظار میں تھا۔

”یار میں تیرا کب سے انتظار کر رہا ہوں۔“ سجاد کے آفس پہنچتے ہی طاہر نے کہا۔

”یار نا تم پر پہنچ گیا ہوں..... آج تم اتنی جلدی کیسے؟“

”یاد ہے تمہیں وہ دن..... جب ہم کوئی کیس حل کرتے تو اس کے بعد..... پھر کہاں جاتے تھے.....“

وہیں..... یار..... مزہ آئے گا..... شباب..... ناچ گانا۔“

”نہیں یار اب نہیں..... ارے چلو نا.....“

اور پھر..... دونوں روانہ ہو گئے۔

وہ دونوں جان بانو کے ہاں موجود تھے بانو مشہور طوائف حسن کا اعلیٰ شاہکار 23-24 سالہ چلتی پھرتی حسن کی دیوی ان سے مخاطب تھی۔

”20 سال کی تھی نا چنانچہ شروع کیا تھا..... تب تم لوگ اکثر آ جایا کرتے تھے..... میں بھی تب ہی تھی.....“

مگر اب میری شہرت دور دور تک ہے..... مگر میں تم دونوں کو بھولی نہیں۔“ جان بانو نے آداب کے بعد عرض کیا۔

خونفاک کہانیاں 208 اپریل 2018ء

”بس کچھ معذرتیں تمہیں اس لئے تقریر یا تین چار سالوں بعد حاضر ہوئے ہیں سوچا آج ذرا بانو کے جلوے ہی دیکھ لیں۔“ طاہر نے مسکراتے ہوئے آنکھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”آج کل آپ دونوں کی اخباروں میں بڑی چرچہ ہو رہی ہے..... سنا ہے کوئی اہم کیس حل کیا ہے۔“

”ہاں.....“ کافی اہم تھا اور تم تو جانتی ہو کہ ہم پرانے شکاری ہیں۔“

”اس دوران میری بھی کچھ دوست غائب ہوئیں اور کچھ پتا نہ چلا۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”وہ انسانوں کا شکاری تھا..... حسین اور بے حد پرکشش نوجوان اور نازک اندام دوشیزاؤں کا.....“ بانو نے سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور اس کے بل کھاتے نیلگوں دھوئیں گوند سے خارج کرتے ہوئے کہا۔

”ذرا کھل کر بتاؤ..... کون سا شکاری.....“

”ہم بھی دیکھیں کہ زیادہ بڑا شکاری وہ تھا یا ہم ہیں.....؟“

”جس حویلی میں تم لوگوں نے آپریشن کیا ہے کسی زمانے میں اس حویلی کے مالک شہریار کی جنیم انجم سے تھی ان دونوں کے مرنے کے بعد شہریار کی بیٹی نشا تو شہر جا کر سپر ماڈل بن گئی..... اور اس دوران ملک جنیم انجم کا ایک بیٹا سہیل انجم لندن سے سائنس بن کر لوٹا میڈیکل کے شعبہ سے اس کا تعلق تھا وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا..... اور گاؤں والی حویلی میں جس میں وہ مقیم تھا جو اس کے باپ کی تھی..... لڑکیاں منگواتا تھا..... وہ ناچ گانے کا بڑا شوقین تھا..... لیکن رفتہ رفتہ وہ پاگل ہو گیا..... یہاں سے جو لڑکیاں اس کے پاس جاتی وہ واپس نہ آتی..... اور کچھ دنوں بعد ان کی لاشیں اسی بھیا تک حویلی کے باہر ملتی..... جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتا کہ لڑکیاں تو یہاں آتی ہی نہیں..... آس پاس کے لوگوں نے کہا..... کہ یہ لڑکا

پاگل ہو چکا ہے..... دراصل اس نے لڑکیوں پر تجربے شروع کر دیئے تھے..... گاؤں والوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرادی..... لیکن وہ اچانک کہیں غائب ہو گیا..... اس کا کچھ پتا نہ چلا..... سگریٹ وہ بھی یہی انٹرنیشنل اسموگ کلاس دن پیتا تھا تم لوگوں نے جو کی حل کیا ہے وہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے..... بس آپ لوگوں کو دیکھ کر یاد آ گیا۔“

”او..... شٹ.....“ انیکٹر سجاد نے کہا۔

”کیا ہوا.....“ طاہر بولا۔

”وہ زندہ ہے..... کیس ابھی حل نہیں ہوا..... تمہیں یاد ہے ہم نے جو حویلی میں سلگتا سگریٹ دیکھا تھا وہ کس کمپنی کا تھا.....“ سجاد نے کہا۔

”انٹرنیشنل اسموگ کلاس دن.....“ طاہر چلایا۔

”ہمیں جلد از جلد اسلحہ لے کر نفری کے ساتھ حویلی ریٹ کرنا ہوگا..... وہاں پر ضرور کوئی خفیہ تہ خانہ ہے۔“

”شکر ہے جان بانو یہ لو.....“ طاہر نے اس کے ہاتھ میں پیسوں کی ایک گڈی دی اور وہ دونوں وہاں سے جلدی نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

”چلو جلدی اس کمرے کی جانب..... جہاں وہ لڑکی دیکھی تھی..... ضرور وہاں کوئی سراغ ہوگا.....“ انیکٹر سجاد نے اے ایس آئی طاہر سے کہا اور اس نے اپنے پیچھے موجود کمپنی کا ٹیشیل اے ایس آئی طاہر کی ہدایت پر ایک کاشٹیل نے لات مار کر کمرے کا دروازہ توڑ ڈالا..... اندر اندر جھرا تھا..... کاشٹیل اندر داخل ہوا..... ابھی وہ اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک وہ اندر سے اڑتا ہوا سامنے کی دیوار پر جا لگا اس کا رخا گٹ چکا تھا..... گلے سے گرم گرم سرخ خون تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا..... ساتھ ہی اندر سے ایک حسین خونی دوشیزہ نے جھلانگ لگا کر دوبارہ کاشٹیل پر حملہ کرنا چاہا..... جیسے ہی اس نے

خونفاک کہانیاں 209 اپریل 2018ء

چلا تھک لگائی..... کھلے ہوئے منہ اور کانٹیل پر گرے
ہی والی تھی کہ اے ایس آئی طاہر نے فوراً گولی
چلا دی..... گولی سیدھی اس کے منہ میں لگی.....
اور دوسری جانب سے باہر نکل گئی..... وہ وہی ڈھیر
ہو گئی..... کمرے کے اندر فرش سے زمین ایک جگہ سے
سر کی..... اور وہاں سے ایک اور لڑکی باہر لگی جو نہایت
غضب ناک آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی..... وہ
ان کی جانب بھاگی اور انسپکٹر سجاد کے پاس کھڑے
کانٹیل نے ایک اور فائر کیا اور وہ بھی وہی ڈھیر
ہو گئی..... پھر اس تہہ خانے سے کوئی باہر نہ آیا تو انسپکٹر
سجاد کی ہدایت پر تمام کانٹیل تہہ خانے کے اندر داخل
ہو گئے.....

آگے سے ان پر پانچ آدم خور آدمیوں نے حملہ
کر دیا وہ بہت طاقت ور تھے..... ان آدمیوں کی
حالت بھی لڑکیوں جیسی ہی تھی..... کپڑے جگہ جگہ سے
پھٹے ہوئے تھے اور وہاں زخم تھے..... جن سے خون برس
رہا تھا..... منہ سے سرخ رنگ کی جھاگ نکل رہی تھی
لیکن وہ طاقت میں لڑکیوں سے زیادہ طاقتور تھے.....
دیکھتے ہی انہوں نے پولیس کانٹیل پر حملہ کر دیا..... چشم
زدن میں پانچ پولیس کانٹیل کے گلے چر بھاڑ ڈالے
..... وہ وہی ٹوپ کرٹھنڈے ہو گئے..... ہاتھوں نے
اپنے اسلحہ کے منہ کھول دیئے..... پانچوں کو گولیوں
سے پھینچ کر دیا اور آگے بڑھے..... آگے ایک کمرہ
تھا..... جو خالی تھا اور اندر سفید بلب روشن تھا آگے
جانے کا راستہ بھی وہی سے تھا..... باقی کانٹیل نے
پہلے چیک کیا اور پھر اندر داخل ہو گئے..... کمرے میں
چھ کمرہ آگے بڑھنے ہی والے تھے..... کہ بلب بندھ
ہو گیا..... اور اندر عجیب قسم کی گیس خارج ہونے
لگی..... وہ کمرے کے دروازے کی طرف بھاگے
مگر دروازہ بند ہو چکا تھا ان کے لئے سانس لینا مشکل
ہوتا جا رہا تھا..... انہوں نے دروازہ توڑنے کے لئے
فائر کئے مگر وہ بولٹ پروف تھا گیس اتنی زہریلی تھی کہ
کانٹیل کے جسم کا ماس گلنے لگا..... اور انہوں نے دیں

ٹوپ ٹوپ کر جان دے دی.....

اے ایس آئی طاہر اور انسپکٹر سجاد حویلی کے باقی
کے کمرے چیک کر رہے تھے..... کہ سجاد نے طاہر سے
کہا..... کہ وہ نیچے تہہ خانے میں جائے اور وہ اکیلا باقی
کا ایریا چیک کر کے آتا ہے..... کہ کہیں کوئی خونی آدم
خور صفت درندہ حویلی سے باہر نہ چلا جائے.....

اے ایس آئی طاہر تہہ خانے میں داخل
ہو کر آگے بڑھ رہا تھا..... آگے میڈیکل لیب تھی.....
وہ اندر داخل ہو گیا..... سامنے ایک کرسی پر حنا شہر یار
رسیوں سے بندھی تھی طاہر کرسی کی طرف بڑھا آگے
پچھے کوئی نہ تھا حنا کے منہ پر ٹیپ چپکا دی گئی تھی وہ
رسیاں کھول رہا تھا کہ حنا..... او..... ہوں.....
..... وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھی..... طاہر نے
اس کے منہ پر سے ٹیپ اتارنے ہی لگا تھا..... کہ.....
کسی نے پیچھے سے زوردار لوہے کی راڈ طاہر کے سر کے
پچھلے حصے پر دے ماری..... اس کا ذہن تاریکیوں میں
ڈوبنا چلا گیا.....

”غلط بندے سے بچا لے لیا..... جبرت ناک
موت دوں گا..... تم دونوں کو..... اور تمہارا تیسرا ساتھی
وہ انسپکٹر ابھی تک تو ہمیں ہموں ہو چکا ہوگا..... میں نے اس
کی طرف اپنے دو بہترین زہریلے جانور بھیجے ہیں وہ
ابھی واپس آ رہے ہوں گے پھر تم لوگ بھی اسی کے
پاس پہنچ جاؤ گے..... اچھے خاصے دونوں پولیس میں
ہو..... عیاشی کرتے..... اور تم سپر ماڈل ہو..... اس
پرانی بوسیدہ حویلی کو کیا کرنا تھا تمہیں..... مجھے زہریلی
سائنس سے پیار ہے..... عشق ہے..... لوگوں پر تجربے
کر کے ان میں سانپوں، کتوں..... اور طرح طرح کے
زہریلے جانوروں کی خصوصیات پیدا کرنے
اور پھر انہیں اپنے کنٹرول میں رکھنے میں مزہ
آتا ہے..... سکون ملتا ہے..... مجھے..... اور تم تینوں مل
کر میرا سکون چھیننا چاہتے ہو؟“ سینیٹل نے کہا.....

”تم جو کرتے رہے ہو اور کر رہے ہو..... اس کی
تمہیں سزا ضرور ملے گی..... تم انسانیت کے خلاف

ہو..... تم قدرت کے خلاف کام کر رہے ہو..... اس
لئے تم غرق ہو جاؤ گے..... بہتر یہی ہے کہ
سرخڑ کر دو..... اور ہمیں کھول دو..... کیونکہ تمہارا بچنا
مشکل ہے..... اور ناممکن بھی..... کیونکہ وہ بہت جلد
تمہیں مار دے گا..... وہ آ رہا ہے..... تمہاری موت
”رسیوں سے بندھے ہوئے طاہر نے کہا.....

”ہا ہا ہا..... کون آئے گا..... کیسے آئے گا.....
کہاں سے آئے گا..... کب آئے گا..... بلاؤں
اسے.....؟“ سینیٹل نے غصے سے غراتے ہوئے کہا.....
”وہ کوئی ٹرین یا بس نہیں جس کے آنے کا نام
ہو.....“

”طوفان بلانے پر نہیں آتا..... اپنی مرضی سے
آتا ہے اور تباہی مچاتا ہے..... تو اس کے تہ سے بچ
نہیں پائے گا اسی ہے تیری موت..... میری بات
مانو اور سرخڑ کر دو..... کیونکہ جب تم جیسوں کی موت
آتی ہے تو وہی آتا ہے“ طاہر نے کہا.....

”کون آتا ہے.....؟ جلدی نام بتاؤں ورنہ
میں اپنے کتوں کے آنے سے پہلے ہی تمہیں مار دوں
گا“ سینیٹل انجم نے کہا.....

”انسپکٹر سجاد میرا دوست..... وہ خطروں سے بھی
زیادہ خطرناک ہے..... آ رہا ہے تمہاری موت“

”لیکن اس وقت تم میرے قبضے میں ہو.....
اور یہ میرا ایریا ہے“ سینیٹل انجم نے نوک دار پتلی لوہے
کی راڈ اٹھائی اور بھاگ کر طاہر کی جانب بڑھا..... وہ
اسے طاہر کے پیٹ میں گھونپنے ہی والا تھا کہ..... کہ عین
نام پر کسی نے ریو اور کا بن دیا یا گولی سینیٹل انجم کے بازو
پر لگی اس کے ہاتھ سے لوہے کی راڈ جو بالکل طاہر کے
پیٹ کے قریب تھی اس کے پاؤں میں گر گئی.....

”ایریا کتوں کا ہوتا ہے..... شیروں کا نہیں.....
شیر اپنی مرضی سے آتا ہے اور تباہی مچاتا ہے“ سینیٹل
انجم نے گولی چلانے والے کی جانب دیکھا..... تو اس
پر ریو اور تانے انسپکٹر سجاد کھڑا تھا..... اس کے ایک بازو
پر گولی لگ چکی تھی..... وہ آدھا ناکارہ ہو چکا تھا.....

انسپکٹر سجاد نے اسے گرفتار کر لیا..... پھر اے ایس آئی
طاہر اور حنا شہر یار کو رسیوں سے آزاد کیا..... اور تھانے
روانہ ہو گئے..... تعینات کرنے پر پتا چلا کہ سینیٹل انجم
احساس کمتری، ہانگ پن کا شکار تھا میڈیکل سائنس
دان بننے سے پہلے اس کا کسی لڑکی سے چکر تھا..... لیکن
اس نے کسی اور سے شادی کر لی.....

سینیٹل انجم نے غصے میں آ کر اسے اور اس کے
شوہر دونوں کو شادی کی پہلی رات ہی قتل کر ڈالا..... وہ
اس لڑکی کے حادثے کی وجہ سے شروع میں بہت زیادہ
اپ سیٹ رہنے لگا..... اور رفتہ رفتہ اس نے وہ حادثہ اپنے
دل پر لے لیا..... پھر جب وہ مکمل سائنس دان بن گیا
تو اسے ہر خوب صورت ترین لڑکی میں اپنی دھوکے باز
محبوبہ دکھتی اور وہ اسے اغوا کر لیتا..... اسے اپنا غلام
بنالیتا..... کہ کہیں یہ لڑکی بھی اس کی محبوبہ کی طرح کسی
کو دھوکہ نہ دے..... وہ واقعہ اس کے دماغ پر مسلط
ہو چکا تھا..... اور مزید تعینات کرنے پر پتا چلا کہ جس لڑکی
کو یہ اپنی محبوبہ کہتا تھا..... اور بعد میں اس کا قتل
کر ڈالا..... دراصل وہ اس سے محبت کرتی ہی نہیں تھی وہ
جس سے پیار کرتی تھی اس نے اسی سے شادی کر لی.....
سینیٹل انجم زبردستی اس پر اپنا حق جتا رہتا تھا.....
دراصل اسے شروع سے ہی انسانی میڈیکل سائنس سے
گہری دلچسپی تھی اسے جنون کی حد تک شوق تھا.....
اور اس جنون کو حالات نے پائل پن سے بھی آگے
پہنچا دیا..... اور آخر کار اسے موت کی سزا سنائی گئی.....

”کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب ان
کے پاس تھوڑا بہت علم، دولت آ جاتا ہے تو وہ خود
کو دوسروں سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اپنی حیثیت بھول
جاتے ہیں کہ خدا نے انہیں کس مقصد کے لئے پیدا
کیا ہے کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط؟ انسان
خاک ہے خالی ہاتھ دنیا میں آتا ہے اور خالی ہاتھ ہی دنیا
سے جاتا ہے سوائے اپنے اعمالوں کے وہ یہ بھول
جاتا ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا افضل ہے۔“

☆☆

رنگ دھنک

آپ کی بیاض، پسندیدہ اشعار کا انتخاب

دیوانی سے کم نہ تھی کچھ اپنی جستجو
ہم بے وفا جہاں میں وفا ڈھونڈتے رہے
(اکرام اللہ - حیدر آباد)

پیار سے تم جب پیار مت کرو
جب تک پیار تم سے پیار نہ کرے
جب پیار تم سے پیار کرے
تو پیار کو اتنا پیار کرو
کہ پیار کسی اور کو پیار نہ کرے
(عدنان علی - لاہور)

اس نے ہم کو دیکھا تو خود کو چھپالیا
نجانے لوگوں نے اس کو کیا کیا سکھادیا
گھر بھی اس نے بنایا تو مسجد کے سامنے
اس کی یاد نے ہم کو نمازی بنادیا
(فلک زاہد - لاہور)

دفن ہوئے اس کے شہر کے قبرستان میں تو وہ رونے لگا خود
شاہد جو کہا کرتا تھا بالقریب ہی کوئی ٹھکانہ نہ ملنا آسان ہو
(شاہد رفیق - سکس روڈ والا)

ہم تو مجبور تھے تم سے جو دور تھے
پیار کرتے صنم تم کو ضرور تھے
پر کر نہ سکے تم سے اظہار ہم
ٹکے کرتے ادیس! تم تو مغرور تھے!!!
(ادیس نور - میرپور ماٹیلو)

رات کیا ڈھلی ستارے چلے گئے
غیروں سے کیا گلہ جب اپنے چلے گئے
جیت تو سکتے تھے باری بازی ہم بھی
پر اس کو جتانے کے لئے ہم ہارے چلے گئے
(شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہیار)

کچھ لوگ زندگی میں آتے ہیں بیٹھے بیٹھے
اپنا بنا کے دور چلے جاتے ہیں وہ ایسے

ہم ہی پیچھے رہ گئے وہ اڑ گئے ہم سے آگے
دور دے گئے دینے والے گلاب کو بیٹھے بیٹھے
(گلاب خان - سوگنی - راولپنڈی)

میرے سجدوں کے تسلسل کو تو کیا جانے تبسم
سر جھکایا تو غشی مانگی ہاتھ اٹھایا تو زندگی مانگی
(رابہ عباس - سیستی نئے والی)

دل کے گلشن سے محبت کے کنول لایا ہوں
اپنے دل کے کسی کونے میں گھورا کرلو
(سوج دین - کھنڈر سندھ)

ہمراہ تیرے پھول کھلاتی تھی جو دل میں
اب شام وہی درد سے خالی نہیں جاتی
ہم جان سے جائیں گے جیسی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی
(انتخاب: نادیا یاسین - کھنڈر سندھ)

عشق کی منزلیں دشوار کیوں ہیں
چہار سوں پھیلی ہوئی دیوار کیوں ہے
جس کو کبھی میری یاد تک نہیں آئی
مجھ کو اس کا ہی انتظار کیوں ہے
(انتخاب: افشیں ستار - کھنڈر سندھ)

ملا تھا ایک دل جو تمہیں دے دیا ساحل
ہزاروں بھی ہوتے تو تیرے لئے ہی ہوتے
(خضر حیات - روڈہ تھل)

بہت برا ہوں میں کہ کسی کا برا نہ کر پایا
وہ اس لئے کہ کبھی بد دعا نہ کر پایا
قصود وار ہوں آگے نکل گیا ہوں کہیں
میں لامکاں پر اکٹفا نہ کر پایا
(سنبل ماہین - سرگودھا)

خاک پر آنسو بہا کر کیا کریں
پتھر دل والوں کو آزما کر کیا کریں
دنیا والوں نے بے آرام کر رکھا ہے
اب تیری آرام گاہ میں آکر کیا کریں
(رابہ عباس - سیستی نئے والی)

☆☆

غزل

آپ کی پسندیدہ غزلوں کا انتخاب

تجھ سے دور رہ کے بھی ہم بھلا نہ سکے
تیرے تھے پھر بھی تجھے ہم اپنا بنا نہ سکے
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے آخر
ہم تاریکیوں میں پھر کوئی چراغ جلا نہ سکے
تجھ سے گلہ کیا کریں ہم تیری بے وفائی کا
گہڑے ہوئے حالات سے ہم پھر بھلا نہ سکے
لے تھے ہمیں بہت سے زخم تیری محبت میں
چیر کے شکستہ دل ہم یوں بھی تجھے دکھا نہ سکے
تیری یادوں سے دامن چھڑاؤں پھر میں کیسے
ایسے تھے تیری زلفوں کے ہم نظروں کو بچا نہ سکے
اس دیوانے دل کو میں کیا کروں پھر جاوید
دیران محفل میں پھر کوئی پھول کھلا نہ سکے
(محمد اسلم جاوید - فیصل آباد)

☆☆☆

یاد رکھنا تم میرے کچھ مہر کو
بھولنا مت مجھ پہ ڈھائے قہر کو
ہے سلام ہر وقت میرا فخر سے
نام دینے والے میرے شہر کو
کل پیا تھا حق پہ جو سقراط نے
آج ہی میں نے پیا اس زہر کو
عاشقی فرہاد پر ہے ختم بس
کس نے کھودا دودھ کی پھر نہر کو
اب بھی تم کو یاد کرتی ہوں بہت
کیوں دباؤں دل میں اٹھتی لہریں کو
راہ نکلتی تھی تمہاری میں لہریں کو
روز ہی تپتی ہوئی دوپہر کو
مجھ پر خانم رب کی رحمت ہے بڑی
بس خدا قائم رکھے اس مہر کو
(فریدہ خانم - لاہور)

تجویر شام ہجر کے سماں ہوئے تو ہیں
پلکوں پہ اہتمام چراغاں ہوئے تو ہیں
ان کی نگاہ شوخ میں اک بے رخی سہی
میری طرف وہ بزم میں مگراں ہوئے تو ہیں
پھر بام و در چمک اٹھے چہروں کے نور سے
تسکین اشتیاق کے سماں ہوئے تو ہیں
برسات تو ہمارے مقدر کی بات ہے
روشن ہوا پر ابر پریشان ہوئے تو ہیں
برپا ہے بھرے خانہ زنجیر کی صدا
شاید کہیں بہار کے سماں ہوئے تو ہیں
قمر ہو اپنے شعر سے گرما نہ سکے بزم
یہ بھی بہت ہے لائق یاراں ہوئے تو ہیں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری - ملتان)

☆☆☆

میرے شہر کے گلستاں میں گلی آگ کو بجھا دو
بچے ہوئے پھولوں کو جلنے سے بچا دو
ہر روز ہے اک نئی داستان خون میں ڈوبی ہوئی
قاتل کب تک رہیں گے نامعلوم اتنا تو بتا دو

کون مرا کس نے مارا پوچھتے ہیں لوگ آتے جاتے
تھک چکے ہیں ہاتھ لاشے اٹھاتے اٹھاتے
کب ختم ہوئی ظلم کی یہ سیاہ رات باہر
مجھے میرا پہلے والا شہر کراچی لوٹا دو

(بابر علی رند بلوچ - بھولے دی جھوک، ساہیوال)

☆☆☆

بیارا و دلکش ہے کونہ کا منظر
دھرتی نے اوڑھ لی سفید چادر
روٹی کے گالوں کی سی ہے برف باری
آنکھوں کو لگتی ہے بہت پیاری
ہلکی ہلکی ہوا بھی ہے در آئی
سردی کی لہر جسم میں اتر آئی
برف کے گولے بچے اچھال رہے ہیں
جسموں میں برف کو ڈھال رہے ہیں
برف باری کاہنہ میں ہے ظلم چھایا
پورا شہر یہاں آج اللہ آیا

ہر طرف ہے ٹھنڈا و خوب صورت سماں
ہر چہرہ ہے خوشی سے شادماں
(سائل ایڈو۔ ڈیرہ اللہ یار ملو چٹان)

☆☆☆

نہم پاس سے بلا سکے
ندول کی بات بتا سکے
وہ ہنسی ہنسی چل دیئے کہ
ہم ہاتھ تک نہ ملا سکے
یونگی سوچتی رہی دیر تک مگر
ہم اسے کچھ نہ بتا سکے
یہ مقام ہی تھا عجیب سا کہ
ہم خود کو کمی نہ بچا سکے
وہ جدا ہوا تو کچھ اس طرح
کوئی رسم تک نہ بھاسکے
اسے جانا تھا وہ چل دیا
اسے آج تک نہ بھلا سکے

(اقرابسم۔ بستی فتنے والی)

☆☆☆

ستارہ ہماری قسمت کا اس سے ملا ہی نہیں
وہ کیسے ہوتا ہمارا ایسا کبھی ہوا ہی نہیں
ہم نے اپنی ہر خوشی دوسروں میں بانٹ دی
کسی نے ہمیں کیا دیا یہ بھی سوچا ہی نہیں
باتوں باتوں میں محبت اس قدر بڑھ گئی
اسے اب بھول جائیں کیسے اتنا حوصلہ ہی نہیں
ہر کسی نے ہمیں مطلب تک پیار کیا
کوئی ہمسفر بن کر ساتھ چلا ہی نہیں
ہر کوئی میری چاہت کو مذاق سمجھتا رہا
دل میں ہے درد کتنا کوئی سمجھتا ہی نہیں
(شاہد رفیق سہو..... کیر والا)

☆☆☆

زندگی میں تو نہیں تو آرزو کس لئے
یہ محبت کس کے لئے یہ جستجو کس کے لئے
میں تجھے دیکھا کروں اور تو مجھے دیکھا کرے
یہ نہیں تو جان جانان روبرو کس کے لئے

ہر سجاوٹ جسم و جاں کی میں نے کی تیرے لئے
تو اگر ملتا نہیں تو رنگ و بو کس کے لئے
دلبری کے تیرے چہرے چاہے جا بجا میں نے سنے
تو اگر میرا نہیں تو یہ چاہت کس کے لئے
ہر غزل میں نے لکھی اسے جان جاں تیرے لئے
تو اگر سنتا نہیں تو گفتگو کس کے لئے
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ یار)

☆☆☆

ہم زبان میرے تھے مگر ان کے دل ایچھے نہ تھے
منزلیں اچھی تھیں مگر میرے ہمسفر ایچھے نہ تھے
جو خبر پہنچی یہاں تک، اصل صورت میں نہ تھی
تھی خبر اچھی، مگر اہل خبر ایچھے نہ تھے
ہم کو خوابوں میں نظر آتی تھیں کتنی خوبیاں
جس قدر ایچھے لگے تھے س قدر ایچھے نہ تھے
اسی لئے آئی نہیں مگر میں محبت کی ہوا
اس محبت کی ہوا کے شہر ایچھے نہ تھے
(سہیل مایین..... راولپنڈی)

☆☆☆

پڑے ہیں زندگی پر غم کے سائے
یہ فصل گل کہاں تک دل بھائے
وہ گل چینوں کے ہاتھوں ٹوٹے ہیں
گھڑی بھر کے لئے جو مسکرائے
ادا، اس کی بدلے موسموں سی
مزاج یار پہچانا نہ جائے
سنبھل جانا بہت مشکل ہے اس کا
نہ جب تک کوئی انسان منہ کی کھائے
میں جس کے ہر ستم کو سہہ رہا ہوں
مری باتوں پر وہ کیوں تمللائے
لرز جاتا ہے جھوٹا سو اسے
گھر وندے ریت کے جس نے بنائے
قر وہ وقت بھی آئے گا شاید
تری غزلیں بھی مٹکتائے
(ریاض حسین قر..... منگلا ڈیم)

☆☆☆

ہنستے ہوئے لوگوں کو دلانے والے بہت
چہرے پہ آنسو چھپانے والے بہت
ہم جن پر اعتبار بہت زیادہ کرتے رہے
مگر ان اعتباروں کو توڑنے والے بہت
جس طرح شیشہ ٹوٹ کر زخم دیتا ہے
شیشہ دل کو توڑ کر زخم دینے والے بہت
ہنستے ہوئے لوگوں کو دلانے والے بہت
(راہبہ عباس..... بستی فتنے والی)

☆☆☆

یہ دنیا کیسی دنیا ہے یہاں کسی سے کسی کو پیار نہیں
کہنے کو سب مسلم ہیں پر غیر مذہب جتنا بھی مان نہیں
جب چھوٹے تھے سب کہتے تھے ہیں پاکستان کا مستقبل
دل روٹی کے پیچھے پڑے ہیں سب بڑا پاکستان کی شان نہیں
کیا ایسا کیا ہے تم نے بڑے فخر سے کہتے ہو مسلم ہو
کیا قربانی دی اسلام کی خاطر اپنانے اللہ کے فرمان نہیں
ماں بہن سمجھا جاتا تھا آج ہوں بھری ہے آنکھوں میں
کیوں اتنی شیطانیت بھری ہے کیا اب رہے ہم مسلمان نہیں
کیا ہوا میری نوجوان نسل کو کچھ کرنے کا کیوں جذبہ نہیں
آج ہوں اور شوکت بھری ہیں ان میں گتے پاکستان کے جوان نہیں
گر ہوتے آج قائد اعظم تو روتے حالت وطن دیکھ کر
جو ہم نے دیا تھا اس قوم کو یہ اب وہ پاکستان نہیں
فرض مہایا اللہ کا یا ذمہ داری بھائی اس ملک کی
گر ہوتے ہم مومن تو آج ہوتے یوں پریشان نہیں
کیوں بے ہوش ہیں فرقوں میں کیوں قومیت کی خاطر لاتے ہیں
اگر ہماری قومیت ہے پاکستانی کیا اللہ اور ایک قرآن نہیں
کیوں ایسی باتیں کرتے ہو سب تم کو پاگل کہتے ہو
مانتا ہوں میں پاگل ہوں خود کہتا ہوں میں عرفان نہیں
(عرفان محمود۔ بدین ملز)

☆☆☆

یہ جلوہ نمائی کس کارن، دیوار اٹھائی کس کارن
اب سچ ہمارے دونوں کے ہے یار جدائی کس کارن
ہر لکھ نظر کے صحرا میں ہر ذرہ ہی مثل لیلیٰ ہے
مگر لوٹ چلو اب اے بھنوں، یہ حال سدا کی کس کارن
جب خواب جلتے تھے سارے، ہم بھی راگہ ہوئے جب جل کر

اب آنکھ کے ٹھہرے پانی میں، آگ لگائی کس کارن
جب عہد تمہارے کی شیریں، رسوں کے سندور میں ڈوبی
پھر کاٹ کے تو نے پتھر کو یہ نہ چلائی کس کارن
کب رہتا ہے سدا بندے نے جب دنیا ساری ہے فانی
دو دن کے لئے عامر، پھر تو نے عمر گنوائی کس کارن
(عامر زمان عامر..... پورے والا)

☆☆☆

مرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں
ہر شب تنہائی میں ستاتی ہیں تیری یادیں
لوٹ کر اب کبھی نہ آئے گا تیرے پاس
ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلاتی ہیں تیری یادیں
روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں
تیرا ٹیم لے کر تڑپاتی ہیں مجھے تیری یادیں
جب کبھی بچھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا
مجھ سے پوچھتے بغیر اسے چلائی ہیں تیری یادیں
فلک بھلانا چاہتا ہوں جس صورت کو
ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں
(فلک زاہد..... لاہور)

☆☆☆

کیوں ہے تو مجھ سے خفا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
کیوں ہے تو مجھ سے جدا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
بے وفا کہتا نہیں تو ہیں ہے اس میں تری
یار دوری کی وجہ، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
بس یہی ہے تم سے مرا سوال ہے جواب دو
کس جرم کی ہے سزا، کچھ تو بتا
کیا محبت کی عبادت میں صنم مجھ سے ہوا
فرض ہے کوئی قصا کچھ تو بتا کچھ تو بتا
وہ مری تقدیر میں تو نے لکھی ہے کہ نہیں؟
اے خدا تو ہی بتا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
تم کرو گے مجھ سے دھوکا یہ کبھی سوچا نہ تھا
یہ لہ کیسا ملا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
ہاں مجھے تو تو سے یہ امید ہی نہ تھی اولیں!
یہ اچانک کیا ہوا، کچھ تو بتا کچھ تو بتا
(اولیں نور..... میر پور ماحیلو)

☆☆☆

پراسرار ہستی

رزاق شاہد کوہلر - ڈیرہ اسماعیل خان

اس واقعے کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، ہر وقت عمر رفتہ کا خیال رہتا ہے، بابا کی ہر وقت یاد آتی ہے، مگر اب بابا نہ ہی خواب میں اور نہ ہی جاگتی آنکھوں سے کہیں نظر آتے ہیں۔

ان دنوں شہر کے تمام تعلیمی ادارے فسادات کی وجہ سے غیر معینہ مدت کے لئے بند تھے اور میرے پاس فراغت ہی فراغت تھی، اس فراغت کا بہترین مصرف میں نے یہ نکالا کہ سارا دن لمبی تان کر سویا رہتا تھا شام کو کارے کر دوستوں کے ساتھ گیارہ بارہ بجے تک گھومتا رہتا اور اس کے بعد صبح تک ایڈوچر پڑھتی موزن دیکھتا رہتا تھا۔ رات کا کھانا میں ہمیشہ دوستوں کے ساتھ کسی فائو اسٹار ہوٹل میں کھالیا کرتا تھا۔

امی ابو میری اس روٹین سے سخت تالاں تھے اور اکثر اوقات مجھے اس آوارہ گردی سے منع کرتے رہتے تھے مگر میں جوانی کے جوش میں ان کی کسی نصیحت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا ویسے بھی میں ان کی اکلوتی نرینہ اولاد تھا اس لئے وہ مجھ سے کسی قسم کی سختی وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ تاہم مجھے زبانی کلاسی ڈانٹ تقریباً ہر دوسرے روز سننا پڑتی تھی۔

مجھے سے بڑی ایک بہن تھی جو دو سال قبل بیاہ کر پادیس سدھار چکی تھی اور چھوٹی ابھی میٹرک میں زیر تعلیم تھی ابو ایک مشہور و معروف کنسرٹیشن کمپنی کے مالک تھے جس کا ہیڈ آفس لاہور میں جبکہ ذیلی برانچیں کراچی سے لے کر ہزارہ ڈویژن تک پھیلی ہوئی تھیں اس لئے ہمارے ہاں دولت کی ریل چل تھی گھر میں ایک جگہ تین تین نئے ماڈل کی گاڑیاں موجو درہتی تھیں خود میرے ذاتی اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے

جمع رہتا تھا اپنی کوئی بھی ضرورت پوری کرنے کے لئے میں جب چاہتا تھا بینک سے رقم نکالوا کرتا تھا۔ دوسرے دن ابو میرے اکاؤنٹ میں نکالی گئی رقم کا دو گنا جمع کرا دیتے تھے یہ سلسلہ اس وقت شروع کیا گیا تھا جب میں میٹرک کا طالب علم ہوا کرتا تھا۔

کہتے ہیں دولت کا نشہ سرچڑھ کر بولتا ہے اور اچھے خاصے شریف انسان کو دنوں میں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے مگر میں نے اس کہاوت کو غلط ثابت کر دکھایا تھا میں اپنی امارت پر آج تک بھی اترا ہوا تھا اور نہ ہی دولت کا سہارا لے کر کوئی ایسا کام کیا تھا جو میرے اور میرے والدین کے لئے باعث شرم و عار کہلاتا۔ تاہم میں اپنے دوستوں پر بے دریغ دولت لٹایا کرتا تھا خصوصاً غریب دوسوں پر ان کی مالی امداد کر کے مجھے بے پناہ خوشی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔

ابو نے کبھی میرے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی کبھی کبھار امی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے ٹوکنے کی کوشش کرتیں تو ابو میرا بھرپور ساتھ دیتے تھے اور پھر امی کو چپ کر کر ہی دم لیتے تھے۔

چند روز پہلے کا ذکر ہے، میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو پچاس ہزار روپے بطور قرض حسدہ دیئے تو امی حسب معمول مجھ پر برس پڑیں۔

”سرمد.....؟“ وہ مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔

”تمہارا دل نہیں دکھتا باپ کی محنت کی کمائی لٹاتے ہوئے۔ وہ دن رات ایک کر کے کماتے ہیں اور تم بن مانگے کسی کی بھی جھوٹی بھر دیتے ہو۔“

”امی..... امی نے اسے قرض دیا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تین چار ماہ کے بعد لوٹا دے گا۔“

”ہونہ۔ قرض..... وہ قدرے غصے سے بولی۔

”آج کل کون واپس کرتا ہے قرض؟ لوگ تو سرکاری قرضے تک ہضم کر جاتے ہیں، جنہیں کون پوچھے گا.....؟“

”کیوں نہیں پوچھے گا.....؟ میرا دوست ایک شریف اور خوددار انسان ہے۔“

”خوددار ہوتا تو پھر یوں تمہارے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتا بلکہ محنت مزدوری کر کے کماتا۔“ امی نے استہزاء انداز میں جواب دیا۔

”میں دوست ہوں اس کا۔“ میں نے ناگوار انداز میں کہا۔

”اور دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ کل مجھ پر بھی وقت آ سکتا ہے، ہم انسان اگر ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے تو اور کون آئے گا.....؟“

مجھے واقعی امی کی سوچ پر دکھ ہوا تھا مگر ان کے سامنے گستاخی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور والے نے میری جنت اس کے قدموں تلے رکھ کر مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا لگتا ہے۔ ”تمہیں ٹیکل ڈالنا پڑے گی۔“ مجھے برا مانتے دیکھ کر وہ موضوع بدل کر بولیں۔

”جب ٹوکنے والی کوئی ہوگی تو تمہارے سارے کس بل نکل جائیں گے۔ ماں کی باتیں تو تمہیں بری لگتی ہیں ناں۔“

”نہیں.....“ میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”مجھے آپ کی باتیں بالکل بری نہیں لگتیں، اس لئے مجھے ٹیکل ڈالنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیں، میں ابھی پڑھنا چاہتا ہوں، کچھ بن کر دکھانا چاہتا ہوں.....“

”ایک شرط پر تمہیں چھوڑ سکتی ہوں.....“

”شرط..... کیسی شرط.....؟“ میں نے متحیر انداز میں پوچھا۔

”آئندہ تم اپنے کسی دوست کو قرض نہیں دو گے۔“ امی نے دونوں انداز میں جواب دیا۔

”بہت نامعقول شرط ہے۔ لیکن.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سر کھچا نا شروع کر دیا۔

”لیکن کیا.....؟“ امی نے کھو کر پوچھا۔

”سوچ کر بتاؤ گا.....؟“

”ٹھیک ہے تم سوچتے رہو، میں آج ہی تمہارے ابو سے بات کرنی ہوں دیکھتی ہوں تم کیسے انکار کرتے ہو.....؟“ اتنا کہہ کر وہ چل دیں اور میں سوچوں میں غرق ہو گیا۔

میں اگر چاہتا تو امی سے جھوٹا وعدہ کر کے اس معاملے سے جان چھڑا سکتا تھا مگر امی سے جھوٹا وعدہ کرنا مجھے نامناسب لگتا تھا ویسے بھی کسی ضرورت مند دوست کو میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے امی سے سوچنے کی مہلت مانگی تھی لیکن امی نے میری بات سننا گوارا نہیں کی تھی۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ امی ضرور ابو سے میری شادی کی بات کریں گی اور ابو بھی وقتی طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گے مگر ایک بات میرے لئے باعث اطمینان تھی کہ ابو ہر صورت میرا عندیہ ضرور جانیں گے اور بغیر سوچے سمجھے کہیں بھی میرا رشتہ طے کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی وہ باپ سے زیادہ میرے دوست تھے۔ آج تک میری مرضی کے خلاف انہوں نے مجھ سے متعلق کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا تھا تو اب کیسے کر سکتے تھے یہی سوچ کر میں مطمئن ہو گیا تھا۔

مگر دوسرے دن ابو نے مجھے سنجیدگی سے بتایا کہ امی فوراً میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

”نہیں ابو.....“ ان کی بات سن کر میں نے انکار میں سر ہلایا۔

”شادی کرنے کے لئے ابھی عمر بڑی ہے۔ فی الحال میں صرف پڑھنا چاہتا ہوں۔“

”پڑھائی کا کیا ہے۔ وہ تو شادی کے بعد بھی جاری رکھی جاسکتی ہے۔“ ابو نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم کوئی لڑکی تو نہیں ہو کہ گھر میں بیٹھ جاؤ گی بہتر ہے کہ اپنی ماں کا کہنا مان لو، ہر ماں کو بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا بڑا ارمان ہوتا ہے۔“

”ابو، کیا واقعی امی کو میرے سر پر سہرا سجانے کا ارمان ہے..... یا پھر کوئی اور چکر ہے.....؟“

”چکر.....“ ابو نے الجھ کر پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”چکر.....؟“ ابو نے الجھ کر پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“

”ابو..... دراصل امی مجھے سزا دینے کے لئے میری شادی کرنا چاہتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ میں بہت فضول خرچ ہوں اور اپنے دوستوں کو قرض وغیرہ دے کر باپ کی کمائی لٹا رہا ہوں، اس لئے وہ میری اصلاح کے لئے مجھ پر ایک کنٹرول لڑکی مسلط کرنا چاہتی ہیں جو وقت بے وقت میرا دماغ چاٹ سکے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ارے نہیں بھیجی تمہارا وہم ہے۔“ ابو نے مسکرا کر کہا۔

”تمہاری امی کو واقعی ایک عدد بہو کی ضرورت ہے۔“

”بہو کی نہیں، جماعتی کی ضرورت ہے جو میرے خلاف ان کا ساتھ دے سکے۔“

”دیکھو بیٹے.....“ ابو نے ایک دم نامحانہ انداز اختیار کر لیا۔

”ماں باپ ہمیشہ اولاد کے بھلے کا ہی سوچتے ہیں تمہاری امی نے بھی یقیناً یہ فیصلہ سوچ کر کیا ہوگا اس لئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان کے اس فیصلے پر غور کرو اور چند روز کے بعد مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔“

”پلیز ابو.....“ میں نے التجائی انداز میں کہا۔

”مجھے اس آزمائش میں مت ڈالنے میں شادی

کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں، آپ امی کو سمجھا دیں۔“

”احقانہ باتیں مت کرو.....“ انہوں نے سرزنش کی۔

”میں تمہاری امی کی مرضی کے خلاف کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ شادی تو تمہیں ہر صورت کرنا ہی پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میری بھی ایک بات سن لیں مجھ پر اگر زبردستی کی گئی تو میں کھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

اتنا کہنے کے بعد میں پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھ پر ایک دم ہی جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی تھی، زندگی میں پہلی بار ابو نے میری کوئی بات ماننے سے انکار کیا تھا، حالانکہ اس سے قبل انہوں نے میری ہر جائز و ناجائز خواہش بلا تردد پوری کی تھی۔

دل پر ایک بو بھلے میں پیدل ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میرا رخ ایک قریبی پارک کی طرف تھا۔

دراصل میں وہاں کسی پرسکون گوشے میں بیٹھ کر اس معاملے پر غور کرنا چاہتا تھا مجھے اگر قبل از وقت معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ اس قدر رنجیدگی اختیار کرے گا تو شاید میں امی سے بحث کرنے کی بجائے ان سے جھوٹا وعدہ ہی کر لیتا، وہ کون سا ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھیں وہ تو میرے دوستوں کے ناموں تک سے ناواقف تھیں۔

میں ان کے علم میں لائے بغیر بھی اپنے دوستوں کی مدد جاری رکھ سکتا تھا۔ اب اگر میں ان سے وعدہ کرتا تو وہ مجھ پر کسی طرح بھی اعتبار نہ کر سکتے بلکہ صاف کہہ دیتیں کہ میں شادی کوٹالنے کے لئے جھوٹا وعدہ کر رہا ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطانہ دوپچان میں ٹپکنے کے انداز میں چلتا ہوا پارک میں داخل ہوا اور قدرے ایک سناں گوشے میں موجود سنگی بیچ پر بیٹھ گیا وسیع و عریض پارک میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ جوڑے بچوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے کچھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارک کی نرم نرم گھاس پر چہل قدمی کر رہے تھے اور بچے مختلف ٹیکل، ٹیکل، ٹیکل رہے تھے، جن میں کرکٹ سر فہرست تھا۔

مجھے پارک میں بیٹھے ابھی چند لمحات ہی گزرے تھے کہ میری نگاہ ایک عجیب و غریب بوڑھے شخص پر پڑی وہ پاگلوں کی طرح پارک میں موجود ایک شخص کو غور سے دیکھتا پھر رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا کوئی کھو گیا ہو، ہر شخص کے قریب پہنچ کر وہ لمبے بھر کے لئے رکتا، دیر سے پھاڑ کر اسے دیکھتا اور پھر تاسف سے سر ہلاتا ہوا کسی دوسرے شخص کے سامنے جا رکتا۔ ایک بار پھر وہی وہی عمل دہراتا اور دوبارہ آگے چل دیتا۔

اپنے میلے پیلے لباس اور جھاڑ جھکار بالوں اور داڑھی کے ساتھ وہ بڑی حد تک پراسرار نظر آ رہا تھا۔ کچھ افراد نے اسے بھیک دینے کی بھی کوشش کی مگر وہ بے نیازی کے ساتھ ان کے قریب سے گزر چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بین میرے سامنے پہنچ کر رک گیا اور بغیر پلک جھپکائے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی لال لال آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی جگہ فردا کی نظر آ رہی تھی، گوکہ وہ دھام دھمکنوں اور درویش کھلانے والے نام نہاد فطیوں کے جیسا تھا، انہی کی طرح اس نے میلا کچلا لباس پہن رکھا تھا اور شاید مہینوں سے اس نے پانی کی غسل نہیں دیکھی تھی مگر پھر بھی اس کی غلیظ شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ مجھ پر کراہیت کی بجائے مروجہ ہمت کا احساس غالب آ رہا تھا۔ میں عام لوگوں کی طرح ضعیف عقیدے کا مالک نہیں تھا مگر پھر بھی لمحہ بہ لمحہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں مجھے اپنے اندر تک اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کوئی ساحر لگتا تھا جو بیک کر اس پارک میں آ نکلا تھا۔

چند ثانیے مجھے گھورنے کے بعد اس نے ”حق اللہ“ کا نعرہ مستانہ لگا دیا اور مسکراہٹ آمیز انداز میں بولا۔
”مل گیا بل گیا۔“
”کک..... کون مل گیا بابا؟“ میں نے
پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

”جس کی تلاش تھی۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے دوبارہ نعرہ بلند کیا۔ ”حق اللہ۔“
”کیا آپ مجھے تلاش کر رہے تھے؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔
”نہیں..... ایک انسان کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں بڑی مشکل سے ایک انسان ملا ہے۔ ایک عرصہ بیت گیا ہے میں نے انسان نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں انسان.....؟“
وہ عجیب فلسفیانہ انداز میں بول رہا تھا اور میں اچھے ہوئے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں، اتنے بہت سے انسانوں کی موجودگی میں بھی وہ انسان تلاش کرتا پھر رہا تھا اور یہ بات مجھے کسی طرح مبہم نہیں ہو رہی تھی۔
”یہ..... یہ سب انسان ہی تو ہیں بابا۔“ قدرے توقف کے بعد میں نے الجھ کر کہا۔

”آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔؟“
”من کی آنکھ کھول کر دیکھ نادان۔“ وہ ناراض ہو کر بولا۔
”ان آنکھوں سے تو صرف ظاہر نظر آتا ہے۔ یہاں کوئی انسان نہیں ہے، وہ دیکھ۔“ اس نے انگلی سے پارک کے ایک سسٹن کو نے کی طرف اشارہ کر دیا۔
”وہاں انسانیت انسانوں کی بے جسی دیکھ کر اکیلی بیٹھی رو رہی ہے۔ جاؤ جا کر اس کے آنسو پونچھ کر اسے گلے لگا لو، فلاح پا جاؤ گے۔“
”شاید پاؤں ہے۔“ اس کی باتیں سن کر میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”سب یہی سوچتے ہیں جو تم سوچ رہے ہو۔“ اتنا کہہ کر اس نے پھر نعرہ بلند کیا۔
”حق اللہ..... انسان کہاں ہیں؟ میری تلاش کب ختم ہوگی۔ یہ تم نے مجھے کس جگہ میں ڈال دیا۔“
”مم..... معاف کر دے بابا۔“ میں نے احساس مروجہ ہمت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”مم..... مجھ سے..... بھول ہو گئی..... دراصل..... میں بہت پریشان ہوں۔“
”وہ دیکھ۔“ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”وہاں اوپر بیٹھا ہے معاف کرنے والا..... میں تو خود قابل رحم اور اس کی معافی کا طلب گار ہوں، کون جانے وہ معاف کرتا بھی ہے یا نہیں.....؟ تو بھی اسی سے معافی مانگ، وقت گزر گیا تو پچھتائے گا۔ پھر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”میں..... آپ کو پہچان نہیں سکا بابا، ورنہ ایسا سوچنے کی غلطی کبھی نہ کرتا..... آپ تو بہت پچھنے ہوئے ہیں.....“
”چپ.....“ اس نے قدرے سخت انداز میں قطع کلامی کی۔

”مجھے تکبر کی سیڑھیاں چڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے..... وہ اوپر والا جانتا ہے..... سب کو میں اور تو، تو اس کی بچھاٹی ہوئی بساط کے ادنیٰ سے مہرے ہیں، جن کے ادھر ادھر ہونے سے بساط پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کا جواب سن کر میں چپ سا دھ کر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی کوئی پچھنی ہوئی ہستی تھا۔ انسان کی سوچیں تک بڑھ لیتا تھا، شاید معرفت کے کسی بلند مقام پر فائز تھا لیکن زبان سے اس کا اقرار کرنا اسے منظور نہیں تھا اور اللہ والے ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو ایک حقیر تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے کہ تکبر تقویٰ کا اڑی دھن ہے۔ سچ کہوں تو اس کی مداخلت نے میری پریشانی کو کافی دور بنا کر ڈال دیا تھا حالانکہ اس کی آمد سے کل میں بہت پریشانی کے عالم میں بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔

”مجھے کھانا کھلا دے۔“ اس نے ایک بار پھر آسمان کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔
”اس نے بھیجا ہے مجھے..... تمہارا مہمان بنا کر.....“
اس کا حکم سن کر میں بلا تردد اٹھا اور اس کے ساتھ

چل دیا وہاں موجود لوگ ہمیں عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کچھ کی آنکھوں میں حیرت تھی تو کچھ کا انداز تحسّر تھا۔ لیکن بابا نے کسی پر توجہ نہ دی اور بے نیازی سے آگے بڑھتا چلا گیا یوں جیسے پارک میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود ہی نہ ہو۔

پارک سے نکلنے کے بعد ایک لمحے کے لئے رک گیا، سڑک پر ٹریفک کا اڑدھام تھا اور پیدل مرکز پارکنا مشکل نظر آ رہا تھا ہمارے دائیں جانب کچھ فاصلے پر ٹریفک سگنل موجود تھا وہاں سے سڑک پار کرنے کے بعد ہی سامنے والے فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا جاسکتا تھا۔
”آئیے.....“ میں ٹریفک سگنل کی طرف بڑھتے ہوئے بابا سے مخاطب ہوا۔

”میں آپ کو بہترین کھانا کھلاؤں گا۔ وہ سامنے ہی ہوٹل ہے، وہاں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔“
”ناں.....“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔
”میں گھر کا کھانا کھاؤں گا.....“ ہوٹل کا کھانا ہوتا تو مجھے کیوں کہتا.....؟“

”میرا گھر تو بہت دور ہے بابا۔“ میں نے راستے کی طوالت کے پیش نظر کہا۔
”اور پھر وہاں کھانا بھی مخصوص وقت پر پکتا ہے میں آپ کو تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں۔“
”آسانیاں انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہیں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ اتنا کہنے کے بعد میں اسے ساتھ لئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا مگر پہنچ کر میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا اور خود خانساں کے پاس بچن میں پہنچ گیا اسے کھانا تیار کرنے کا حکم دے کر جب میں واپس لوٹا تو امی کو ڈرائنگ روم کے دروازے پر منتظر پایا۔ چند لمحے وہ مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے گھورتی رہیں اور پھر غصے سے بولیں۔

”یہ ڈرائنگ روم میں کسے بیٹھا رکھا ہے۔“
”میرا مہمان ہے، کھانا کھا کر چلا جائے گا۔“ میں

نے بلا تردد جواب دیا۔

”یہ بھکاریوں کو تم نے کب سے مہمان بنانا شروع کر دیا ہے؟ اسے باہر لان میں بھی تو بیٹھا یا جاسکتا تھا۔۔۔۔۔ سارا ڈرائنگ روم گندا کر دے گا۔“

”پلیز امی۔۔۔۔۔ میں نے التجا کی۔“
”آہستہ بولیں وہ ایک معزز شخص ہے اگر اس نے سن لیا تو میں بے عزت ہو جاؤں گا کچھ تو میری عزت کا خیال کریں۔“

”تمہاری عقل پر تو پردے پڑ چکے ہیں۔“ امی پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئیں اور میں ڈرائنگ روم کے اندر داخل ہو گیا جہاں بابا کھانے کا منتظر تھا۔

”کھانا آرہا ہے بابا۔۔۔۔۔ میں اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”خانا ماں تیار کر رہا ہے بس تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔“

”کائنات کی ہر چیز انتظار میں ہے سہ ماہیاں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

”کس کا انتظار مختصر اور کسی کا طویل ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بابا آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟ حالانکہ میں نے ابھی تک آپ کو اپنا نام نہیں بتایا۔“

”اس نے بتایا ہے۔۔۔۔۔ اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔

”حق اللہ۔“

”مجھے کچھ آئندہ کے بارے میں بتائیے؟“ میں نے پرشوق انداز میں سوال کیا۔

”مستقبل میں میرے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے۔۔۔۔۔؟“

”آئندہ انسانی نگاہ سے اوجھل ہوتا ہے اور میں بھی ایک انسان ہوں۔ صدقہ کیا کر اور صدقہ بلاؤں کو کھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے بس اتنی ہی اجازت ہے، اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”نہیں بابا۔۔۔۔۔ میں نے منت کے انداز میں

کہا۔

”آپ بہت کچھ جانتے ہیں پلیز بتائیں ناں۔۔۔۔۔؟“

”جیسے اس نے مخفی رکھا ہے وہ وقت سے پہلے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ وہ نصیحت کے انداز میں بولا۔

”پہاں کو عیاں کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھے مجبور مت کر ورنہ میں بغیر کھانا کھائے چلا جاؤں گا۔“

”میں شرمندہ ہوں بابا۔“ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کی مجبوری اچھی طرح سمجھ گیا ہوں لیکن کیا کروں اپنے اس شوق کے ہاتھوں میں بہت مجبور ہوں۔۔۔۔۔ کاش میں کسی طرح مستقبلِ نبی کا علم حاصل کر سکتا۔“

”تیری یہ خواہش ناجائز ہے۔“ وہ بولا۔

”تم نادان ہو۔۔۔۔۔ کیوں خود کے دشمن بن رہے ہو۔۔۔۔۔؟ باز آ جاؤ اس خواہش سے اور اپنے شایان شان کچھ مانگو۔“

”اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس بابا۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔

”بس کسی طرح میری یہ ایک خواہش پوری ہو جاتی تو میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا۔“

”تو نادان اور نا سمجھ ہے کسی شیر خوار بچے کی طرح۔۔۔۔۔ کھینے کو آگ کے انگارے مانگ رہا ہے۔۔۔۔۔ کیوں جلنا چاہتا ہے اس۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

بابا مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اس دوران ایک نوکر کھانا لے کر پہنچ گیا اس نے کھانا سینٹرل ٹیبل پر رکھا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا بابا نے نظر بھر کر نوکر کی طرف دیکھا اور پھر خود کھانا کے انداز میں بولا۔

”بے شک سبھی کو اس کی طرف لوٹ کر جاتا ہے۔ کسی کا انتظار طویل اور کسی کا مختصر ہوتا ہے۔“

بابا کی خود کھانا کی سن کر نوکر نے پریشانی کے عالم

میں میری طرف دیکھا۔

”صاحب، کچھ اور لانا ہے کیا۔۔۔۔۔؟“ اس نے مودب انداز میں پوچھا۔

”جلدی کیا ہے انور میاں۔۔۔۔۔؟“ بابا نے غیر متوقع طور پر سوال کیا اور انور کو کھانا اٹھا۔ وہ متحیر انداز میں بابا کی شکل دیکھ رہا تھا شاید بابا نے اس کا نام لے کر اسے چونکا دیا تھا بابا چونکہ اس کے لئے بالکل اجنبی تھا اس لئے اس کا حیران ہونا عین فطری تھا ایک انجان شخص کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

”تم جاؤ انور۔۔۔۔۔ میں نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔

”اور خانساں سے اچھی سی چائے بنانے کا کہہ دینا۔۔۔۔۔ کھانے کے بعد۔۔۔۔۔“

”نہیں میاں۔۔۔۔۔“ بابا نے قطع کلامی کی۔

”چائے رہنے دو۔۔۔۔۔ اجازت نہیں ہے۔“

”کیوں بابا۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”اجازت کیوں نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ سوال لا جواب ہوتے ہیں، ان کا جواب ہوتا ہی نہیں۔“

بابا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا اس کا مطلب بھانپتے ہوئے میں نے کھانا ٹیبل پر سجایا اور پھر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے۔ ”بسم اللہ کیجیے بابا۔“

میرا اشارہ پا کر بابا نے زیر لب بسم اللہ ادا کی اور پھر روٹی کا ایک ٹوڑا کرمتہ میں رکھ لیا۔

”واہ بھئی واہ کیالذہ کھانا ہے۔“ نوالہ چباتے ہوئے وہ تھریلی انداز میں بولا۔

”لفظ آگیا۔۔۔۔۔ اللہ بے حساب رزق دے جنہیں۔۔۔۔۔ خوش کر دیا تم نے مجھے۔“

وہی ایک نوالہ کھانے کے بعد اس نے پانی کا آدھا گلاس پیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بہت بہت شکریہ میاں۔۔۔۔۔ اب میں چلوں گا اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔“

”بابا آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔“ میں نے متحیر انداز میں کہا۔

”صرف ایک نوالہ اور وہ بھی خشک، کیا کھانا پسند نہیں آیا۔“

میرا سوال سن کر وہ پہلی بار آہستہ سے مسکرائے۔ ”تم نہیں سمجھو گے میاں۔۔۔۔۔ بہر کیف میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔۔۔۔۔ اب میں اجازت چاہوں گا۔“

”لیکن اتنی جلدی۔۔۔۔۔ نہیں بابا۔“ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو نہیں جانے دوں گا ابھی تو میرے کئی سوال تھنہ ہیں، میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے۔۔۔۔۔ پلیز آپ تھوڑی دیر رک جائیں۔“

”اجازت نہیں ہے رکنے کی۔“

”پھر کب ملو گے بابا۔۔۔۔۔؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جب وہ چاہے گا۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں انگلی بلند کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا اور میں پریشانی کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔

انور اگر برتن اٹھانے کے لئے اندر نہ آتا تو نہ جانے میں کب تک پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑا رہتا۔ انور کو دوبارہ اپنے سامنے پا کر مجھے بابا کی کئی گئی بات یاد آگئی جو اس نے انور کو بخور دیکھنے کے بعد بھی کہی۔ ”بے شک سبھی کو اس کی طرف لوٹ کر جاتا ہے کسی کا انتظار طویل اور کسی کا مختصر ہوتا ہے۔“

تو کیا انور کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے؟ میں نے دل دہی دل میں سوچا اور پھر انور کی طرف متوجہ ہو گیا جو کھانے سے لبریز برتن کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، غالباً اسے ایسے منظر کی توقع نہیں تھی۔

”صاحب۔۔۔۔۔ انور نے حیرانی سے پوچھا۔

”کھانا تو دیے کا ویسے پڑا ہوا ہے، پھر اس بابا نے کیا کھایا۔۔۔۔۔؟“

”اس نے جتنا کھانا تھا کھا لیا..... تم یہ برتن اٹھا کر لے جاؤ۔“ میں نے باہر جاتے ہوئے اسے حکم سنایا۔

”تھوڑی دیر کے بعد ٹی وی لاؤنج میں میرے لئے کافی لے آتا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ وہ برتن سمیٹتے ہوئے بولا اور میں باہر نکل کر ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔

میرا ذہن بدستور اس پراسرار بابا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جس کی باتیں بظاہر اچھی ہوتی تھیں لیکن حقیقت میں بامقصد تھیں وہ یقیناً کوئی نیچے ہوتی ہستی تھا یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے پارک میں موجود اسٹے سارے لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی میزبانی کے لئے صرف مجھے ہی کیوں منتخب کیا تھا؟ میں تو ایک عام سا گناہ گار شخص تھا۔ میرے کریڈٹ پر ایسی کوئی نیکی نہیں تھی کہ اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ مجھے اپنے التفات کے لائق سمجھتا۔

یہ سوال میرے لئے نہ صرف اہم بلکہ قابل غور تھا کہ اسٹے بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں آخر میرا انتخاب ہی کیوں کیا گیا تھا؟ بابا نے جاتے ہوئے مجھے اپنا چٹا ٹھکانہ تک نہیں بتایا تھا ورنہ میں اس سے دوبارہ ملنے کی کوشش ضرور کرتا پراسرار ہونے کے باوجود وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد انور کافی لے کر پہنچ گیا اسے دیکھ کر مجھے پھر بابا کی بات یاد آگئی مگر میں انور سے دل کی بات کہہ کر اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا نجانے بابا نے کس ترنگ میں آ کر وہ بات کہہ دی تھی میں صرف اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ اگر بابا نے مجھے واضح الفاظ میں انور سے متعلق کسی ممکنہ خطرے سے آگاہ کر دیا ہوتا تو میں انور سے اس موضوع پر بات ضرور کرتا اور اسے محتاط رہنے کی خصوصی تاکید بھی کر دیتا مگر ایسی لاطینی کی صورت حال میں اس سے کچھ کہنا بلاوجہ اسے پریشانی میں مبتلا کرنا تھا وہ کافی کا کپ نیمل پر رکھ کر واپس جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

”انور چچا کے ساتھ تمہارے تنازعہ کا کیا بنا.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ابھی تک تو کچھ بھی نہیں بنا صاحب۔“ وہ اداس انداز میں بولا۔

”میرا اچھا انتہائی لالچی انسان ہے، میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ کسی طرح بھی میرے حصے کی زمین دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اس کے خلاف دعویٰ دائر کروں مگر پھر خیال آتا ہے کہ ایسا کرنے سے میری اکلوتی بہن کا گھر اجڑ جائے گا۔ بد قسمتی سے وہ چچا کی بہو ہے۔“

”تم نے علاقے کے پنواری سے بات کی ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے باپ کے نام پر زمین ہے کہ نہیں.....؟“

”کئی باری ہے صاحب، مگر وہ سنتا ہی نہیں ہے چچا نے ملی بھگت کر کے پنواری سے لے کر تحصیل دار تک کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے سب یہی کہتے ہیں کہ میرے باپ نے مرنے سے پہلے اپنے حصے کی زمین چچا کے ہاتھ بیچ ڈالی تھی لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے میرا باپ تو ساری زندگی محنت مزدوری کر کے ہمیں پالتا رہا ہے وہ پرکھوں کی زمین بیچنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب چچا کا چلایا ہوا چکر ہے مگر میں بھی اسے چھوڑوں گا نہیں۔ چاہے میری جان کیوں نہ چلی جائے.....؟“ اس نے پر عزم انداز میں جواب دیا۔

”میں نے کہا۔“ میری مانو تو عدالت سے رجوع کرو تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔“

”کل میں جاؤں جا رہا ہوں صاحب چچا سے دو ٹوک بات کروں گا اگر وہ نہ مانا تو پھر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔“

”چچا سے تو تم پہلے بھی کئی بار بات کر چکے ہو۔“ میں کسی خدشے کے تحت بولا۔

”لیکن نتیجہ کیا نکلا.....؟“ اس نے تمہارا حق تسلیم

کرنے کی بجائے تمہیں دھمکانا شروع کر دیا اب اگر تم نے اسے عدالت میں جانے کی دھمکی تو مشتعل ہو کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں.....؟ کیا اپنے حصے کی زمین چھوڑ دوں یا.....“

”زمین چھوڑنے کے لئے کون کہہ رہا ہے.....؟“ میں نے قطع کلامی کی۔

”میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے مطلع کئے بغیر عدالت سے رجوع کر دو تا کہ وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے گریز کرے۔“

”نہیں صاحب جی.....“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

”چچا سے بات کئے بغیر میں عدالت تک نہیں جاؤں گا ورنہ وہ لوگ میری بہن کا جینا دو بھر کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اپنے چچا کی طرف سے محتاط رہنا۔“ میں نے اسے تاکید کی۔

”بہتر ہوگا کہ تم گاؤں کے کسی معتبر شخص کو ساتھ لے کر چچا کے پاس جانا۔“

”بہت اچھا صاحب جی..... میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ اب میں جاؤں.....؟“

”میں نے کافی کا کپ اٹھا کر ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔“

”انور! میں کیسا انسان ہوں.....؟“

”میں سمجھا نہیں صاحب.....؟“ میرا غیر متعلق سوال سن کر اس نے الجھ کر پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ میں کیسا انسان ہوں.....؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہوں کہ برا ہوں.....؟ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟“

”صاحب.....! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ مالک ہیں اور میں.....“

”انور.....!“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے

کہا۔

”تم یہ مت سوچو کہ میں تمہارا مالک ہوں۔ میں جیسا تمہیں لگتا ہوں، تم بلا تردد کہہ ڈالو میں برا نہیں مناؤں گا۔“

”صاحب..... آپ بہت رحم دل انسان ہیں۔“ وہ بولا۔

”ہر ضرورت مند انسان کی مدد کرتے ہیں حالانکہ دولت مند اکثر مغرور ہوتے ہیں مگر آپ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں زیادہ بڑھا کھٹا تو نہیں ہوں لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”ذرومت انور۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

”تم جانتے ہو کہ میں نوکروں کو بھی اپنا دوست سمجھتا ہوں اور سچا دوست وہی ہوتا ہے جو اپنے دوست کو نہ صرف اس کی خوبیاں بتاتا ہے بلکہ اسے اس کی خامیوں سے بھی آگاہ کرتا رہتا ہے۔“

”بندے پر دھم کے حقوق ہوتے ہیں صاحب۔“ وہ کسی واعظ کے سے انداز میں بولا۔

”حقوق اللہ اور حقوق العباد..... آپ حقوق العباد تو باقاعدگی سے اور خوشی سے ادا کرتے ہیں لیکن حقوق اللہ پر توجہ نہیں دیتے آپ میں بس یہی خالی ہے صاحب۔“

”شکریہ انور..... مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے تمہاری کھری اور غیر جانبدار رائے سن کر اب تم جاسکتے ہو۔“

میری اجازت پا کر وہ سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا اور میں نے ریوٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا

ایک اسپورٹس چینل کا انتخاب کرنے کے بعد میں صوفے پر نیم دراز ہو کر کرٹ بیج سے محفوظ ہونے لگا۔ دو بجے تک میں بیچ دیکھتا رہا پھر ٹی وی آن کرنے کے بعد بیچ کرنے کے لئے ڈائمنگ ہال کی طرف چل دیا۔

ڈائمنگ ہال میں امی اور قاترہ میری منتظر تھیں

فائزہ کے اسکول میں ڈیڑھ بجے تک چھٹی ہو جاتی تھی اس لئے وہ بچہ ہمارے ساتھ ہی کیا کرتی تھی کبھی بھار اگر وہ اسکول سے لیٹ بھی ہو جاتی تو امی اور میں اس کا انتظار کر لیا کرتے تھے۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ بہت لاڈلی اور امی کو بہت پیاری تھی ایک دن غلطی سے اس کی عدم موجودگی میں امی اور میں نے بچہ کر لیا تو اس نے وہ اڈم چھایا کہ خدا کی پناہ، پورے دن وہ لگا تار رو رہی تھی اور امی کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس نے بچہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اس دن کے بعد امی نے مجھے اس کی غیر حاضری میں بچہ نہیں کیا تھا تاہم میں اس پابندی سے آزاد تھا مجھے جب کوئی ضروری کام ہوتا تھا تو میں بچہ قائم کو آگے پیچھے کر لیا کرتا تھا۔

”آج تم لیٹ کیوں ہو گئے ہو.....؟“ میرے سیٹ سنہا لے لے امی نے سوال کر دیا۔

”میں اس بھکاری کے ساتھ بیٹھی.....“

”پلیز امی.....“ میں نے بے چارگی کے عالم میں قطع کلامی کی۔

”آپ ایک معزز اور صاحب کشف و کرامت بزرگ کا مذاق اڑا رہی ہیں۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے.....“ امی نے ناگواری سے کہا۔

”تم نے اس میں کون سی کرامت دیکھ لی ہے کیا سر کے بال اور داڑھی بڑھا کر مینوں نہ نہانے سے آدمی صاحب کشف و کرامت بن جاتا ہے؟ خدا کی پناہ اس کے جسم سے بدبو کے بجائے اٹھ رہے تھے میں تو ایک پل بھی اس کے پاس نہ بٹھرتی۔“

میں نے کہا۔ ”امی..... آپ نے صرف اس کا ظاہر دیکھا ہے وہ عام ملکوں کی طرح ظاہر میلا پھیلا لگتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ جیسا نظر آتا ہے ویسا ہے نہیں اس کی آنکھیں ابکسرے مشین کی طرح انسان کے اندر تک کھگانے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہ من کی باتیں تک جان لیتا ہے۔“

”ایسا کیا بتایا ہے اس نے تمہیں، ذرا میں بھی

توسنوں۔“ امی نے طنز یہ انداز میں سوال کیا۔

”اس نے میرے بتائے بغیر نہ صرف میرا نام جان لیا بلکہ انور کو بھی اس نے نام لے کر پکارا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں اس کے لئے قطعی اجنبی تھے۔“ میں نے پر جوش انداز میں جواب دیا۔

”اس نے پہلے ہی کسی سے تم لوگوں کے نام معلوم کر لئے ہوں گے ایسے لوگ بہت عیار اور چالاک ہوتے ہیں۔“ امی نے فائزہ کی پلیٹ میں سالن ڈالنے ہوئے کہا۔

”تم محتاط رہنا اس سے، ہو سکتا ہے وہ کوئی نوسر باز ہو.....؟“

”نہیں امی.....“ میں نے تردید یہ انداز میں کہا۔

”آپ حقیقی انداز میں سوچ رہی ہیں وہ کوئی مجذب تو ہو سکتا ہے مگر فراڈ نہیں ہو سکتا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی.....“

”ہو سکتا ہے وہ کوئی ٹیلی پیٹھی وغیرہ جانتا ہو۔“ امی نے قطع کلامی کی۔

”اور اپنے اس علم کے ذریعے اس نے تم لوگوں کے نام معلوم کر لئے ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے اس علم کی حقیقت سے انکار نہیں ہے مگر یہ علم صرف انسانوں اور قلموں تک محدود ہے عملی زندگی میں آج تک میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو ٹیلی پیٹھی کا علم جانتا ہو اور اہم بات یہ ہے کہ ٹیلی پیٹھی کا علم رکھنے والے یوں مجذب بن کر نہیں بھرتے بلکہ وہ اس علم کے ذریعے لاکھوں میں بھیتے ہیں۔“

”پھر ظاہر ہے اس کے پاس کوئی سٹیلی علم ہی ہو سکتا ہے۔“ امی نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں یہ سٹیلی علم اور کالا جادو وغیرہ صرف ڈھکوسلے ہیں، میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا وہ بااثر و رو کوئی صاحب معرفت ہے۔“

”ناممکن.....“ امی بولی۔

”اس جدید دور میں ایسا سوچنا محض ایک حماقت ہے۔ وہ یقیناً تم لوگوں کے نام پہلے سے جانتا ہوگا۔“

”اگر بات ہمارے نام جان لینے تک محدود رہتی تو شاید اسے میں قابل توجہ نہ سمجھتا لیکن اس نے انور کے مستقبل کے متعلق ایک جملہ بول کر مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔“

”کیا کہا ہے اس نے.....؟“ امی نے ایک دم دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن اس نے مستقبل قریب میں انور کی موت کی پیش گوئی کی ہے اس نے انور کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ بے شک سبھی کو امی کی طرف لوٹ کر جانا ہے کسی کا انتظار طویل اور کسی کا مختصر ہوتا ہے۔“

”اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ خدا خواستہ انور مستقبل قریب میں مرنے والا ہے؟“ امی نے طنز یہ انداز میں استفسار کیا۔

”ثابت تو ہو رہا ہے.....“ میں نے کہا۔

”آپ نہ مائیں تو اور بات ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک۔“ امی نے اکتا کر کہا۔

”اب کھانا کھاؤ اس موضوع پر بعد میں بات کر لیں گے۔“

بچہ سے فارغ ہونے کے بعد امی نے دوبارہ وہی موضوع چھڑ دیا میری بیسیوں دلیلوں کے باوجود وہ بابا کو محض ایک بھکاری ماننے پر تلی رہیں۔ فائزہ ہماری باتوں سے اکتا کر اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے چلی گئی اور پھر میں پچیس منٹ کے بعد میری اور امی کی بحث بھی بغیر کسی نتیجے کے اختتام پذیر ہو گئی۔

دن کا بقیہ حصہ میں نے اس پراسرار بابا کے متعلق سوچتے ہوئے گزار دیا، خصوصاً انور کے متعلق اس کا کیا گیا جملہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا میں نے اس جملے کے بحر سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انور لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہو مگر اسے بچانے کے لئے میں عملی طور پر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ گھر میں کوئی بھی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں اگر زیادہ

زور دیتا تو وہ یقیناً مجھے باطل قرار دیتے ہوئے کسی باہر نفسیات کو دکھانے کی کوشش کرتے اور یہ مجھے کسی صورت منظور نہیں تھا، تاہم میں انور کو متوقع حادثے سے بچانے کے لئے مسلسل سوچ رہا تھا۔

اس مقصد کے لئے میں شام سے تھوڑی دیر قبل کار لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا دراصل میں اس بابا کو تلاش کر کے اس جملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا جو اس نے انور کو دیکھ کر کہا تھا میں جانتا تھا کہ انور کو کس قسم کا حادثہ پیش آ سکتا ہے؟ بظاہر تو بچپے کے علاوہ کوئی اس کا دشمن نہیں تھا لیکن چچا شاید اس کی جان لینے کی حد تک نہیں جاسکتا تھا، البتہ انور حادثاتی یا طبعی موت سے دوچار ہو سکتا تھا حادثاتی اور طبعی موت کی بے شمار اقسام ہوتی ہیں اور میں بابا کو تلاش کر کے انور کی موت کا سبب معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ حادثاتی موت مرے گا، طبعی موت یا پھر خدا خواستہ وہ کسی شقی القلب شخص کے ہاتھوں قتل ہونے والا ہے۔

ایک گھنٹے تک میں شہر کے مختلف پارک اور مارکیٹیں دیکھتا رہا کئی فقیروں کو دیکھ کر مجھے ان پر امی پراسرار بابا کا گمان گزرا۔ چند ایک فقیروں سے میں نے بابا کا حلیہ بیان کر کے استفسار بھی کیا لیکن کوئی بھی فقیر مجھے بابا کے متعلق نہ بتا سکا۔ آخر کار تھک ہار کر میں نے بابا کی تلاش کا کام صبح تک ملتوی کرتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

رات کو کھانے کی میز پر میری ابو سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس جدید کمپیوٹرائزڈ دور میں ایسی دقیقہ نوسی سوچ محض ایک حماقت ہے وہ آدمی کوئی شعبہ بازی ہی ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ابو..... ابوہ اگر شعبہ بازی ہوتا تو کہیں مجمع لگا کر تماشہ دکھاتا، نجومی ہوتا تو کہیں آفس بنا کر پیش گوئیاں کرتا یوں سڑکوں پر اور پارکوں میں نہ گھومتا پھر تا شعبہ بازی بچہ کمانے کے لئے کئی طرح کے ہتھ کنڈے آزماتے رہتے ہیں گھر میں نے اس بابا کی آنکھوں میں ایسا کوئی لالچ نہیں دیکھا حالانکہ وہاں

پارک میں موجود کئی لوگوں نے برس نکال کر بن گئے
ہی اسے پیسے دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے لوگوں
کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں دی تھی۔
”تم ابھی بچے ہو سرمد۔۔۔“ ایو شفیق انداز میں
بولے۔

”آج کل شعبہ باز دس بیس روپے کو قابل اعتناء
نہیں سمجھتے، ان کی نگاہ لاکھوں پر ہوتی ہے وہ اگر تمہارے
سامنے لوگوں سے دس دس بیس بیس روپے لیتا رہتا
تو پھر تمہیں کیسے متاثر کر سکتا تھا۔ اس نے صرف تمہاری
ہمدردی حاصل کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کی طرف
توجہ نہیں دی۔“

”نہیں ابو۔۔۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔
”میرا دل نہیں مانتا کہ وہ کوئی شعبہ باز تھا۔“
”میں نے اس کی آنکھوں میں سچائی دیکھی
ہے۔“

”پاکل ہو تم۔“ ابو نے کہا۔
”وہ فی الحال تمہیں متاثر کرنے کے چکر میں ہے
۔ جب تم مکمل طور پر اس کے بچھائے ہوئے جال میں
پھنس جاؤ گے تب تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کی آنکھوں
کی سچائی تو صرف ایک دھوکہ تھا۔ اس وقت تمہیں اس کی
آنکھوں میں صرف لالچ نظر آئے گا۔“
میں کافی دیر تک ابو سے بحث کرتا رہا لیکن ای کی
طرح انہیں بھی قائل کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے
بعد ابو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں نے بھی
اپنے کمرے کی راہ لی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے خلاف معمول
تھوڑی دیر تک مطالعہ کیا حالانکہ اس سے قبل میں نے
رات کے وقت بھی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اپنی
داستان کے شروع میں، میں یہ بات بتا چکا ہوں کہ
نصف شب تک دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا میرا
معمول تھا۔ تاہم اس رات پر اسرار بابا ذالے چکر میں
پھنس کر میں گھر سے باہر نہیں نکلا تھا میرے موبائل فون
پر دوستوں کی کالز بھی آتی تھیں لیکن میں نے ناسازی

طبیعت کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا تھا۔
میں خطرناک بہت لاپرواہی و منحہ ہوا ہوں، کوئی بھی کام
نک کر نہیں کرتا، جب بھی ذرا سی سستی یا پوری تھکوت
ہوتی ہے تو میں شوق اور لگن سے شروع کیا گیا منصوبہ
ادھوڑا چھوڑ دیتا ہوں۔

البتہ دو سال قبل میرا ایک شوق ایسا بھی رہا ہے
جسے میں نے پایہ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑا تھا وہ شوق تھا
مارشل آرٹ سیکھنے کا اور میں اسے سیکھ کر ہی رہا۔ آج
میں مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہولڈر ہوں۔ اب تک
فائننگ کے کئی مقابلے جیت چکا ہوں بات کہاں سے
کہاں نکل گئی، حالانکہ میں ذکر کر رہا تھا خلاف معمول
مطالعہ کرنے کا۔

رات کے دس بجے کے قریب میں نے کتاب
ایک طرف رکھ دی اور پھر ٹی وی سپٹ آن کر دیا باقی
گھر والے ٹی وی لاونج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرتے
تھے لیکن میں اپنے بیڈ روم میں دیکھنے کا عادی تھا۔
ریسٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر میں کوئی پسندیدہ چینل
تلاش کرنے لگا اسپورٹس کے علاوہ میں ایکشن
اور ہارمز ویز دیکھنے کا بھی شوقین تھا جلد ہی اپنا مطلوبہ
چینل مجھے مل گیا جس پر ایک ہارورڈ یونیورسٹی کے
ابھی ابتدائی مناظر چل رہے تھے۔ مستقبل بنی پر بنائی گئی
یہ فلم نہ صرف دل چسپ تھی بلکہ بہت زیادہ نفسی نیز بھی
تھی مرکزی کردار ایک لڑکی ادا کر رہی تھی جسے مستقبل
قریب میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا قبل از
وقت پتہ چل جاتا تھا تاہم مستقبل میں پیش آنے والے
واقعات وہ اپنی مرضی سے دیکھنے پر قادر نہیں تھی بس ویسے
ہی کبھی کبھار سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یا جلتے پھرتے کسی
بھی وقت بالکل اچانک چند لمحوں کے لئے اس پر ایک
مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور پھر مستقبل کا کوئی
اہم واقعہ یوں اس کی نگاہوں کے سامنے گھونٹ لگتا تھا
جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو ایسی کیفیت میں وہ جس
کسی کو بھی مصیبت میں گھرا ہوا دیکھتی تھی فوراً اسے آگاہ
کرنے کے لئے ڈھونڈنا شروع کر دیتی تھی۔

بڑی رقم کا مطالبہ با آسانی کر سکتا تھا لیکن اس نے
ایسا نہیں کیا تھا۔
فٹ ہاتھوں پر بیسیوں مستقبل کا حال بتانے
والے بیٹھے ہوتے ہیں ان میں سے بعض بجا رول کو تو یہ
تک معلوم نہیں ہوتا کہ دن، مہینہ اور تاریخ کون سی ہے
مگر دعوے بڑے بڑے کرتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو فراڈ اور بہرہ دہے ہوتے
ہیں وہ سرعام مستقبل بینی کا دعویٰ کرتے ہیں چالیس
پچاس روپے کے کسی بھی شخص کو اس کے مستقبل کا مکمل
زائچہ بنا کر دے دیتے ہیں اس کے علاوہ ایسے بھی
ہوتے ہیں جن کے پاس پنکٹی کے ذرائع ہیں وہ پرنٹ
اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے سے ایسے ایسے دعوے
کرتے ہیں کہ نوحہ باللہ جیسے اللہ تعالیٰ نے مکمل دنیاوی
امور ان کے حوالے کر دیئے ہوں اور وہ جو چاہیں کرتے
پھریں، چاہیں تو کسی کو امیر بنادیں اور کسی کو غریب، کسی
کو بیمار کر دیں اور کسی کو تندرست، من پسند شادی سے
لے کر خاندان اور عدالتی مسائل انہی کے کنٹرول میں
ہوتے ہیں ایسے بہرہ دہوں اور چکر بازوں کی خدمات
حاصل کرتے وقت کوئی بھی یہ سوچنا گوارا نہیں کرتا کہ
حامل اگر اتنا ہی پہنچا ہوا ہے تو وہ اپنے حالات سدھار
نے کے لئے کوئی عمل وغیرہ کیوں نہیں کرتا۔ خود کو امیر
کیوں نہیں بناتا؟ اپنا دعویٰ اور امریکہ وغیرہ کا ویزہ کیوں
نہیں لگوا لیتا؟ گاہک کو اس کا مستقبل بتانے والا اپنے
مستقبل سے کیوں غافل رہتا ہے؟

میں جوں جوں بابا کے شعلق سوچتا گیا میرا یہ
یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ وہ واقعی کوئی صاحب کشف
و کرامات شخص تھا، جو اتفاقاً ہی مجھے ٹکرایا تھا اور میری
بد قسمتی کہ میں اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکا تھا۔

رات دیر گئے تک میں جاگتا رہا اور بے چینی
کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا پھر کسی نہ کسی طرح مجھے
نیند آئی گئی۔

عالم خواب میں ایک بار پھر میں اسی پارک میں
پہنچ گیا میری نگاہیں پارک میں بابا کو تلاش کر رہی تھیں

لوگ اس کی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے اس کا
غناق اڑائے لگتے تھے مگر جب لڑکی کی پیشین گوئی سچ
ثابت ہو جاتی تھی تو اسے لوگ سارہ سمجھنا شروع
کر دیتے تھے چند ایک مجرم پیشہ لوگ تو ہاتھ دھو کر اس کے
پیچھے پڑ جاتے ہیں، وہ اس سے اپنے بجرمانہ منصوبوں
کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے، لیکن لڑکی
صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اپنی مجبوری
بتا دیتی، مجرم اس کا یقین نہ کرتے ہوئے اسے اغوا
کر لیتے، یہیں سے فلم ایک زبردست اور اہم موڑ لیتی
ہے اور پھر اپنے انجام تک دیکھنے والے کو سحر رکھتی ہے۔
فلم دیکھنے کے دوران کئی بار میرا دھیان اس
پر اسرار بابا کی طرف بھی گیا تھا بلکہ سچ تو چھپے تو فلم نے
مجھے سحر کر لیا تھا اور میرے دل میں شدت کے ساتھ یہ
خواہش ابھڑاٹیاں لینے لگی کہ کاش کسی طرح میں بھی
مستقبل کے بارے میں جان سکتا اور فلم کے مرکزی
کردار کی طرح لوگوں کے سامنے پیش گوئیاں کرتا پھرتا
ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ بار بار میرا خیال اپنے نوکرانور
کی طرف بھی چلا جاتا تھا جس کے متعلق بابا نے ایک
جملہ بول کر مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

انہی خیالات میں مستغرق میں نے فلم ختم ہونے
کے بعد ٹی وی آف کر دیا اور پھر سونے کے لئے
بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند مجھ سے روٹی رہی اور اس کی
عالمی دو جہات تھیں ایک تو یہ کہ میں معمول سے بہت
پہلے سونے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا
دماغ مسلسل اس پر اسرار بابا کے بارے میں سوچ رہا تھا
جو بہت کچھ جاننے کے باوجود مجھے کچھ بھی بتانا نہیں
چاہتا تھا۔

ای ابو نے اسے بالکل فراڈ قرار دے دیا تھا
مگر میں ایسا سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے وہ
بابا کوئی بہت پہنچا ہوا انسان لگا تھا دینا داری اسے چھو
کر بھی نہیں گزرتی تھی۔ وہ اگر لالچی یا شعبہ باز یا پھر کوئی
بہرہ دہا وغیرہ ہوتا تو جب میں نے اس سے اپنے مستقبل
کے بارے میں پوچھا تھا تو اس وقت وہ مجھ سے ایک

اور پھر وہ مجھے نظر آئی گیا میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور فریادی انداز میں بولا۔

”خدا کے لئے مجھے مستقبل بنی کی صلاحیت عطا کر دیجیے میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا پلیز مجھے ناامید مت کیجیے۔“

”کفرمت بول نادان.....“ بابا نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”یہ میرے اختیار میں نہیں ہے یہ تو اس اوپر والے کی دین ہے وہ جسے چاہے نواز دے۔ میں تو ایک عام انسان ہوں، میں بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہوں.....؟“

”آپ چاہیں تو اس صلاحیت سے مجھے بھی نواز سکتے ہیں۔“ میں نے انتہائی کی۔

”آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، اس سے کہہ کر کسی کی بھی جھولی بھر سکتے ہیں۔“

”خدا کا خوف کرو میاں، میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں مستقبل کے بارے میں جانتا ہوں.....؟ البتہ جتنا کچھ چاہتا ہے وہ اوپر والا بتا دیتا ہے۔“ اس نے مخصوص انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”درند میری اتنی اوقات کہاں ہے کہ میں اپنی مرضی سے کچھ جان سکوں۔“

”نہیں بابا.....“ میں اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

”آپ مجھے نالائقی کی کوشش کر رہے ہیں لیکن آج میں خالی ہاتھ لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ کو مجھ پر نظر کرم کرنا ہی پڑے گی۔“

”تم نہیں جانتے کہ تم کیا مانگ رہے ہو.....؟“ وہ نا صانع انداز میں بولا۔

”جو چیز پڑے میں ہے اسے پنہاں ہی رہنے دو ورنہ مشکلات میں گھر جاؤ گے۔ اللہ نے تمہیں کیا کچھ نہیں دیا کیوں ناشکرے بن رہے ہو؟“

”آپ کچھ بھی کہیں بابا، لیکن میں کچھ پا کر ہی

آپ کا دامن چھوڑوں گا۔“

”خدمت کرو نادان۔“ بابا نے چلا کر کہا۔ شاید اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی تھی تب ہی وہ غصے میں آ گیا تھا۔

”آگ خوب صورت نظر آنے کے باوجود جلاتی ہے وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اسے چھونے والا کون ہے؟ مرد، عورت، بچہ یا بوڑھا تم پر بھی اس وقت پاگل پن سوار ہے۔ اس لئے اپنا اچھا برا نہیں سمجھ رہے ہو۔“

”اس کا مطلب ہے کہ مری پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔“ میں نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔

”آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے صرف ڈھونگ رچا رکھا ہے۔“

”اے اللہ! میں اس نادان کو کیسے سمجھاؤں۔“ وہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں خدا سے شکوہ کناں ہوا۔

”یہ جان بوجھ کر پھولوں کی جگہ انگارے مانگ رہا ہے میرے مولا اسے ہدایت دے، یہ راستے سے ہٹ گیا ہے۔“

”بابا! میں نے جو مانگا ہے مجھے وہ چاہئے بس اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے۔“

”ت..... تم.....“ بابا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”نفس کے غلام ہو اور نفس کی غلامی کا انت جہنم کے دروازے پر ہوتا ہے۔“

اس کے بعد بابا نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر میں اپنی ضد پراڑا رہا۔ آخر کار بابا نے زچ ہو کر کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم اگر یہی چاہتے ہو تو پھر ایسا ہی سہی لیکن یاد رکھنا تم بہت بچھتاؤ گے..... بہت بچھتاؤ گے۔“

میں نے بابا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا، اس کے بعد مجھے آ نکھیں بند کرنے کا حکم دے دیا جو میں نے بالتردد مان لیا اور فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود ہوا میں بلند ہو کر آگے بڑھنے لگا، میں خود کو کسی پرندے کے مانند ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولنے کے بارے میں سوچا تو اچانک میری سماعتوں میں بابا کی سرسراتی ہوئی آواز گونجی۔ ”جب تک میں نہ کہوں آنکھیں مت کھولنا۔“

اس کا حکم سن کر میں نے آنکھیں کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میرا وجود بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا مجھ پر خوف اور تحسین کی ملی جلی کیفیت طاری تھی

اس سے قبل میں نے صرف فلوں اور ڈراموں میں انسانوں کو فضا میں اڑتے ہوئے دیکھا تھا مگر وہ اڑنا کسیرہ ٹریک کا کمال ہوتا ہے جبکہ میں حقیقتاً فضا میں

اڑ رہا تھا الف لیلی کی کہانیوں کی طرح میرے نیچے نہ کوئی قالین تھا اور نہ ہی کسی جن یا دیو زاد نے میرا ہاتھ

تھاما ہوا تھا مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پراسرار بابا میرے ساتھ فضا میں اڑتا ہوا آ رہا ہے یا پھر کہیں غائب ہو چکا ہے۔

میری شدید خواہش تھی کہ میں آنکھیں کھول کر خود کو اڑاتا ہوا دیکھوں دوسری طرف میں بابا کی حکم عدولی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انتہائی ضبط کا

مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو آنکھیں کھولنے سے روکا ہوا تھا تاہم میرا ایمان لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

قریب تھا کہ میں بابا کی حکم عدولی کرتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی غلطی کر بیٹھتا کہ اچانک ہی میرے

قدموں نے زمین کو چھو لیا۔

”اب آنکھیں کھول دو۔“ فوراً ہی میری سماعتوں سے بابا کی آواز گونجی۔

”مگر اتنا یاد رہے کہ تم نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کرنا اور جیسا میں کہوں گا بالکل ویسا ہی کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے بابا.....“ جواب دیتے ہوئے میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں مگر دوسرے ہی لمحے مجھ

پر چیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میں ایک ایسا جنت نظیر، حسین و جمیل اور سرسبز و شاداب وادی میں کھڑا ہوا تھا

جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی ہمارے چاروں طرف سرسبز و دلکش پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں

قدرت کی منائی کا اعلان کر رہی تھیں۔ وادی میں تقریباً ہر نوع کے پھل دار درخت موجود تھے وہاں پھولوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی جن کی خوشبو سے پوری وادی معطر ہو رہی تھی اور پرینگوں آسمان کی وسعت میں اڑے ہوئے رنگ برنگ پرندے اس قدر خوب صورت نظر

آ رہے تھے کہ میں مہبوت سا کھڑا انہیں دیکھتا رہا نیچے وادی میں بھی پھل دار درختوں پر قسم قسم کے چھوٹے بڑے پرندے چھپا رہے تھے۔

اس خوب صورت وادی کے حسن و جمال نے مجھے سحر زدہ کر دیا اور میں وقتی طور پر بابا کو بھول گیا

چند لمحوں کے بعد جب مجھے اس کا خیال آیا تو میں نے اس کی طرف توجہ دی مگر وہ مجھ سے بالکل لاپتعلق نظر آ رہا تھا یوں جیسے مجھ سے شدید ناراض ہو، میں نے

خدا کر کے اسے رضامند تو کر لیا تھا لیکن اب مجھ سے بے رشتی برت کر شاید وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا جیسے اسے میرا یہ

قدم بالکل پسند نہ آیا ہو۔ میں ابھی اس سے اس حسین و جمیل وادی کے متعلق کچھ پوچھتا ہی جا رہا تھا کہ مجھے

اس کی تاکید یاد آگئی اور میں نے زبان کھولنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کچھ بول کر میں بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا

نہیں چاہتا تھا۔

”چلو.....“ چند لمحوں کے بعد بابا نے حکیمہ انداز میں کہا۔

”لیکن چپ رہنا تم نے اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ہمارے راستے میں کئی پھل

دار درخت اور پودے آئے مگر بابا بے نیازی کے ساتھ ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ تاہم مجھے قسم قسم کے

پھل دیکھ کر بھوک محسوس ہونے لگی تھی لیکن میں نے بابا کی مرضی کے بغیر کوئی بھی پھل نہیں ٹوک سکا تھا بہر کیف

مجھے یہ امید ضرور تھی کہ وہ خود ہی میری بھوک کا احساس

کرتے ہوئے مجھے پھل کھانے کی اجازت دے دیں گے۔

چلتے چلتے ہم دونوں ایک چشمے کے کنارے پہنچ گئے خوب صورت اور رنگ برنگ پتھروں کے اوپر سے گزرتا ہوا چشمے کا پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ تہہ تک سب کچھ واضح نظر آتا تھا وہ منظر اتنا خوب صورت تھا کہ اس سے قبل کبھی میرے گمان سے بھی نہیں گزرا تھا۔ چشمے کے شفاف پانی کو دیکھ کر میری طبیعت لپکانے لگی تھی مگر پھر وہی اندیشہ دامن گیر ہو گیا کہ میں اپنی مرضی سے پانی کو چھوؤں گا تو باہر ناراض ہو جائیں گے معصیت تو یہ تھی کہ میں ان سے اجازت بھی نہیں لے سکتا تھا انہوں نے مجھے بولنے سے پہلے ہی منع کر رکھا تھا میری نگاہیں بدستور چشمے کے شفاف پانی پر لگی ہوئی تھیں کہ

اچانک ہی میں شدت کے ساتھ پیاس محسوس کرنے لگا ایسی پیاس میں نے زندگی میں اس سے قبل بھی محسوس نہیں کی تھی اب میری سب سے بڑی بیک خواہش تھی کہ میں کسی طرح سیر ہو کر پانی کی سکون میں پانی کو لپکائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا کھ بہ لہجہ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

بابا مجھ سے بے نیاز سا ہو کر چشمے کے کنارے موجود پھل دار درختوں کے سامنے نہایت اطمینان کے ساتھ ٹہل رہے تھے انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ ادھر میری پیاس ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی اور مجھے کچھ اس طرح محسوس ہونے لگا کہ اگر میں نے فوراً پانی نہ پیا تو شاید میری سانسیں بند ہو جائیں گی مجھے یوں لگا جیسے سورج کی تمازت ایک دم دوگنی ہوئی ہو۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر پیشانی پر رکھا تو میری ہتھیلی پسینے سے بھج گئی، مجھے اپنا بدن کسی نادیہ آگ میں جھلتا ہوا محسوس ہونے لگا اور دل پہلو میں پوری شدت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ اب میری پیاس بالکل ناقابل

برداشت ہو چکی تھی اور میں غیر ارادی طور پر چشمے کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا تھا میں اپنی دیرینہ خواہش اور بابا کو کبھی بھول چکا تھا بلکہ سچ کہوں تو اس وقت دو گھونٹ پانی کے بارے میں اپنی زندگی سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار تھا چشمے کے کنارے تک پہنچ کر میں ایک دم پانی کی طرف جھک گیا لیکن مجھے پانی پینے کا موقع نہ مل سکا۔ اچانک ہی میری ساعتوں سے بابا کی ٹوک دار آواز گونجی۔

”رک جاؤ بے وقوف آدمی.....“ وہ میری جانب بڑھتے ہوئے بولے۔

”پہلے یہ پھل کھا لو بعد میں پانی پی لینا۔“
”لیکن..... بابا! مجھے سخت پیاس لگی ہے میں پہلے پانی پینا چاہتا ہوں۔“ میں نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

”نہیں.....“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔
”کیا تم بھول گئے ہو کہ تم نے میرا حکم ماننا ہے۔؟“

میں نے بے چارگی کے عالم میں بابا کی طرف دیکھا تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پھل میری طرف بڑھا دیا۔

”لو یہ کھا لو۔“ اس نے حکیمہ انداز میں کہا۔

میں نے بلا تردد سب سے ملتا جلتا پھل ان کے ہاتھ سے لے لیا اور کھانا شروع کر دیا، پھل شکل میں بالکل سیب کی طرح تھا لیکن خاصیت میں نہ صرف سیب سے بہت نرم تھا بلکہ اس کا ذائقہ بھی سیب سے قطعی مختلف تھا، لیکن اور شیریں ذائقہ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا ذائقہ تھا جو اس سے قبل میری زبان نے نہیں چکھا تھا۔

پھل کھاتے ہوئے میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی میں ایک ایسی لذت محسوس کر رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

بابا بڑے غور کے ساتھ میرے تاثرات دیکھ رہے تھے، میں نے دیکھتے ہی دیکھتے سالم پھل کھالیا۔ حیرت

انگیز طور پر اب میری بھوک اور پیاس بالکل ختم ہو چکی تھی اب مجھے کبھی بھی چیز کی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی میں اپنے آپ کو مکمل طور پر چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا اور میری مستقبل بینی کی خواہش بھی کہیں پس پردہ چلی گئی تھی اب میرا دل چاہ رہا تھا کہ چلا گئیں لگا تا ہوا کہیں دور نکل جاؤں اور اس حسین و جمیل وادی کا کوئی نہ کوئی چمکتا پھروں جس کی خوب صورتی نے پہلی ہی نظر میں مجھے مسحور کر دیا تھا۔

بابا میری اس کیفیت سے بے خبر نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کے پاس انسان کا باطن ٹٹولنے والی آنکھیں تھیں۔ وہ انسان کے دماغ میں پیدا ہونے والی سوچیں تک پڑھ لیتا تھا۔

”بس اب پانی پی لو۔“ اس نے قدرے توقف سے میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جو تم سوچ رہے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔

میرا دل چاہا کہ اس سے پوچھوں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، لیکن مجھے اس کی تاکید اچھی طرح یاد تھی اس لیے میں چپ چاپ چشمے کے کنارے بیٹھ کر پانی پینے لگا۔ پھل کی طرح پانی کا ذائقہ بھی منفرد تھا۔ ہلکا اور میٹھا میٹھا سا۔ پاس نہ ہونے کے باوجود میں بہت زیادہ پانی پی گیا۔

پان پنی کر میں اٹھا اور واپس بابا کی طرف پلٹا مگر اس دوران وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر لگا دیں دوڑا میں اسے آواز دیں دیں لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ میں ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ ایک لمحے میں وادی کا سارا حسن و جمال میری نگاہوں میں اپنی دقت کھونے لگا۔ اب میں وہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جگہ میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ نہ جانے وہ وادی دنیا کے کس کونے میں واقع تھی؟ بہر کیف یا کہ جانب منتخب کر کے میں روانہ ہو گیا۔

ابھی میں نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اچانک مجھ پر غنودگی طاری ہوئے لگی اور میری پلکیں خود بخود

جڑنے لگیں۔ شاید یہ چشمے کے میٹھے پانی کی تاثیر تھی یا پھر اس کا تعلق بابا کی براسرار شخصیت سے تھا۔ میں نے نیند سے لڑنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ دوسرے ہی لمحے میں وہیں چشمے کے نزدیک اونگھتا ہوا لیت گیا اور پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بیڈروم میں بستر پر موجود تھا۔ کمرے میں زیر و پاور بلب کی مدہم روشنی بجھ چکی ہوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ مجھ پر ابھی تک خواب کی کیفیت طاری تھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میری زبان ابھی تک اس پھل کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔

”یہ کیسا خواب تھا؟“ میں نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ معاً میری نگاہ اپنے پیروں پر پڑی اور میرے بدن میں منشی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی۔ میرے پیروں میں جوتے موجود تھے۔ تو مجھے مدہم اور ہلکی سی سرگوشی سنائی دی۔

”سر مد اب تم دنیاوی پھروں میں بالکل نہ پھنسا، بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا۔ تمہارا دل پر سکون اور مطمئن رہے گا۔ امید ہے اب تمہیں مستقبل بینی کی خواہش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

پھر بابا نے حق اللہ کا نعرہ لگا دیا اور آواز معدوم ہو گئی۔

آواز کے معدوم ہوتے ہی مجھے قلبی سکون کا احساس ہوا، میری مستقبل بینی کی خواہش اپنا دم توڑ چکی تھی۔ میں اب خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ اور میں نے تمہیر کر لیا کہ اپنی پوری زندگی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سے کسی طور غافل نہیں رہوں گا۔

اور اب اس واقعے کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، ہر وقت عمر رفتہ کا خیال رہتا ہے، بابا کی ہر وقت یاد آتی ہے، مگر اب بابا نہ ہی خواب میں اور نہ ہی جاگتی آنکھوں سے کہیں نظر آتے ہیں۔

☆☆

برفانی طوفان

منزلہ محسن۔ کراچی

میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں، لیکن مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے اور کہاں ہے..... نامعلوم میری قسمت میں اس سے کبھی ملنا ہے بھی کہ نہیں۔

ہماری تاریخ کا ناقابل فراموش دور تھا۔ 1811ء کے اختتام کا ذکر ہے کہ معزز گادریلا گادریلو وچ اپنی جاگیر نینارادو وائیں رہتے تھے۔ علاقہ بھر میں ان کی رحم دلی اور مہمان نوازی کا چرچا تھا۔ ان کے قریبی پڑوسی اکثر ان کے ہاں آتے رہتے تھے، بعض کھانے پینے کے شوق میں، بعض ان کی بیوی کے ساتھ پانچ کوپک کی بازی لگا کر کھیلنے کے لئے، اور بعض ان کی بیٹی ماریا گادریلو ونا کے شوق دیدار میں، اس سترہ سالہ نازک اندام دوشیزہ کے بہت سے امیدوار تھے، لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک امیر واپس ثابت ہوگی۔ کوئی خود شادی کرنا چاہتا تھا اور کوئی اپنے بیٹے سے اس کی شادی کا خواہشمند تھا۔

ماریا گادریلو ونا بچپن سے رومانی فرانسیسی ناول پڑھ پڑھ کر پلی تھی۔ لہذا عشق میں مبتلا تھی، اس کا محبوب ایک غریب اور ادنیٰ فوجی افسر تھا جو چھٹیاں گزارنے اپنے آبائی گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ عشق کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ لیکن جو بیٹی ماریا کے والدین کو اس دورِ فخرِ راج کا پتہ چلا، انہوں نے بڑی سختی سے اپنی بیٹی کو اس نوجوان کا خیال دل سے نکال دینے کا حکم دیا اور نوجوان سے ان کا برتاؤ اس قدر سرد و مہری کا ہو گیا گویا وہ جملہ انکار کی کارِ ریشاڑو جھڑپ ہو۔

اس پر بھی یہ محبت کے دیوانے کسی نہ کسی طرح کرنے میں کافی ہچکچاہٹ تھی۔ بھاگنے کی کتنی ہی

خوفناک کہانیاں [234] اپریل 2018ء



تجویزیں پیش ہوئیں اور سترہ دہائیں مگر آخر کار وہ بھی راضی ہوگئی۔ طے یہ پایا کہ فرار ہونے کے دن وہ کھانے پر نہ جائے اور سر کے درد کا بہانہ کر کے کمرے میں لپٹی رہے۔ اپنی ایک خادمہ کو شریک راز بنالے۔ رات گئے دونوں لڑکیاں بچھلی طرف سے باغ میں اتر جائیں جہاں ان کو گاڑی تیار ملے گی۔ اس میں بیٹھ کر وہ نینارادو ونا سے پانچ کوس دور ژادرینو کے گاؤں میں پہنچ کر سیدی مگر جا بھر کے سامنے جا آئیں۔ وہاں ولادیمیر ان کا منتظر ہوگا۔

بھاگنے سے ایک دن پہلے ماریا گادریلو ونا رات بھر نہ سوئی، کچھ دیر تو ساتھ لے جانے کے لئے کپڑے وغیرہ رکھتی رہی، پھر ایک طویل دردمیڑا خط اپنی ایک جذباتی بھیلی کے نام لکھا۔ ایک اور خط اپنے والدین کو لکھا جس میں اس نے نہایت برا اثر انداز میں ان سے رخصت چاہی اور لکھا کہ جذبہ عشق سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا رہی ہوں۔ لیکن سچی خوشی مجھے اس

وقت ہوگی جب آپ معاف کر کے اپنے قدموں پر سر جھکانے کی اجازت دیں گے۔ پھر اس نے دونوں خطوں پر شہر تو لا کی بنی ہوئی مہر لگائی جس پر ایک باموقع تحریر کے اوپر دو بھڑکتے ہوئے دل کندہ تھے، دن نکلنے سے پہلے وہ بڑھ چلا ہو کر بستر پر گر پڑی اور کچھ دیر کو اس کی آنکھ جھپک گئی۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ژادرانے خواب دیکھ کر چونک اٹھی۔ کبھی دیکھتی کہ گر جا جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس کا باپ عین وقت پر آ جاتا ہے اور اسے ایک اٹھارہ تارک غار میں پھینک دیتا ہے، وہ نہایت تیزی سے نیچے کی طرف گرتی جا رہی ہے اور جیسے اس کے دل کی حرکت بند ہونے کو ہے دوسری دفعہ سوئی تو اس نے ولادیمیر کو خون میں شرابور نیم جان گھاس پر پڑے دیکھا مرنے مرنے وہ بڑے دغراش لہجے میں شادی میں جلدی کرنے کی التجا کرتا ہے۔ اس طرح کے بے ربط خوفناک ہیولے خواب میں اس کی نگاہوں کے

خوفناک کہانیاں [235] اپریل 2018ء

سامنے سے گزرتے رہے۔

آخر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور سر میں سچ سج درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی حالت دیکھ کر شکر ہو گئے اور بہت محبت سے پوچھا ماشا کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟ ان کی دلجوئی دل پر برہمی کی طرح لگی اس نے چاہا کہ ان کی فکر دور کرنے کو چہرے پر خوشی پیدا کر سکے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی شام ہوئی تھی اس کے دل میں اس خیال سے ہوک اٹھ رہی تھی کہ خاندان والوں کی محبت بھری آغوش میں یہ اس کی آخری شام ہے اس کا دم جیسے گھٹ جا رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی جانی پہچانی ہر چیز کو الوداع کہا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور ماں باپ کو شب بخیر کہا۔ انہوں نے حسب معمول پیار کیا اور دعا مانگیں دیں۔ ماریا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے بڑی مشکل سے کمرے تک پہنچی اور دروازہ بند کرتے ہی کرسی پر بے قابو ہو کر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خادمہ نے اسے تسلی بخشی دی جانے کی سب تیاریاں مکمل تھیں اُدھا گھنٹے بعد ماشا اپنے والدین کے گھر اپنے کمرے اپنی بچپن کی لہڑ اور بے فکر زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والی تھی۔ باہر طوفانی برقیاری ہو رہی تھی ہوا غرار ہی تھی جھلملیاں چرچرا رہی تھیں اسے یہ سب چیزیں کسی بدشگونی کی علامتیں معلوم ہو رہی تھیں کچھ دیر میں سارا گھر نیند کے جادو میں مدھوش ہو گیا۔ ماشا نے سر پر شال اوڑھی گرم لبادہ لپیٹا اپنے زیور کا صندوقچہ اٹھایا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔ پیچھے پیچھے خادمہ ہاتھ میں دو پارسل اٹھائے تھی دونوں باغ میں پہنچیں طوفان کی تیزی میں ذرا کی نہ ہوئی تھی منہ پر ہوا کے تھپڑے نو عمر مجرم کو گناہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ غرض وہ بمشکل باغ کے دوسرے سرے تک پہنچیں سڑک پر سب ان کے انتظار میں کھڑی تھی، گھوڑے سردی سے ٹپک ہو چکے تھے اور

دوڑنے کے لئے بے قرار ہو کر ناچیں مار رہے تھے۔ ولادیمیر کا کوچوان گاڑی کے بموں کے سامنے ٹپک رہا تھا تاکہ کسی طرح جو شیشے گھوڑوں کو قابو میں رکھ سکے۔ اس نے سہارا دے کر ماریا اور اس کی خادمہ کو گاڑی میں بٹھایا۔ بٹول اور صندوقچہ اندر رکھا لگاں تھا تھے ہی گھوڑے سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگے اب ہیروئن کو قسمت اور کوچوان تریکا کی مہارت کے سپرد کر کے ہم نو جوان عاشق کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔ ولادیمیر دور بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ صبح کو پہلے تو ڈاؤرینو کے پادری صاحب کے پاس گیا اور ان کو بڑی مشکل سے شادی کی رسم ادا کرنے پر راضی کیا۔ پھر وہ گواہوں کی تلاش میں آس پاس کے زمینداروں کے ہاں جانے کے ارادہ سے نکلا۔ سب سے پہلے وہ دراوٹ نامی ایک چالیس سالہ ریٹائرڈ عہدیدار کے ہاں گیا جو فوراً گواہی دینے پر راضی ہو گیا اور کہنے لگا کہ اس تذکرے سے مجھے پرانے زمانے کی فوجی زندگی کی ہنگامہ خیزیاں یاد آئیں گی۔ اس نے ولادیمیر کو کچھ دیر ٹھہرنے اور اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت بھی دی اور یقین دلایا کہ اسے بقیہ دو گواہ بھی باآسانی مل جائیں گے اور ہوا بھی یہی، کھانے کے فوراً بعد انسپکٹر اراضی حمت موہنچیں چڑھائے ہمیز لگائے قصبہ کے پولیس انسپکٹر کے بیٹے کے ہمراہ داخل ہوئے یہ نو جوان جس نے عمر کی سولہ بہاریں دیکھیں تھیں حال ہی میں الائنز کی رجمنٹ میں بھرتی ہوا تھا جب انہوں نے ولادیمیر کی درخواست سنی تو نہ صرف وہ خوشی سے گواہ بننے پر راضی ہو گئے بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ اس کی خاطر جان تک دینے میں دریغ نہ کریں گے۔ ولادیمیر جوش و خروش کے ساتھ ان سے گلے ملا اور خوش خوش باقی تیاریاں کرنے اپنے گھر چل دیا۔

شام کا دھندلکا چھپا تھا اس نے اپنی تین گھوڑوں کی گاڑی اپنے معتمد تریکا کے ساتھ مکمل ہدایات دے کر نینار اودو وار روانہ کی اور خود اپنی چھوٹی ایک گھوڑے کی برف گاڑی لے کر ڈاؤرینو کی طرف

روانہ ہو گیا جہاں دو گھنٹے بعد ماریا کا گریلو ونا کے آنے کی آمد تھی۔ راستہ اس کا جانا بوجھا تھا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ولادیمیر گاڑوں سے باہر نکلا ہی تھا کہ ہوا میں تندہی پیدا ہوئی اور برقانی طوفان نے وہ شدت اختیار کی کہ ولادیمیر کو کچھ نظر نہ آتا تھا منٹ بھر میں سڑک پر برف کی تہہ بچھ گئی اور ارد گرد کی سب چیزیں ایک بے نور پیلے دھندلکے میں ڈوب گئیں جس میں برف کے سفید گالے تیر رہے تھے زمین اور آسمان مل کر ایک ہو گئے۔ اسے میں ولادیمیر کو احساس ہوا کہ اس کی گاڑی کسی کیفیت میں ٹپک رہی ہے اس نے دوبارہ سڑک پر گاڑی ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ گھوڑا کسی نامعلوم سمت میں اڑا چلا جا رہا تھا کبھی برف کے تودوں میں جا پھنستا، کبھی کسی گڑھے میں بھٹک جاتا۔ ہر لمحہ گاڑی الٹ جاتی تھی ولادیمیر کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ راستے کا سراغ نہ کھو جائے۔ اسی حالت میں (اس کے خیال میں) اسے اُدھا گھنٹہ گزر گیا مگر وہ ڈاؤرینو کے جنگل تک نہ پہنچ سکا دس منٹ اور گزر گئے لیکن پھر بھی درختوں کا جھنڈ نہ دکھائی دیا اب وہ ایک ایسے کھلے میدان میں جا پہنچا تھا جہرے گہری گھاٹیوں نے آڑا تر چھا کاٹ رکھا تھا طوفان اسی شدت سے جاری تھا آسمان بادلوں سے چھپا ہوا تھا گھوڑا تھک چکا تھا اور ولادیمیر برف میں کمر تک دھنسا ہوا ہونے کے باوجود پسینے میں شرابور تھا۔

بہت دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ بالکل غلط طرف جا رہا ہے اس نے لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اندازہ کرنا چاہا کہ وہ کس طرف ہے اور اب اسے کدھر مڑنا چاہیے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اسے دائیں ہاتھ کی طرف مڑنا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اسی طرف چل پڑا۔ گھوڑا بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح راستے پر ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔ اور اس نے سوچا کہ اب ڈاؤرینو زیادہ دور نہ ہوگا وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ان کھیتوں کا کہیں

اختتام ہی نہیں ہے۔ ہر طرف برف کے انبار اور گھاٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا ہر قدم پر گاڑی الٹ الٹ جاتی تھی اور ولادیمیر ہر بار گاڑی کو ٹھیک اور سیدھا کرتا تھا۔ وقت گزرتا گیا ولادیمیر کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

بہت دیر بعد اسے افق پر ایک سیاہ دھبہ نظر آیا، ولادیمیر نے فوراً گھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا نزدیک آیا تو اسے ایک جنگل دکھائی دیا اس نے یہ سمجھ کر کہ اب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا ہے خدا کا شکر ادا کیا، گھوڑے کو تیز کیا تاکہ جلد از جلد جنگل کو پار کر کے دوسری طرف جانی پہچانی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے وہ بھٹک گیا تھا۔ اسی سڑک کے دوسری طرف ڈاؤرینو تھا چند منٹ میں وہ سڑک پر پہنچ گیا گاڑی موسم سرما کے بے برگ وبار درختوں کے اداس سایوں کے نیچے چلنے لگی یہاں ہوا کا زور کم تھا سڑک ہموار تھی گھوڑے میں بھی کچھ دم آ گیا تھا اور ولادیمیر کے حواس بھی کچھ درست ہوئے۔

وہ یونہی بڑھتا گیا مگر حد نظر تک ڈاؤرینو کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جنگل کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا ہر گھوڑی دیر بعد اسے اس خیال سے وحشت ہونے لگتی کہ اب وہ کسی اور انجانے جنگل میں بھٹک گیا ہے۔ پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے گھوڑے کو بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ بے چارہ گھوڑا پہلے تو بوکھلا کر سرپٹ بھاگا مگر پندرہ منٹ بعد تھک کر پھر قدم قدم چلنے لگا اور پھر مصیبت زدہ ولادیمیر کی انتہائی کوشش پر بھی اس کی رفتار میں جتنی پیدا نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ گنا جنگل چھٹ گیا مگر جب ولادیمیر باہر نکلا تو بھی ڈاؤرینو نظر نہ آیا۔ اسے یقین تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے اندھا دھند گاڑی چلائی شروع کر دی۔ طوفان ٹپک چکا تھا بادل اڑ گئے تھے حد نظر تک سفید برف سے ڈھکا ہوا میدان لہریں لے رہا تھا۔ رات خاصی روشن تھی دفعتاً ذرا فاصلے پر اسے ایک چھوٹی سی بستی نظر

آئی گھوڑے کو تیز کر کے اس کے قریب پہنچا اور پہلے
جھوپڑے کے قریب گاڑی سے کود پڑا اور کھڑکی کا پٹ
دھڑ دھڑانے لگا منٹ بھر بعد چوٹی چھلی کھلی اور ایک
بوڑھے آدمی نے سفید واڑی باہر نکال کر جھانکا کیا کام
ہے؟ کیا ڈارو بیٹو یہاں سے بہت دور ہے؟ نہیں زیادہ
دور نہیں ہے، کوئی دس کوس ہوگا، یہ سن کر ولادیمیر نے
اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ اس وقت اس کی حالت
اس آدمی کی سی تھی جس نے مزائے موت کا حکم سنا ہو۔
”تم کہاں سے آرہے ہو؟“ مگر ولادیمیر کی
جواب دینے کی طاقت گویا سلب ہو چکی تھی بڑے میاں
کیا مجھے ڈارو بیٹو تک جانے کے لئے گھوڑا مل سکتا ہے۔
”الٹی ہمارے ہاں کیا گھوڑے بندھے ہوئے ہیں؟“
اچھا کوئی مجھے وہاں کا راستہ دکھا سکتا ہے؟ میں اسے منہ
مالکا انعام دوں گا۔ ایک منٹ ٹھہرا اس نے کھڑکی بند
کرتے ہوئے کہا ”میں اپنے بیٹے کو بھیجتا ہوں وہ تمہیں
راستہ بتا دے گا۔“ ولادیمیر انتظار کرنے لگا لیکن اسے
ایک منٹ گزارنا مشکل ہو رہا تھا اس نے پھر کھڑکی پر
ہاتھ مارا کھڑکی کھلی اور وہی سفید واڑی دوبارہ نمودار
ہوئی کیا ہے تمہارا بیٹا کہاں رہ گیا؟ ابھی آتا ہے ذرا
جوتے پہن رہا ہے۔ اندر آ جاؤ اگر سردی لگ رہی ہو تو
آگ تاپ لو۔ نہیں..... نہیں مجھے بہت جلدی ہے اپنے
بیٹے کو بھیج دو جلدی سے۔

دروازہ چڑھایا اور ایک نو جوان لڑکا سونا ہاتھ
میں لئے باہر نکلا اور آگے آگے چلنے لگا کبھی وہ اشارے
سے راستہ دکھاتا، کبھی رک کر راستے کا کھوج لگاتا
کیونکہ برف نے سب نشانات مٹا دیے تھے ولادیمیر
نے اس سے وقت پوچھا۔ صبح ہونے والی ہے وہ بولا یہ
سننے ہی ولادیمیر کی زبان لنگ ہو گئی۔

جب وہ ڈارو بیٹو پہنچے تو سرخ بانگ دے رہے
تھے۔ پھو بھٹ چکی تھی گر جا کے دروازے میں تالا پڑا تھا
ولادیمیر نے رہبر کو انعام دیا اور یادری کے گھر کی
طرف چل پڑا۔ مگر گاڑی وہاں بھی نہ تھی پتہ نہیں آگے
کیا ہونے والا تھا۔

اب ہم نینار ادووا کے کینوں کی طرف لوٹتے
ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔
مگر وہاں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ لوگ
حسب معمول اٹھے ماریا کے معمر والدین روز کے
معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔
ماریا گاوریلا گاوریلوچ شب خوانی کی ٹوٹی اور فلاپین
کی واسٹ پہنے ہوئے تھے اور پراسکوویا پترونا روئی
کے فرغل میں ملبوس تھیں سادہ کمرے میں لا کر رکھا گیا
گاوریلا گاوریلوچ نے ایک خادمہ سے کہا کہ جا کر
ماریا گاوریلوچ کی طبیعت پوچھو اور معلوم کرے کہ ان
کورات کو کیسی نیند آئی؟ خادمہ ذرا دیر بعد واپس آئی
اور کہنے لگی کہ بی بی کو نیند تو اچھی طرح نہیں آئی مگر
طبیعت بہتر ہے وہ ابھی نیچے آ رہی ہیں اسی وقت
دروازہ کھلا اور ماریا گاوریلوچ نے داخلہ کر اپنے
والدین کو سلام کیا۔

ماشائیں تھارے سر کا رداب کیسا ہے؟ گاوریلا
گاوریلوچ نے پوچھا، بہتر ہے پاپا، اس نے جواب
دیا، کل دیر تک آتشزدگی کے پاس بیٹھے رہنے سے سر
میں درد ہوا ہوگا، پراسکوویا پترونا نے کہا شاید یہی بات
ہو ماں، ماشائے کہا۔

دن بخیر و خوبی گزر گیا مگر رات کو ماشائیں پڑ گئی
قریب کے قصبے سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا جو اگلے دن شام
ہوئے وہاں پہنچا اس وقت تک ماشائیں سرسائی کیفیت
ہو چکی تھی۔ بخار بہت تیز تھا غریب لڑکی دو ہفتے تک
موت اور زندگی کی تکس میں جتلا رہی۔

گھر میں کسی کو اس کے فرار ہونے کا علم نہ تھا ماشائیں
نے جانے سے پہلے جو خط لکھے تھے واپسی پر جلا دیے
ماشائیں خادمہ نے اپنے آقا کے ڈر سے کسی کے سامنے
ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا یادری، ریٹائرڈ فوجی
عہدیدار مومچنوں والا اسپتال راضی اور نو جوان فوجی بھی
اپنی اپنی مصیحتوں سے خاموش تھے یہاں تک کہ سائیں
تربشکا کے منہ سے بھی کبھی کوئی بات نہ نکلی، نشے کی
حالت میں بھی نہیں اور اس طرح یہ راز جس میں چھ

سات آدمی شامل تھے راز ہی رہا لیکن ماریا گاوریلوچ
نے اپنی طویل ہڈیانی حالت میں خود ہی یہ راز اگل دیا
مگر اس کی باتیں اتنی ناقابل فہم تھیں کہ اس کی ماں جو
دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں صرف اتنا
سمجھ سکیں کہ ان کی بیٹی ولادیمیر نیکولائے وچ سے بے
تجاشہ محبت کرتی ہے اور شاید یہ محبت ہی اس کی بیماری
کی جڑ ہے۔ اس نے اس بات کا اپنے شوہر سے ذکر کیا
انہوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور سب کی سبھی
راے ہوئی کہ شاید لڑکی کی قسمت میں یہی لکھا ہے اور
تقدیر کے لکھے سے کوئی مفر نہیں انہوں نے اپنے دل کو
یہ کہہ بھی سمجھایا کہ مغلیں کوئی جرم نہیں اور زندگی
روپیوں کی پھلی کے ساتھ نہیں گزاری جاتی بلکہ انسان
کی رفاقت میں بسر ہوتی ہے۔ غرض اس قسم کے اور
سب فرسودہ قول دھرائے گئے جو ایسے موقعوں پر کام
آتے ہیں جب ہم اپنے فیملوں کی اور کوئی توجیہ نہیں
کر سکتے۔

اسی دوران میں لڑکی رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے
لگی ولادیمیر بہت عرصے سے گاوریلا گاوریلوچ کے
ہاں نہ آیا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں کے برتاؤ سے کافی
خائف ہو چکا تھا۔ اب اسے ایک دن خاص طور پر بلایا
گیا اور ماشائے شادی کی غیر متوقع خوشخبری سنائی گئی۔
نینار ادووا کے مالکوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب
جواب میں انہیں اس نو جوان کا ایک نیم جھوٹا خط ملا
جس میں اس نے لکھا تھا کہ آئندہ ہمیں وہ ان کی دہلیز پر
قدم نہ رکھے گا اور یہ کہ وہ اس قسمت کے ستارے
بد نصیب کو بالکل بھول جائیں جس کے لئے اب
سوائے موت کے کوئی چارہ نہیں..... چند دن بعد سنا گیا
کہ وہ واپس فوج میں چلا گیا ہے یہ واقعہ 1812ء کا
ہے۔

زمانہ گزرتا رہا، کسی کو بیمار ماشائے سامنے اس
واقعہ کا ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خود ماشائے بھی
ولادیمیر کا نام تک زبان سے نہ نکالا کئی مہینے بعد اتفاق
سے اس نے ان لوگوں کی فہرست دیکھی جنہیں بورڈینو

کی جنگ میں جانا بازی کے انعام میں تمغے عطا ہوئے
تھے اور جو خطرناک طور پر زخمی ہو گئے تھے اس فہرست
میں ولادیمیر کا نام دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ سب کو
اندیشہ ہوا کہ کہیں پھر بخار نہ رہنے لگے مگر شکر ہے کہ اس
بے ہوشی کا کوئی خطرناک نتیجہ نہیں نکلا۔

چند ہی دنوں بعد اس غریب کو ایک اور صدمہ پہنچا
پڑا یعنی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اب وہ ساری
جائیداد کی تہا وارث تھی مگر اس ورثے سے اسے کوئی
خوشی نہ ہوئی۔ اس کا دل اپنی غمزہ ماں کی بیوی کے دکھ
سے اتنا بے قرار تھا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ کبھی اس سے
جدانہ ہوگی۔ نینار ادووا سے بہت سی ممکن یادیں وابستہ
تھیں اس لئے دونوں ماں بیٹیاں وہاں سے اپنی جاکیر
کے ایک گاؤں میں رہنے چلی گئیں۔

وہاں بھی اس حسین امیر زادی کے گرد
امیدواروں کا ایک جھمکتا ہو گیا مگر اس نے کبھی کسی کی
ہمت افزائی نہ کی اس کی ماں اکثر اس کو زندگی کا ساشی
چھنے پر اکساتی تھی تو ماریا گاوریلوچ سارے ہلا کر خاموش
ہو جاتی۔ ولادیمیر اب اس دنیا میں نہ تھا جس دن
فرانسیسی ماسکوں میں داخل ہوئے اس شام اس نے دم توڑ
دیا۔ ماشائے اس کی یاد کی مقدس سرمائے کو سینے سے لگا
رکھا تھا اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی یادگار محفوظ تھی۔ اس
کی کتابیں، اس کی بنائی ہوئی تصویریں، اشعار اور
موسیقی جو اس نے ماریا کے لئے نقل کئے تھے سب جوں
کے توں محفوظ تھے جب ہمسایوں کو اس بات کا علم ہوا تو
وہ اس وفا پرستی پر دگہر گئے اور سوچنے لگے کہ ما معلوم
وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس پاکباز آئرس کی
سوغات و فاشعار پر فخر پائے گا۔

اسی دوران میں جنگ ختم ہو گئی اور ہماری فوجیاب
فوجیں دوسرے ملکوں سے واپس آنے لگیں۔ ہیڈ پر
مفتوح دشمن سے جھپٹے ہوئے نغموں ”ویو ہنری کا تر“
ترولیز والٹر اور لا جوگنڈ کی دھنیں بجائی جانے لگیں۔
افسر جو بھرتی کے وقت محض کس لڑکے تھے میدان جنگ
سے پختہ کار اور باشعور ہو کر بہادری کے تحفے سینوں پر

لگائے واپس لوٹے ہر طرف فوجی خوش خوش آپس میں چہلیں کرتے تو ان کی گفتگو میں فرانسسی اور جرمن لفظوں کی آمیزش ہوتی وہ بھی کیسے ناقابل فراموش دن تھے! فتح کا دمرانی کے دن! ہر روزی کا دل لفظ وطن کی پکار پر کس شدت سے دھڑکتا تھا برسوں کی جدائی کے بعد ملاقات کے آنسو کس قدر شیریں تھے سب روسیوں کے دل میں فوجی و مہمبات اور زار کی محبت کا جذبہ ہم معنی ہو چکا تھا اور خود زار کے لئے یہ لمحہ کس قدر محبوب آفریں تھا!

اور اس زمانے میں روسی عورتوں کی دلوازی بے مثال تھی ان کی فطری سردمیری غائب ہو چکی تھی وہ خوشی کے نشے میں سرشار تھیں جب وہ فاتح نو جوانوں سے ملتیں تو اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال اچھال کر نعرے بلند کرتیں۔

اس زمانے کا کوئی فوجی افسر ایسا نہیں جو یہ نہ مانے کہ اس کی جانبازی کا سب سے بیش قیمت صلہ کسی روسی نازنین کا مہر ہون منت تھا۔

اس خیرہ کن زمانے میں ماریا گاوریلوونا اپنی ماں کے ساتھ ”خ“ میں رہتی تھی اس نے وہ جوش و خروش نہیں دیکھا جو فوجوں کی آمد کے جشن پر دونوں دارالحفاظوں میں تھا لیکن ہر طرف ایک عام جوش پھیلا ہوا تھا جو گاؤں میں شہروں سے بھی بڑھ گیا تھا ان جگہوں میں کسی افسر کا نظر آنا ایک شاندار واقعہ تھا اس کے سامنے اور نو جوانوں کی کوئی بات تک نہ پوچھتا۔

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ باوجود سردمیری کے ماریا گاوریلوونا چاہنے والوں کے مجمع میں گھری رہتی تھی مگر اس زمانے میں ایک زخمی فوجی افسر جس کا نام کرل برمن تھا اس علاقے میں آیا اور چند ہی دنوں میں اور سب نو جوان پس پشت پڑ گئے۔ اس کے سینے پر سینٹ جارج کا تمغہ آویزاں تھا اور مقامی نو جوان لڑکیوں کے خیال میں اس کے چہرے کی رنگت میں ایک دلکش زردی تھی۔ اس کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوئی وہ چہٹیوں میں اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کرنے آیا

تھا جو ماریا گاوریلوونا کی جاگیر کے بالکل قریب تھی۔ ماریا گاوریلوونا بھی اس کے ساتھ کچھ خصوصیت برتی تھی۔ اس کی موجودگی میں ماریا کے چہرے کی عکسین شگفتگی میں تبدیل ہو جاتی اور گواس کے انداز میں عموہ و ناز کا شائبہ تک نہ تھا مگر کوئی شاعر اس کو دیکھتا تو کہہ اٹھتا ”اگر یہ محبت ہیں تو کیا ہے؟“

برمن کی شخصیت بڑی دلادیز تھی اس کی طبیعت اس قسم کی تھی جو عورتوں کے لئے خاص طور پر پرکشش ہوتی ہے شائستہ اور بااخلاق تصنع اور بناوٹ سے پاک، ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی شرافت کی چاشنی انداز میں۔ ماریا گاوریلوونا کے سامنے اس کے انداز میں نہایت سادگی ہوتی مگر وہ جو کچھ کہتی جہاں کہیں جاتی برمن کا خیال اور نظریں اس کا پیچھا کرتے بظاہر وہ بڑا خاموش طبیعت اور محتاط تھا لیکن یہ افواہ سن گئی تھی کہ کسی زمانے میں وہ بڑا مچھلا تھا مگر ماریا گاوریلوونا کی نظروں میں اس وجہ سے اس کی قدر کچھ کم نہ ہوئی کیونکہ اور نو جوان لڑکیوں کی طرح وہ بھی گرمی جذبات اور جرأت کی مداح تھی۔

مگر جس چیز نے ماریا کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ برمن کا شریفانہ انداز، مزاحیہ اور دلچسپ گفتگو، چہرے کا دلکش حزن اور زخمی باز و نہ تھا بلکہ وہ ضبط اور سمجھک تھی جو برمن کے انداز سے ظاہر تھی۔ ماریا گاوریلوونا کو یقین تھا کہ برمن کے دل پر محبت کا نقش پڑ چکا ہے دوسری طرف برمن بھی اپنی فراست اور تجربے کی مدد سے یہ جانتا تھا کہ ماریا گاوریلوونا اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے اسی لئے ماریا گاوریلوونا کو حیرت تھی کہ آج تک برمن نے اس کے قدموں پر جھک کر اظہار محبت کیوں نہیں کیا۔ کس خیال نے اسے روک رکھا ہے؟ یہ سچی محبت کی بے زبانی تھی یا خودداری اور تکبر، یا تجربہ کار کھل کھیلے ہوئے مرد کی عیاری، وہ ماریا گاوریلوونا کے لئے معہہ بنا ہوا تھا۔ آخر بڑے غور و فکر کے بعد اس نے یہی طے کیا کہ پاس محبت ہی برمن کو اظہار جذبات سے روکے ہوئے ہے چنانچہ اس کی

ہمت افزائی کرنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اور بھی خصوصیت کا اظہار کرے گی بلکہ موقع پڑنے پر قہوڑے بہت التفات سے پیش آئے گی۔ اس نے ایک ایسی تجویز سوچی جو بالکل غیر متوقع ہوگی اور جو برمن کو اپنے دل کا حال کہنے پر مجبور کر دے گی۔ عورت کے دل کو معیوں سے بڑی آجھن ہوتی ہے خیر ماریا گاوریلوونا کی یہ کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ برمن ہر وقت کسی خیال میں کھویا کھویا رہنے لگا اس کی نگاہ شوق اس والہانہ انداز سے ماریا گاوریلوونا کے چہرے کی بائیں لپٹی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ کن لمحہ آچکا ہے۔ پڑوسیوں میں شادی کا تذکرہ اس طرح ہونے لگا گویا یہ کوئی طے شدہ بات ہو، نیک دل پر اس کو یاد پڑتا تھا وہ بھی خوش تھیں کہ آخر ان کی بیٹی نے اپنے لئے ایک لائق برجن لیا۔

ایک دن معمر خاتون ڈرائنگ روم میں تاش پھیلائے پشیش کھیل رہی تھیں کہ برمن داخل ہوا اور ماریا گاوریلوونا کے متعلق پوچھا۔ ”وہ باغ میں ہے“ معمر خاتون نے جواب دیا۔ ”تم وہی چلے جاؤ میں یہاں تم دونوں کا انتظار کرتی ہوں۔“ برمن باہر چلا گیا۔ بڑی بی بی نے مارے خوشی کے اپنے پر صلیب کا نشان بنایا، انہیں یقین تھا کہ آج سب معاملہ طے ہو جائے گا۔

برمن نے دیکھا کہ ماریا گاوریلوونا سفید لباس میں ملبوس تالاب کے کنارے بید بخنوں کے درخت کے سائے میں کتاب پڑھ رہی ہے۔ بالکل جیسے کسی ناول کی ہیروئن ہو، معمولی علیک سلیک کے بعد ماریا گاوریلوونا جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔ اس خاموشی نے دونوں کے درمیان جھجک اور ہلکی سی گھبراہٹ پیدا کر دی جس کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ برمن اپنی محبت کا اظہار کر دے اور ہوا بھی یہی، برمن کو اس وقت کی خاموشی کے بے شک پن کا احساس تھا۔ ایک دم اس کی زبان کو گویائی مل گئی۔ اس نے کہا کہ مدت سے وہ ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ اپنا حال دل

ماریا گاوریلوونا کے سامنے بیان کر سکے۔ پھر اس نے اکتیا کی لمحے بھر کے لئے اس کی بات توجہ سے سنے۔ ماریا گاوریلوونا نے کتاب بند کر دی اور آنکھیں جھکا کے اسے عرض شوق کی اجازت دے دی۔

”مجھے تم سے محبت ہے، انتہائی محبت ہے“ (ماریا گاوریلوونا کے گال شرم سے چمٹانے لگے اور سر اور بھی جھک گیا) میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی، میں جانتا ہوں کہ تمہیں روز دیکھنے اور تمہاری شیریں گفتگو سننے کی آرزو میری بڑی نادانی تھی۔ (ماریا گاوریلوونا کو سینٹ پرے کے پہلے خط کا خیال آیا) مگر آہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، اب میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ تمہاری یاد، تمہاری حسین اور بے مثل تصویر ہمیشہ میرے دل پر نقش رہیگی، جو میری زندگی کی واحد خوشی بھی ہوگی اور رنج کا باعث بھی اب مجھے ایک ناخوشگوار

فرض اور انجام دینا ہے میں ایک راز تمہارے سامنے کھولنے پر مجبور ہوں جو ہمارے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دے گا۔ ماریا گاوریلوونا نے بڑی بے ثباتی سے اس کی بات کا پی نہ رکاوٹ تو ہمیشہ سے موجود تھی میں تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی مجھے معلوم ہے اس نے بڑی لامعت سے جواب دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی اور سے محبت کرتی تھیں لیکن موت نے تین سال ہوئے تمہیں اس سے جدا کر دیا مگر بیماری رحمت ماریا گاوریلوونا زندگی میں صرف ایک خوش فہمی میرے لئے تسکین کا باعث ہو سکتی ہے اس سے مجھے محروم نہ کرو، مجھے اس خوش فہمی سے نہ نکالو کہ شاید تم میری خوشی کی خاطر میری بات مان جائیں اگر ذرا خاموشی سے میری بات سنو، میں اکتیا کرتا ہوں کہ ذرا خاموش رہو۔ آف مجھے کس قدر رازیت ہو رہی ہے مجھے معلوم ہے مجھے امید ہوتی ہے کہ تم میری ہو سکتی تھیں لیکن..... میں بڑا بد قسمت ہوں کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے۔

ماریا گاوریلوونا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ میری شادی ہو چکی ہے اس نے اپنی بات جاری رکھی میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں لیکن مجھے یہ تک

معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے اور کہاں ہے نامعلوم میری قسمت میں اس سے بھی ملنا ہے بھی کہ نہیں۔
کیا مطلب؟ ماریا گادریلو دانا نے تعجب سے پوچھا عجیب بات ہے پوری بات بتاؤ میں بھی پھر قصہ سناؤ مگر تم خدا را بتاؤ پھر کیا ہوا۔

1812ء کے شروع کی بات ہے برمن نے کہا میں جلدی میں دلنا چار ہاتھ جہاں ہمارا فوجی دستہ ٹھہرا تھا اس دفعہ میں رات کو ایک چوکی پر پہنچا میں نے حکم دیا کہ فوراً گھوڑے جو تھے چائیں لیکن اسی وقت طوفانی ہوا چلنا شروع ہوئی داروغہ اور کوچوان دونوں نے مجھے انتظار کرنے کا مشورہ دیا میں نے ان کی بات تو مان لی پر ایک عجیب سی بے چینی مجھ پر طاری ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے کوئی یوں ہی ڈھکیل رہا ہے اس عرصہ میں طوفان کسی طرح کم نہ ہوا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے پھر گھوڑے جو تھے کا حکم دیا اور طوفان ہی میں چل کھڑا ہوا۔ کوچوان کو دریا کے برابر چلنے کی سوچی کیونکہ اس طرح راستہ تین کوس کم ہو جاتا تھا کنارے گر گئے تھے اور کوچوان اس جگہ سے آگے نکل گیا جہاں مرکز راستہ پر آنا تھا اس طرہ ہم نامعلوم علاقہ میں پہنچ گئے طوفان تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا میں نے دور سے روشنی دیکھی اور ادھر ہی چلنے کا حکم دیا۔ ہم گاؤں میں پہنچ گئے لکڑی کے گر جا میں روشنی تھی گر جا کھلا ہوا تھا اور منڈیر کے پاس کچھ برف گاڑیاں کھڑی تھیں برساتی میں لوگ گھوم رہے تھے ”ادھر آؤ!“ ادھر آؤ“ کچھ لوگ چلانے لگے میں نے کوچوان سے ادھر چلنے کو کہا کہ ہے تم نے اتنی دیر کہاں لگا لی کسی نے مجھ سے کہا ”دہن بے ہوش ہے پادری کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے ہم تو واپس جانے کی سوچ رہے تھے۔ چلو اتر بھی چکو میں خاموشی سے گاڑی سے نیچے کود پڑا اور گر جا میں داخل ہوا جہاں دو تین موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی گر جے کے ایک تاریک کونے میں لڑکی ایک بیچ پر بیٹھی تھی کوئی دوسری اس کی کنپٹیاں سہلا رہی تھی چلو شکر ہے یہ

دوسری بولی آپ پہنچ تو گئے لی کو تو آپ نے ماری ڈالا تھا بوڑھے پادری نے میرے پاس آ کر پوچھا کیا شروع کرنے کا حکم ہے؟ شروع کیجئے شروع کیجئے قادر میں نے کھوئے ہوئے جواب دیا لڑکی کو اٹھایا گیا میں نے دیکھا کہ وہ صورت شکل کی بری نہیں عجیب سی ناقابل معافی شرارت مجھے سو جھی..... میں اس کے برابر آلٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا پادری جلی میں تھا تین مرد اور خادمہ لڑکی کو پکڑے تھے اور صرف اس کی طرف متوجہ تھے ہمارا نکاح کر دیا گیا ”پیار کرو“ ہمیں حکم ملا..... میری بیوی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف پھیرا۔ میں اسے چومنے ہی والا تھا کہ وہ چلا آئی ”ارے یہ وہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے“ اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ گواہوں نے مجھ کو کبھی ہونی نظروں سے دیکھا میں مڑا اور گر جے سے باہر آیا کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی جلدی سے میں گاڑی میں بیٹھا اور چلا آیا..... چلاؤ۔

”او خدا یا!“ ماریا گادریلو دانا چلا آئی..... ”اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ تمہاری بد نصیب بیوی پر کیا گزری؟“

”نہیں مجھے تو اس گاؤں کا نام تک معلوم نہیں جہاں میری شادی ہوئی تھی اور نہ یہ یاد ہے کہ میں کس چوکی سے آیا تھا۔ اس وقت اس پورے واقعہ کو میں نے اتنی کم اہمیت دی کہ گر جا سے نکلے ہی مجھے نیند آ گئی اور اگلے دن صبح میں تین چوکیوں تک سوتا رہا۔ میرے ساتھ جو نوکر تھا لڑائی میں کام آ گیا..... اب مجھے قطعاً امید نہیں کہ میں اس لڑکی کا پتہ چلا سکوں، جس کے ساتھ میں نے اس قدر بے رحمی سے مذاق کیا تھا۔

”خدا یا“ ماریا گادریلو دانا نے اس کی آستین پکڑ کر کہا۔
”وہ تم تھے؟ اور تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“
برمن کا رنگ فق ہو گیا اور وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔

☆☆